بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا

تفسیر

مِنھاجُ القرآن

ترجمہ، مطالب، فوائد اور حواشی

(سُورۃُ البقرۃ)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا

تفسیر

مِنهاجُ القرآن

ترجمہ، مطالب، فوائد اور حواشی

(سُورَةُ البَقَرَة)

مفکرِ اسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور

نام	تفسیر منہاج القرآن
مترجم و مفسر	مفکر اسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
اشاعت	بار اول فروری ۱۹۹۵ء
تعداد	۲ ہزار
صفحات	۴۱۸
کتابت	حافظ محمد سراج سعیدی' محمد یوسف نظامی
کمپوزنگ	محمد سلیم حسن
ٹائیٹل	علی احمد صابر چشتی "زر تاج رقم"
طابع	منہاج القرآن پرنٹرز
ہدیہ	۲۲۵/روپے

ملنے کا پتہ:

۱- تحریک منہاج القرآن ۳۶۵ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور

فون:5868757/5863951

۲- منہاج القرآن پبلی کیشنز ۲ لوئر مال لاہور

تفسیر منہاج القرآن کا اسلوبِ بیان

قرآنِ مجید کے تراجم، حواشی اور تفاسیر کی تاریخ میں "تفسیر منہاج القرآن" ایک منفرد اور نادر الوجود یاب کا اضافہ ہے۔ اس تفسیر کی صورت میں جدتِ نظم، ندرتِ اسلوب، اندازِ بیان اور مطالب و مضامین کے تنوع کے اعتبار سے قدیم و جدید تمام تفسیری لٹریچر کی تاریخ میں ایک نئے فن کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ تفسیر روایت و درایت کے دونوں اصولوں کی جامع ہونے کے علاوہ جدتِ تحقیق، اجتہاد اور فکری عملیت کا گرانقدر ذخیرہ بھی ہے۔ اس کے مطالعہ کے لیے درج ذیل ہدایات پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

۱۔ ترجمہ

دائیں صفحہ پر متنِ قرآن کے نیچے ترجمہ درج ہے جو لفظی اور بامحاورہ دونوں قسم کے تراجم کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں الفاظِ قرآنی کے معنی و مراد کے تعین میں بیک وقت لغوی، نحوی، ادبی، علمی، اعتقادی اور تفسیری، جملہ پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ترجمہ قرآن میں خود منشاءِ قرآن کو ہی فوقیت دی گئی ہے اس لیے یہ ترجمہ درحقیقت قرآن کے اپنے الوہی بیان کا ہی عام فہم انداز میں ابلاغ ہے مترجم کے ذاتی خیالات و نظریات کی ترجمانی نہیں ہے۔ بغرضِ افہام و تصریح بعض الفاظ بریکیٹ (قوسین) میں دے دیئے گئے ہیں تاکہ عبارت کا تسلسل بھی قائم رہے اور ترجمہ میں بھی کوئی اضافی بات درج نہ ہو۔

۲۔ مطالب

بائیں صفحہ پر ہر "آیت نمبر" کے ساتھ "مضمون نمبر" دیا گیا ہے۔ اس کے سامنے اور نیچے جلی قلم سے متذکرہ آیت کے مطالب اور مضامین کو عنوانات کی صورت میں جدید نظم کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ان مطالب و مضامین کی جزئیات اور تفصیلات بھی حسبِ ضرورت ذیلی سرخیوں کی شکل میں نیچے درج کی گئی ہیں۔

بعض مقامات پر حسبِ ضرورت تفسیری حوالے سے کچھ توضیحات و تشریحات بھی ہیں۔ اس طرح ہزار ہا قرآنی موضوعات اور مطالب و مضامین نہایت جامع انداز سے ایک خاص نظم کے ساتھ عنوانات کی صورت میں پہلی مرتبہ قارئین کے سامنے آئے ہیں یہ اسلوب بالکل نیا مگر نہایت مفید ہے ان میں اعتقادی علمی، فکری، فقہی، اخلاقی، نظریاتی، انقلابی، سائنسی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، قومی اور بین الاقوامی نوعیت کے ہزاروں مسائل کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ تفسیر اپنی جگہ قرآنِ حکیم کا ایک عدیم المثال مختصر انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے۔ ان مطالب و مضامین کے ذریعے انشاءاللہ علماء طلباء اور محققین سے لے کر عام سطح کے قارئین تک سب کے لیے قرآن فہمی کے ہزاروں باب کھل جائیں گے اور قرآن مجید کا مطالعہ سائنسی نظم کے ساتھ ممکن ہوگا!

۳۔ فوائد

مطالب کے نیچے بعض آیات کے تحت حرف "ف" لکھا گیا ہے۔ یہ فوائد کی طرف اشارہ ہے اس سے مُراد ان آیاتِ مُبارکہ کا صوفیانہ مفہوم ہے۔ یہ قرآنی تصوف و سلوک کا بیان ہے فوائد کی صُورت میں بعض آیاتِ قرآنی کے ان روحانی و عرفانی مفاہیم اور اسرار و رموز کا ذکر کیا گیا ہے جن کی آگہی سے اِنسان کو تزکیہ و تصفیہ کے حصول میں مدد مل سکے۔ یکسُوئی نصیب ہو اور محبت و معرفتِ الٰہی کے ذوق میں اضافہ ہو۔

۴۔ حواشی

ہر پارہ کے اختتام پر حواشی درج ہیں جن کی فہرست پارے کے شروع میں دی گئی ہے یہ حواشی متعلقہ پارہ کی ان آیاتِ مُبارکہ کی تفسیر پر مُشتمل ہیں جن میں حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ رسالت کے کسی نہ کسی پہلو کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصّہ تفسیرِ شانِ محمدی کے حوالے سے "منقبات القرآن" کا درجہ رکھتا ہے۔

ادارہ

فہرست مضامین حواشی

نمبر شمار	آیت نمبر	مضامین	صفحہ
۱	۱	الم کی معنوی وضاحت اور اعجاز شان محمدی ﷺ	۲۴۶
۲	۲	عظمت وحقانیت قرآن اور صداقت رسالت محمدی ﷺ	۲۴۹
۳	۳	ایمان بالغیب اور شان نبوت	۲۵۶
۴	۳	اقامت صلوٰۃ اور دین مصطفوی ﷺ کا عملی تصور	۲۵۹
۵	۳	رزق وانفاق کا مفہوم اور مصطفوی انقلاب کی معاشیاتی بنیاد	۲۶۳
۶	۴	حضور ﷺ کی تمام انبیاء پر فضیلت اور آپ کی شان ختم نبوت	۲۶۷
۷	۶-۷	دعوت محمدی ﷺ اور ہٹ دھرم کافروں کی محرومی	۲۶۹
۸	۸	منافقین کا دعوئ ایمان کیوں مقبول نہیں	۲۷۶
۹	۹	بارگاہ الٰہی میں حضور ﷺ کی قدر ومنزلت اور منافقین کی سوچ	۲۷۹
۱۰	۱۰	حضور ﷺ کی قدر ومنزلت کا انکار دلوں کا روگ ہے	۲۸۳
۱۱	۱۱-۱۲	منافقت کا گھناؤنا روپ۔ نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی	۲۸۴
۱۲	۱۳	دوسروں کو بیوقوف اور صرف خود کو عقل مند سمجھنا خود بے وقوفی ہے	۲۸۷
۱۳	۱۴-۱۵	کردار کا دوغلا پن اور سازشی منصوبہ بندی کھلی منافقت ہے	۲۹۳
۱۴	۱۷-۲۰	منافقین کے دو گروہوں کی مثال	۳۰۱
۱۵	۲۳	عبدیت محمدی ﷺ اور آپ کا علو مرتبت	۳۰۸
۱۶	۲۳	من دون اللہ کا مفہوم اور شان انبیاء واولیاء کا امتیاز	۳۱۳
۱۷	۲۵	جنتی ثمرات اور ظاہری وحقیقی مماثلت میں فرق	۳۱۸
۱۸	۲۶	تمثیلی کلام کے رموز اور شان انبیاء واولیاء کے ادراک میں کوتاہی	۳۲۲
۱۹	۲۸	انسانی سفر کے مراحل اور حیات برزخی کا ثبوت	۳۳۰
۲۰	۲۹	تخلیق کائنات کا مقصود انسان اور کمال انسانیت کا مرقع وجود مصطفیٰ ﷺ	۳۳۹

نمبر شمار	آیت نمبر	مضامین	صفحہ
۲۱	۳۰	کلمہ از اور حضور ﷺ کی نورانی تخلیق کا حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہونا	۲۴۲
۲۲	۳۰	فرشتوں کی حقیقت اور ان سے باری تعالیٰ کی گفتگو کی حکمت	۲۴۷
۲۳	۳۰	خلافت الٰہیہ، شان مظہریت اور عظمت مصطفوی ﷺ	۲۵۴
۲۴	۳۰	بارگاہ الٰہی میں فرشتوں کے سوال کی حکمت	۲۶۲
۲۵	۳۱-۳۲	حضرت آدم علیہ السلام اور علم الاسماء کی حقیقت	۲۶۸
۲۶	۳۳	حضرت آدم علیہ السلام کی علمی عظمت اور فلسفہ تضاد وجدال کی قرآنی اصل	۲۷۳
۲۷	۳۴	حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کی حقیقت اور تکریم نبوت کی اہمیت	۲۷۶
۲۸	۳۷	حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ حضور ﷺ کے توسل سے قبول ہوئی	۲۸۰
۲۹	۴۰	بنی اسرائیل سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کے وعدہ پر جنت کا وعدہ کیا گیا	۲۸۲
۳۰	۴۱	یہود کی کمالات محمدی ﷺ کے انکار پر سرزنش	۲۸۳
۳۱	۴۲	شان محمدی ﷺ کو حق سے اور چھپانے کو کتمان حق سے تعبیر کیا گیا	۲۸۴
۳۲	۷۶	حضور ﷺ کی عظمت اور شان کو چھپانا یہودی ذہنیت کا خاصہ ہے	״
۳۳	۸۹	حضور ﷺ کے وسیلہ سے دعا مانگنا پہلی امتوں میں بھی رائج تھا	۲۸۵
۳۴	۱۰۱	یہود نے حضور ﷺ سے حسد کے باعث اپنی کتاب تورات کو بھی پس پشت ڈال دیا	۲۸۸
۳۵	۱۰۴	حضور ﷺ کی شان اقدس میں معمولی سی لفظی گستاخی بھی کفر ہے	۲۸۹
۳۶	۱۰۸	حضور ﷺ سے ایذاء بے جا سوالات کرنے کی جسارت بھی کفر ہے	۲۹۶
۳۷	۱۱۹	حضور ﷺ کا بشیر و نذیر ہونا	۲۹۷
۳۸	۱۲۹	حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے نسبی تعلق کے شرف کی خاطر اپنی اولاد میں آپ ﷺ کی بعثت کی دعا مانگی	۲۹۸
۳۹	۱۴۳	حضور ﷺ امت کے احوال پر گواہ ہیں	۳۰۰

نمبر شمار	آیت نمبر	مضامین	صفحہ
۴۰	۱۴۳	تحویل قبلہ کا واقعہ حضور ﷺ کے ساتھ تعلق عشق کا امتحان تھا	۴۰۰
۴۱	۱۴۴	تحویل قبلہ کا واقعہ حضور ﷺ کی شان محبوبیت کا مظہر ہے	۴۰۱
۴۲	۱۴۶	حضور ﷺ کی عظمت کو دل سے تسلیم نہ کرنا یہودی ذہنیت کا شیوہ ہے	۴۰۲
۴۳	۱۵۱	نبوت کے فرائض پنجگانہ	۴۰۲
۴۴	۱۸۶	معرفت و قرب الٰہی کا سوال حضور ﷺ سے ہی کیا جائے	۴۰۳
۴۵	۲۴۸	تبرکات صالحین کی فضیلت	۴۰۴
۴۶	۲۵۳	جملہ انبیاء و رسل پر حضور ﷺ کی کلی فضیلت کا بیان	۴۰۸
۴۷	۲۵۵	روز قیامت حضور ﷺ کی شفاعت کا بیان	۴۱۱
۴۸	۲۸۲	دو عورتوں کی گواہی کا مسئلہ	۴۱۵

اٰیَاتُهَا ۷ ۱ : سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ : ۵ رُکُوْعُهَا ۱

سورۃ فاتحہ مکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانیوالا ہے نہایت مہربان

الرَّحِیْمِ ۝۲ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ اِیَّاكَ

بہت رحم فرمانے والا ہے روزِ جزا کا مالک ہے (اے اللہ) ہم تیری

نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴ اِهْدِنَا

ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ہمیں سیدھا

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِیْنَ

راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ

اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝۶ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ

جن پر تُو نے انعام فرمایا ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب

عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝۷ ع

کیا گیا ہے اور نہ (ہی) گمراہوں کا۔

سُورۃ الفاتحہؑ

مضمون	آیت
۱	۱

عقیدۂ توحید اور اس کے اساسی دلائل۔

(۲) کائنات کا ارادۂ الٰہی سے وجود میں آنا۔

(۳) ربوبیّتِ الٰہیہ کا ہر ایک کے لیے عام ہونا۔

(۴) فیضانِ ربوبیت سے کائنات کا مسلسل معرضِ ارتقاء میں ہونا۔

(۵) عالمِ خلق کا بہت سے جہانوں اور کائناتوں پر مشتمل ہونا۔

مضمون	آیت
۶	۲

عقیدۂ رسالت اور رحمتِ الٰہیہ۔

(۷) باری تعالیٰ کی صفاتِ رحمت ۔ "رحمانیّت اور رحیمیتؑ"
رحمتِ الٰہی کا ہر شئے پر حاوی ہونا۔

مضمون	آیت
۸	۳

عقیدۂ آخرت اور تصوّرِ جزا و سزا۔

(۹) حکومتِ الٰہیہ۔

مضمون	آیت
۱۰	۴

اعترافِ عبدیّت۔

(۱۱) استعانت باللہ۔

مضمون	آیت
۱۲	۵

دُعائے ہدایت۔

(۱۳) دُعائے استقامت۔

آیت	مضمون
٦	۱۴

صِراطِ مستقیم کا تعیّن۔

اللہ تعالیٰ کے مقرب اور انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔

(۱۵) انبیاء اور اولیاء وصالحین کی پیروی کا حکم۔

(۱۶) صُحبتِ مُقربین کی فضیلت و برکت۔

آیت	مضمون
۷	۱۷

بدبختوں اور گمراہوں کی صُحبت اور پیروی سے پرہیز کا حکم۔

سُورت کے مجموعی مضامین

(۱۸) عقائدِ اسلام کی توضیح۔

(۱۹) اعمالِ صالحہ کی ترغیب و ہدایت۔

(۲۰) صفاتِ باری تعالےٰ۔

محمودؐ اِلٰہؐ رَبؐ رحمانؐ رحیمؐ مالکؐ معبودؐ مستعانؐ
ہادیؐ منعمؐ قہارؐ مُضِلؐ

(۲۱) صفاتِ عبدیّت۔

حامدؐ، مخلوقؐ، مربوبؐ، محتاجؐ، مملوکؐ، عابدؐ، مستعینؐ، طالبِ ہدایت
طالبِ استقامتؐ، طالبِ نعمتؐ، سزائے غضبؐ سے پناہ مانگنے والا،
سزائے ضلالتؐ سے پناہ مانگنے والا۔

(۲۲) قرآنی نظامِ فکر و عمل کے دس اُصول :-

۱- صحتِ عقیدہ ——— آیت : ۱
۲- صحتِ عمل ——— آیت : ۲
۳- فکرِ احتساب و مسئولیت ——— آیت : ۳
۴- جدوجہد میں اخلاص و وفا ——— آیت : ۴
۵- عمل اور کردار میں نمونۂ بندگی ——— آیت : ۴
۶- منزل اور راستے کا صحیح تعین ——— آیت : ۵
۷- جدوجہد میں استقامت و استقلال ——— آیت : ۵
۸- اہلِ حق کی مصاحبت اور معاونت ——— آیت : ۶
۹- اہلِ باطل کی پہچان اور ان کی پیروی سے گریز ——— آیت : ۷
۱۰- ہر مرحلۂ زندگی میں خوفِ الٰہی ——— آیت : ۷

(۲۳) ہدایتِ قرآنی کے مدارجِ ثلاثہ۔

۱- مقصد کا شعور ——— اھدنا
۲- راستے کا تعین ——— الصراط
۳- منزل کی ضمانت ——— المستقیم

(۲۴) اللہ تعالیٰ اور بندے کا پنج جہتی تعلق۔

۱- تعلقِ تخلیق ——— الحمد للہ
۲- تعلقِ تربیت ——— ربّ العالمین
۳- تعلقِ ابقاء ——— الرحمٰن
۴- تعلقِ تکمیل ——— الرحیم
۵- تعلقِ انتقال ——— مالکِ یوم الدین

(۲۵) تربیت کے دس رُوحانی ضابطے۔

۱۔ ضابطۂ حمدِ الٰہی ———— الحمد للہ رب العالمین

۲۔ ضابطۂ طلبِ رحمت ———— الرحمٰن الرحیم

۳۔ ضابطۂ خوفِ آخرت ———— مالک یوم الدین

۴۔ ضابطۂ اخلاص ———— ایاک

۵۔ ضابطۂ عبادت ———— نعبد

۶۔ ضابطۂ استعانت ———— وایاک نستعین

۷۔ ضابطۂ طلبِ ہدایت ———— اھدنا الصراط

۸۔ ضابطۂ طلبِ استقامت ———— المستقیم

۹۔ ضابطۂ طلبِ نعمت ———— صراط الذین انعمت علیہم

۱۰۔ ضابطۂ حفاظت ———— غیر المغضوب علیہم ولا الضالین

(۲۶) تکمیلِ شخصیت کی دس عملی ہدایات:۔

انسان ————

۱۔ وحدت و اخرت کا پیکر ہو ———— آیت : ۱

۲۔ رحمت و شفقت کا پیکر ہو ———— آیت : ۲

۳۔ عدالت و امانت کا پیکر ہو ———— آیت : ۳

۴۔ اخلاق و بندگی کا پیکر ہو ———— آیت : ۴

۵۔ استغنا اور عزتِ نفس کا پیکر ہو ———— آیت : ۴

۶۔ تواضع اور انکساری کا پیکر ہو ———— آیت : ۴

۷۔ حق طلبی اور حق جوئی کا پیکر ہو ———— آیت : ۵

۸۔ اعتدال و توازن کا پیکر ہو ———— آیت : ۶/۷

۹۔ حق و باطل میں امتیاز کا پیکر ہو ———— آیت : ۶/۷

۱۰۔ امورِ غضب و ضلالت سے اجتناب کا پیکر ہو ———— آیت : ۶/۷

(۲۷) علومِ شریعت اور تعلیماتِ طریقت۔

۱۔ علم العقائد ——— علم الکلام ——— پہلی تین آیات
۲۔ علم الاحکام ——— علم الفقہ ——— چوتھی آیت
۳۔ علم الاخلاص ——— علم التصوّف ——— آخری تین آیات

نوٹ: سورۃ الفاتحہ کی مکمل تفسیر جلد اوّل میں گزر چکی ہے۔ اس لیے یہاں محض عنوانات اور اشارات بیان کر دیے گئے ہیں۔ تفصیلی مطالعہ کے لیے جلد اوّل ملاحظہ فرمائیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَة

وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام "البقرۃ" ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت کے آٹھویں رکوع میں بنی اسرائیل کے ذکر کے ذیل میں ایک گائے ذبح کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس سورت میں اس واقعے کے علاوہ کئی اور اہم امور کا بھی ذکر ہے لیکن اس حکم کو بطورِ خاص سورت کے نام کے تعین کے لیے منتخب کرنا نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس سورت میں زیادہ تر بنی اسرائیل اور یہود کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی اعتقادی و عملی خرابیوں کی نشاندہی کر کے اصلاح کی راہ تجویز کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ سورت ہجرتِ مدینہ کے بعد نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت تھی اور مدینہ میں یہود بکثرت رہائش پذیر تھے۔ اسلام اور اہلِ اسلام کو یہاں آکر سب سے پہلے انہی کے ساتھ معاملہ کرنا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد قرآن کے تبلیغی اور اصلاحی پیغام کے اولین مخاطب یہی قرار پاتے۔ چنانچہ ان کی اعتقادی و عملی اصلاح کی بات ان کے تاریخی پس منظر میں ہی کی جاسکتی تھی۔ یہود اور بنی اسرائیل کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد تھی کہ ان میں گائے کی پرستش کا شرک مصر اور سینا کے قیام کے دوران رواج پاچکا تھا۔ جس نے ان کے عقیدۂ توحید کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ لہٰذا ان کے اس مشرکانہ عقیدے کے رد کے لیے باری تعالیٰ نے انہیں گائے (جس کو وہ اپنا معبود تصور کرتے تھے) کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔ تاکہ اپنے ذہنی تراشیدہ باطل معبود کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے وہ حقیقتِ توحید کو سمجھنے کے اہل ہو سکیں۔ گائے ذبح کرنے کا یہ حکم اتفاقی یا حادثاتی امر نہ تھا بلکہ درسِ توحید کی سب سے بڑی بنیاد تھا۔ اس لیے اس سورت کا نام بھی اسی حوالے سے متعین کر دیا گیا۔

ایک لطیف علمی نکتہ۔

اس سورت کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں تمام علماء نے وہی موقف اختیار کیا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں لیکن ایک اور لطیف علمی نکتہ جس کی طرف توجہ مبذول کروانا ہمارا مقصود ہے وہ یہ کہ "البقرۃ" کا لفظ ذو معنیٰ ہے۔ اس کے معروف معنیٰ تو "گائے" کے ہی ہیں۔ جس کی جمع "بقر" آتی ہے۔ لیکن اس کا ایک معنی "پھاڑنا اور کھولنا" بھی ہے۔ کہا جاتا ہے:۔ بقر الارض۔۔ای شق الارض (اس نے زمین کو پھاڑ دیا)

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:۔

لما کان شقه واسعا استعمل فی کل شق واسع یقال بقرت بطنه اذا شققته شقا واسعا (المفردات)

جب کوئی چیز بہت زیادہ پھٹ جائے یا کھل جائے تو اس کے لیے "بقر" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب آپ کسی چیز کو بہت زیادہ اور گہرا کھول دیں تو اس پر کہا جاتا ہے "بقرت بطنه"

گویا بقر کے معنیٰ میں انشراح اور وسعت کے دونوں معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

امام زین العابدینؒ کے صاحبزادے امام محمد بن علیؒ کو "باقر" کے لقب سے اسی لیے پکارا جاتا ہے کہ انہیں علوم و معارف کے ادراک میں بے پناہ وسعت حاصل تھی اور باطنی حقائق ان کے اوپر اس طرح کھل چکے تھے جیسے کسی چیز کا پیٹ شق ہو جائے تو اندر کی تمام چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ امام راغبؒ نے اس امر کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔ "**سمی محمد بن علیؒ باقرا لتوسعه فی دقائق العلوم وبقره بواطنها**" (المفردات)۔اسی طرح اگر کسی کو مال و دولت میں وسعت اور کثرت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے:۔ **بیقر الرجل فی المال** (وہ شخص مال و دولت میں باقر یا بقر ہو گیا)

مذکورہ بالا لغوی تحقیق پیش کرنے کا مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ سورۂ بقرہ چونکہ قرآن مجید میں سب سے بڑی سورت ہے۔ لہٰذا مضامین اور علوم و معارف کے بیان میں بھی بے پناہ وسعت کی حامل ہے۔ کیونکہ قرآنی آیات کا ایک ایک لفظ بامعنیٰ ہے۔ لہٰذا آیات اور الفاظ کی وسعت یقیناً معنوی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔ مستزاد یہ کہ اس سورت نے بنی اسرائیل کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے ان مخفی حقائق کا سینہ چاک کیا ہے۔ جن سے یہود ماضی عبارت تھا اور اس نے نہ صرف ان کی بلکہ پورے عالم

انسانیت کی اصلاح کے لئے اس قدر وسعت کے ساتھ قرآنی تعلیمات فراہم کیں کہ ان کا شمار تک ممکن نہیں ہے۔ اس لئے علوم ومعارف اور حقائق ودقائق کی گہرائی اور وسعت کے لحاظ سے باری تعالیٰ نے اس کا نام "البقرہ" منتخب فرمایا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے فاتحہ کے بعد قرآن مجید میں سب سے پہلی سورت کا درجہ عطا کیا گیا۔ چنانچہ ہمارے خیال میں "سورۃ البقرۃ" کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آیات کی تعداد کے لحاظ سے اور سورت کی لفظی ومعنوی وسعت کے لحاظ سے اس کا نام "البقرۃ" تجویز کیا گیا ہو۔

ایک مغالطے کا ازالہ

عصر حاضر کے بعض علماء نے یہاں قرآن مجید کی سورتوں کے اسماء کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لئے مضمون کے لحاظ سے جامع اسماء یا عنوانات تجویز نہیں کئے جا سکتے تھے اس لئے نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن مجید کی بیشتر سورتوں کے لئے عنوانات کی بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دو فکری گمراہیاں پیدا ہو سکتی ہیں:

ایک یہ کہ قرآنی سورتوں کے نام انسانی کاوش کا نتیجہ تھے۔ وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نہ تھے۔

دوسری یہ کہ باری تعالیٰ بھی (معاذ اللہ) انسانوں کی طرح اپنے کلام کی مختلف سورتوں کے ایسے جامع عنوانات مقرر نہیں کر سکتا تھا۔ جو مضامین کو اپنے اندر سمو لیتے۔ اس سے (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا ثابت ہوتا ہے یا قرآنی الفاظ وعبارت کا حادث ہونا۔

عربی زبان بے شک انسانی زبان سہی لیکن قرآن کا کلام یا زبان نہ انسانی ہے اور نہ تنگ دامن۔ اسے اہلِ عرب کی "عربیت" کے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جو تنگ دامانی اور حد بندی عربی یا کسی اور زبان میں ہوتی ہے وہ "قرآنی زبان" میں بھی تسلیم کر لی جائے

یہ تصور سراسر غلط ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا — اور (اے محبوب ؐ) ہم نے اسی طرح آپ کی طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی کی ہے۔

(الشوریٰ، ۴۲:۷)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ٥ (الشعراء، ۲۶: ۱۹۳-۱۹۵)	اس قرآن کو روح الامین لے کر اترے آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈر سنائیں (اور) یہ قرآن روشن عربی زبان میں ہے۔

قرآن مجید کا خود اپنی زبان کو "لسان عربی مبین" (روشن اور واضح عربی زبان) قرار دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ قرآنی زبان عام عربی زبان نہیں بلکہ الوہی زبان ہے۔ جس طرح خالقِ کائنات خود ہر عجز اور مجبوری سے پاک ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی ہر عجز اور مجبوری سے پاک ہے۔

لٰہذا مذکورہ بالا استدلال کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ نام کس اصول پر رکھے گئے ہیں۔ تو اس پر ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے کہ یہ نام عام کتابی اصول پر مقرر نہیں کیے گئے۔ نہ قرآن کی حیثیت اور انداز عام کتابوں کا سا ہے۔ نہ اس کی سورتوں کا انداز عام کتابوں کے ابواب کا سا ہے اور نہ ان کے اسماء کا انداز مختلف کتابوں کے ابواب یا مضامین کے عنوانات کا سا ہے۔ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے تمام نام بیشک "علامتی نوعیت" کے ہیں۔ مگر علامتی اسماء کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کہ (معاذ اللہ) جامع عنوانات کا تجویز کرنا ممکن نہ تھا بلکہ فی الواقع یہ بھی قرآنی اسلوب کی ندرت کا ہی ایک حصہ ہے جس طرح سورتوں کے مضامین میں مروجہ ادبی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح ان کے ناموں کے تعین میں بھی عنوانات کے معروف ضابطے کو عمداً نظر انداز کیا گیا ہے۔ تاکہ قرآن کی ہر سورت 'نفسِ مضمون اور نفسِ عنوان' دونوں لحاظ سے منفرد اور یکتا اسلوب کی حامل ہو۔

زمانۂ نزول۔

یہ سورت مدنی ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد سب سے پہلے اسی کا نزول شروع ہوا۔ اس کا زیادہ حصہ ابتدائی مدنی دور میں نازل ہو گیا تھا۔ لیکن بعض آیات عہدِ رسالت کے دور اواخر تک نازل ہوتی رہیں۔ ربا یعنی سود سے متعلق آیات فتح مکہ کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر مبارک کے آخری حصے میں نازل ہوئیں۔ اسی طرح "وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(آیت نمبر:۲۸۱) ۱۰ ذوالحجہ کو منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی۔ جب کہ نبی اکرم ﷺ حجۃ الوداع کے مناسک ادا فرمارہے تھے۔ اس کے ٹھیک تین ماہ بعد حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا وصال مبارک ہوگیا۔ اس لحاظ سے سورہ بقرۃ کا زمانۂ نزول پورے دس سالہ مدنی دور پر محیط ہے۔

شانِ نزول:۔

سورۃ البقرہ کے اسلوب مضامین کو سمجھنے کے لئے اجمالی طور پر اس کے نزول کا تاریخی اور اصولی پس منظر معلوم کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس پس منظریا شان نزول کو درج ذیل پانچ عنوانات کے ذریعے واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

۱۔ یہودی تاریخ کے حوالے سے اعتقادی اور عملی زندگی کے بگاڑ کی اصلاح۔

۲۔ منافقین کے حوالے سے نفاق کی علامات کا بیان مع اس سے بچاؤ کی تدابیر۔

۳۔ اسلامی ریاست کے قیام کے حوالے سے اجتماعی نظام کی تاسیس اور اس کے لئے ضروری ہدایات۔

۴۔ اسلام اور کفر کی کشمکش کے حوالے سے منظم انقلابی جدوجہد کا آغاز اور اس سے متعلق بنیادی تعلیمات۔

۵۔ اہل حق کے غلبہ کی شرائط کے حوالے سے مثبت طرز ہائے عمل کی نشاندہی۔

۱۔یہودی تاریخ کے حوالے سے اعتقادی اور عملی زندگی کے بگاڑ کی اصلاح:۔

ہجرت کے بعد اسلام کو یہودیوں سے سابقہ پڑا۔ یثرب کے اصلی باشندے گو انصار تھے۔ لیکن عملاً اس علاقے کے اقتدار پر یہود کا قبضہ تھا۔ تجارت وزراعت پر انہی کا تسلط تھا۔ تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے بھی یہ زیادہ مستحکم تھے۔ الغرض مذہب' معیشت اور سیاست کے میدانِ یثرب پر یہود کا سکہ رواں تھا۔ یہ بنیادی طور پر کافر نہ تھے بلکہ اہلِ کتاب تھے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کو اس وقت ۱۹ سو سال گزر چکے تھے۔ تورات لفظاً ومعناً محرف ہوچکی تھی۔ اس سے پہلے اور بعد کی آسمانی کتابیں اور صحیفے بھی محرف ومتبدل ہوچکے تھے۔ سب کے عقائد مسخ ہوگئے تھے۔ ان میں غیر اسلامی اور باطل خیالات کی آمیزش ہوگئی تھی۔ دین حق اور نبوت کو انہوں نے نسلِ اسرائیل

کی وراثت سمجھ رکھا تھا۔ یہودیت پر انھیں سخت ناز تھا۔ اور اسی نسلی تفاخر اور متعصبانہ زعم نے انھیں گمراہی سے ہمکنار کردیا تھا۔ کچھ تعلیماتِ الٰہیہ جس قدر بھی صحیح صورت میں موجود تھیں ان کا اخفاء اور من مانی تاویلات کے ذریعے ان کی معنوی تحریف ان کا شیوہ تھا۔ مزید بر آں ان کے علماء اور سردار بھی اعتقادی گمراہی کے علاوہ عملی تباہی اور گراوٹ کی انتہاء کو پہنچ چکے تھے۔ حق پوشی' خودپسندی اور مفاد پرستی کے باعث نہ وہ اصلاح کے لئے تیار تھے اور نہ کسی ہادی ورہنما کی بات سننے کے لئے' بلکہ راہِ حق کی طرف بلانے والوں کا تمسخر اڑانا ان کی مخالفت ومزاحمت اور ان کے خلاف سازش وکینہ پروری ان کے کردار کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ فی الحقیقت یہ ایک ایسی بگڑی ہوئی امت تھی۔ جس کی اعتقادی اور عملی اصلاح کی کوئی صورت ظاہرًا نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی تمام علمی' اعتقادی' عملی اور اخلاقی خیانتوں کے باوجود خود کو سب سے بڑا دیندار' دانشمند' ہدایت یافتہ اور بخشش کا مستحق طبقہ تصور کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے خدا کے انعام کو ٹھکرا کر اس کے غضب کو دعوت دی تھی اور نتیجتاً تمام اُخروی نعمتوں سے محروم ہوچکے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے سب سے پہلے ان کی اصلاح کرنا اوران کے اعتقادی اور عملی بگاڑ کے اثرات کو زائل کرنا تھا۔ کیونکہ مدینہ میں سب سے زیادہ ذی اثر اور ذی حیثیت لوگ یہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ بقرہ کی تعلیمات کا بیشتر حصہ یہود ہی سے متعلق ہے۔ عام مسلمانوں اور انسانوں کے لیے بھی ان مخصوص تعلیمات کی اہمیت کچھ کم نہیں' کیونکہ یہودیت صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک مستقل ذہنیت بن چکی ہے جس کا نظارہ ہم آج بھی مختلف کرداروں کے روپ میں کرسکتے ہیں۔

۲۔ نفاق کی علامات اور اس سے بچاؤ کی تدابیر

مدنی دور میں منافقین کا طبقہ بھی نمایاں طور پر معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ اسلام کو کھلی مخالفت ومزاحمت کا سامنا تو آغاز دعوت سے ہی تھا اور اہلِ اسلام اس سلسلے میں بے پناہ مصائب وشدائد برداشت کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک نئی طرز کی مخالفت بھی بڑے زور وشور سے شروع ہوگئی اور یہ تھی "منافقت"۔ کچھ لوگوں نے زبان سے ایمان کا اقرار کرلیا۔ ظاہرًا اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے اور

مسلمانوں کے ہمراہ اسلامی تحریک میں دست وبازو ہونے کا دعوی کرنے لگے۔ لیکن یہ لوگ فی الحقیقت "منافق" تھے اور ان کی بھی کئی اقسام تھیں۔

پہلی قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کے برحق ہونے کے قائل تھے لیکن اس کی خاطر اپنے مفادات کی قربانی کے لئے تیار تھے نہ مصائب و آلام کو برداشت کرنے کے لئے۔ لہٰذا کچھ خود غرضی و مفاد پرستی اور کچھ بزدلی ان کے سچا مسلمان ہونے کے راستے میں حائل تھی۔

دوسری قسم ایسے منافقین کی تھی جو دل سے قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض سازش اور فتنہ و شر کے لئے اسلامی صفوں میں گھس آئے تھے۔ یہ اسلام کے بہت بڑے دشمن تھے۔

تیسری قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کے اقتدار وحکومت کے باعث مفاد پرستانہ خواہشات کے تحت اسلام سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن منکرینِ اسلام سے بھی اپنا تعلق بدستور قائم رکھے ہوئے تھے تاکہ دونوں طرف سے حسبِ موقع فوائد حاصل کرسکیں اور دونوں طرف کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں۔

چوتھی قسم ایسے منافقین کی تھی جو ذہنی طور پر اسلام اور کفر کے درمیان متردد تھے۔ نہ انھیں اسلام کی حقانیت پر کامل اعتماد تھا اور نہ وہ اپنی سابقہ کفر یا جاہلیت کی حالت پر مطمئن تھے۔ وہ اوروں کی دیکھا دیکھی مسلمان ہوگئے تھے۔

پانچویں قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کو حق سمجھتے ہوئے دل سے اس کے قائل تو ہوچکے تھے لیکن پرانے اوہام وعقائد اور رسم ورواج کو چھوڑنے' دینی اقدار اور پابندیوں کو قبول کرنے اور اوامر ونواہی کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔

چھٹی قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کو توحید' احکامِ الٰہی اور آخرت وغیرہ پر ایمان لانے کی حد تک تو تسلیم کرتے تھے لیکن نبی اکرم ﷺ کی غلامی اور وفاداری سے گریزاں تھے۔ نہ وہ حضور علیہ السلام کی عظمت ومنزلت دل سے ماننے کو تیار تھے اور نہ آپ ﷺ کی حاکمیت وشفاعت۔ اس میں وہ اپنی ہتک اور ذلت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ تعلقِ نبوی ﷺ کے بغیر ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

قرآن مجید مومنین کو تمام منافقین کی پہچان کروانا چاہتا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں موجود رہ کر اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ اس لئے سورہ بقرہ نے اس سلسلے میں بھی اہم اشارات فراہم کئے تاکہ حق و باطل میں امتیاز کا صحیح شعور پیدا ہو سکے۔

۳۔ اسلامی ریاست کے قیام کے حوالے سے اسلام کے اجتماعی نظام کی تاسیس اور اس کے لئے ضروری ہدایات۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلام کے سیاسی دور کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مکی دور صرف دعوت، تبلیغ، اور صحابہ کرامؓ کی اخلاقی تربیت سے متعلق تھا۔ اس دور میں اسلام کے عظیم انقلابی مشن کے لئے جاں نثار تیار کئے گئے اور انھیں مشکلات و مصائب کی بھٹی سے گزار کر ثابت قدمی کے جوہرے آراستہ کیا گیا۔ جب پہلے مرحلے کی تکمیل ہو چکی تو ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کے اجتماعی نظام کی باقاعدہ تاسیس کا وقت آیا۔ مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے کئی عربی قبائل اسلام قبول کر چکے تھے۔ لوگ ہر سمت سے مجتمع ہو کر ایک مقام پر آگئے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہود اور دیگر قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے جسے "میثاقِ مدینہ" کہتے ہیں، ریاستِ مدینہ کو "پہلی اسلامی ریاست" میں بدل دیا۔ اب مسلمانوں کو ایک اجتماعی وجود نصیب ہوگیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انھیں ایک وحدت میں مؤثر طور پر ضم کرنے کے لئے ہدایات دی جائیں۔ چنانچہ ان کے لئے عائلی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کی ہدایات فراہم کی گئیں۔ معیشت و سیاست کے اصول بتائے گئے۔ قانون کے ضابطے عطا کئے گئے قومی سطح پر اجتماعی سیرت پیدا کرنے کا اخلاقی و روحانی لائحۂ عمل مہیا کیا گیا۔ یہ سب کچھ سورہ بقرہ کی تعلیمات کا موضوع تھا تاکہ مسلمان متفرق زندگی بسر کرنے کی بجائے ایک ریاست میں اجتماعی زندگی کا نظام بپا کریں۔ اس سورت کا نصف حصہ کم و بیش اسی مقصد کے حصول سے متعلق ہے۔

۴۔ اسلام اور کفر کی کشمکش کے حوالے سے منظم انقلابی جدوجہد کا آغاز اور اس سے متعلق بنیادی تعلیمات۔

جب اسلام باقاعدہ ریاست کی شکل میں منصۂ شہود پر ابھرا اور اس کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھنے لگا تو یہ تبدیلی فی الحقیقت عالم کفر کے لئے بہت بڑا چیلنج تھی۔ مکہ کی غیر مسلم قیادت نے تو یہ سمجھا تھا کہ اب مسلمان بے گھر ہو کر منتشر ہو جائیں گے۔ اور اسلام کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہجرتِ مدینہ اسلام کی سیاسی شیرازہ بندی کے لئے بنیاد بن گئی۔

لہٰذا اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت اور انقلابی طاقت سے خائف ہو کر پورا عالمِ کفر مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہوگیا۔ اس طرح اسلام اور کفر کے درمیان باقاعدہ غزوات کا آغاز ہوا۔ اب ملتِ اسلامیہ ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہی تھی۔ اسے نئے جوش و خروش اور جذبہ سے ہمکنار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ جہاد کے احکام آنا شروع ہوگئے۔ باطل سے برسرپیکار ہونے کی ترغیبات دی جانے لگیں اور صبرواستقامت کی تعلیم دی جانے لگی۔ مسلح مخالفت اور مزاحمت سے ٹکرانے کا طریقہ سکھایا گیا۔ اور یہ فلسفۂ زندگی بیان کیا گیا کہ حق کی خاطر مرمٹنے کا نام ہی زندگی ہے تاکہ اس عزم وولولہ کے ساتھ اسلام کی تحریک آگے بڑھے۔ اس کے لئے نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تعمیل کو ہی بنائے ایمان اور معیارِ کمال قرار دیا گیا۔ مکہ میں واقع بیت الحرام کو پورے عالمِ اسلام کا کعبہ قرار دیا گیا۔ تاکہ اس سرزمین کو فتح کر کے اس عالمی روحانی مرکز تک رسائی حاصل کرنے کی آرزو شدت سے پیدا ہو۔ جہاد کے تصور نے مسلمانوں کی زندگی میں تازہ روح پھونک دی اور پے در پے غزوات و سرایا کے نتیجے میں اسلامی انقلاب' باطل استحصالی اور طاغوتی قوتوں کو زیر کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ سورہ بقرہ کی تعلیمات اس انقلاب کی تکمیل کے آخری اعلان تک جو "حجتہ الوداع" کے موقع پر کیا گیا نازل ہوتی رہیں۔

۵۔ اہلِ حق کے غلبہ کی شرائط۔

اس پوری جدوجہد کے دوران ضروری تھا کہ امتِ مسلمہ کے افراد کو یہ بتادیا

جائے کہ اہلِ حق کے اہلِ باطل کے مقابلے میں غالب آنے کی شرائط کیا ہیں۔ یعنی انفرادی واجتماعی اور قومی وبین الاقوامی سطح پر وہ کونسا طرزِ عمل ہے جس میں کامیابی' اور فلاحِ حقیقی کی ضمانت ہے نیز وہ کونسا طرزِ عمل ہے جس کے نتیجے میں ذلت ورسوائی اور ناکامی مسلط ہوتی ہے۔ کامیابی کی راہ کو "راہِ ہدایت" کے عنوان سے واضح کیا جائے اور تباہی وناکامی کی راہ کو "راہِ ضلالت" کے عنوان سے۔

چنانچہ سورہ بقرہ نے متفرق طور پر مختلف مقامات پر ایسی ہدایات مہیا کیں۔ جن میں مثبت اور منفی' تعمیری اور تخریبی' مصلحانہ اور مفسدانہ طرز ہائے عمل کی نشاندہی کی گئی۔ بلکہ اس سورت کا آغاز بھی اسی موضوع سے ہوا۔ حلال کو حرام سے جدا کیا گیا' حق کو باطل سے' خیر کو شر سے' صدق کو کذب سے اور ایمان وتقوی کو کفر ومنافقت سے' الغرض اہلِ اسلام کے سامنے بنی اسرائیل کی تاریخ کے حوالے سے ملتوں کے عروج وزوال کی حقیقت واشگاف کردی گئی۔ اقوام کی بقا اور موت کا فلسفہ اجاگر کردیا گیا۔ صحیح اور غلط کا واضح امتیاز پیدا کردیا گیا اور ہر ایک کے نتائج کی دو ٹوک انداز میں نشاندہی بھی کردی گئی۔ عہد ومیثاق کی خلاف ورزی اور فسق وانحراف کی راہ بتادی گئی اور اس کے انجام سے بھی مطلع کردیا گیا۔ دوسری طرف اطاعت کی راہ بتادی گئی اور اس کے انجام سے بھی مطلع کردیا گیا۔ اور اس امر سے آگاہ کردیا گیا کہ جو خدا زندہ قوموں کو مارنے کی قدرت رکھتا ہے وہ مردوں کو زندگی بخشنے کی قدرت بھی رکھتا ہے تاکہ خدا کی قدرتِ کاملہ پر پورا یقین ہوسکے اور کسی سطح پر بھی مایوسی وناامیدی دامن گیر نہ ہونے پائے۔

سورۂ بقرہ نے اہلِ حق کی جدوجہد میں کامیابی کے لئے ضروری ہدایات اور بنیادی تعلیمات فراہم کی ہیں۔ چونکہ اس کی آیات مختلف مواقع پر حسبِ حال و ضرورت نازل ہوتی رہیں۔ اس لئے ان کا حقیقی مدعا اور باہمی تعلق سمجھنے کی خاطر مذکورہ بالا پس منظر سے آگہی نہایت ضروری ہے۔

خصوصیت:۔

سورہ بقرہ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت ہے اس کی دو سو چھیاسی آیات ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ سورہ بقرہ "سنام القرآن" اور "ذروۃ القرآن"

ہے۔ (سنام ہر چیز کے اعلیٰ اور افضل حصے کو کہتے ہیں اور ذروہ چوٹی کو کہتے ہیں) اس میں ایک ایسی آیت ہے جو آیات قرآن کی سردار ہے وہ "آیتہ الکرسی" ہے۔ (ترمذی' دارمی' طبرانی' مسند احمد)

امام شعبیؒ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔" جس شخص نے رات کو سورہ بقرہ کی دس آیات کی تلاوت کی وہ گھر اس رات شیطان سے محفوظ ہو گیا۔ ان میں چار آیات پہلی۔ ایک آیت الکرسی اور دو اس کے بعد کی اور تین آیات آخری ہیں"۔ (دارمی)

کتب صحاح میں یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جس شخص نے سورہ بقرہ کی آخری دو آیات رات کو پڑھیں تو وہ اس کو (شب بیداری) کی جگہ کافی ہیں۔

کثرت مضامین کے لحاظ سے بھی سورہ بقرہ کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں ایک ہزار اوامر' ایک ہزار نواہی' ایک ہزار حکمتیں اور ایک ہزار اخبار و قصص موجود ہیں۔ (قرطبی و ابن کثیر)

اس حقیقت کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے سورہ بقرہ کو بارہ سال میں مکمل کیا۔

اٰيَاتُهَا ۲۸۶ | ۲ : سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ : ۸۷ | رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

سورۂ بقرہ مدنی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانیوالا ہے۔

الٓمّٓ ۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

الٓمّٓ۔ (یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

(یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا

اور نماز کو (تمام حقوق کے ساتھ) قائم کرتے ہیں اور جو کچھ

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۳ وَالَّذِيْنَ

ہم نے انہیں عطا کیاہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ

يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا (سب) پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۴

ایمان لاتے ہیں، اور وہ آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں۔

آیت	مضمون	
۱	۱	حروفِ مقطّعات

ف۔ کچھ رموز اور اشارات صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین راز ہیں دوسروں کو اصلاً ان کے ادراک میں کوئی دخل نہیں پھر حضورؐ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جسے چاہتے ہیں بقدرِ ظرف و استعداد اس میں سے حصّہ عطا فرماتے ہیں۔ حاشیہ نمبر ۱ "الٓمٓ اور اعجازِ شانِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" صفحہ نمبر ۲۴۶ پر دیکھیں۔

آیت	مضمون	
۲	۲	۱۔ عظمتِ قرآن اور حقّانیتِ قرآن کا بیان

قرآن مجید کی اصلیت، صحت، حقّانیت اور قطعیت میں کسی لحاظ سے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

حاشیہ نمبر ۲ "عظمت و حقانیتِ قرآن اور صداقتِ رسالتِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" صفحہ نمبر ۲۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون	
۲	۳	قرآن کا مُتّقین کے لیے ہدایت ہونا۔

اس سے مُراد ہدایتِ خاصہ ہے جبکہ عام انسانوں کے لیے قرآن عمومی ہدایت بھی فراہم کرتا ہے۔

آیت	مضمون	
۳	۴	صفاتِ مُتّقین۔

اس آیت میں متّقین کی درج ذیل پانچ صفات بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ ایمان بالغیب

اللہ تعالیٰ کی ذات، ملائکہ اور آخرت وغیرہا سب غیب ہیں ان پر ایمان صرف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اطلاع دینے سے ممکن ہُوا۔ لہٰذا ایمان بالغیب کا مدار بھی پیکرِ نبوّت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر غیر مشروط اعتماد اور کامل یقین پر ہے۔

حاشیہ نمبر ۳ "ایمان بالغیب اور شانِ نبوت" صفحہ نمبر ۲۵۶ پر دیکھیں۔

۲۔ اقامتِ صلوٰۃ ۳۔ انفاق فی سبیل اللہ ۴۔ ایمان بالوحی ۵۔ ایقان بالآخرت

حاشیہ نمبر ۴ اقامتِ صلوٰۃ اور دینِ مصطفوی کا عملی تصور صفحہ ۲۵۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حاشیہ نمبر ۵ رزق و انفاق کا مفہوم اور مصطفوی انقلاب کی معاشیاتی بنیاد صفحہ ۲۶۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ف۔ اہلِ طاعت ابتداءً بغیر مشاہدۂ انوار کے ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں۔ نماز کے ذریعے روحانی معراج اور مقامِ مشاہدہ تک پہنچتے ہیں پھر انہیں قُرب و معرفتِ الٰہی کے انوار نصیب ہوتے ہیں اور وہ انہی انوار میں سے طالبین کے قلوب پر افاضہ (فیض جاری) کرتے ہیں۔

أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ

وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی حقیقی کامیابی پانے والے

الْمُفْلِحُوْنَ ۝٥ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ

ہیں - بے شک جنہوں نے کفر اپنایا ہے ان کے لئے برابر ہے خواہ آپ

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ

انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ، وہ ایمان نہیں لائیں گے - اللہ نے اُن کے

اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ

دلوں اور کانوں پر مُہر لگادی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑگیا)

غِشَاوَةٌ ز وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ ع وَمِنَ النَّاسِ ع ١

ہے اور اُن کے لئے سخت عذاب ہے - اور لوگوں میں سے

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ

بعض وہ (بھی) ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ

بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٨ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج وَ

(ہرگز) مومن نہیں ہیں - وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر

مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩ ط فِيْ

(فی الحقیقت) وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے ان کے

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ لا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ج وَلَهُمْ

دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ لا بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝١٠ وَاِذَا قِيْلَ

دردناک عذاب ہے - اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے - اور جب ان سے

آیت	مضمون	
۴	۵	**حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فضیلت علی الانبیاء اور ختمِ نبوّت کی تصریح۔**

آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام انبیاء کے بعد مبعوث ہوئے مگر آپ کا ذکرِ مبارک سب سے پہلے کیا گیا ہے اس سے آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام انبیاء و رسل پر فضیلت معلوم ہوئی۔

وحی صرف حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اور آپ سے پہلے نازل ہوئی۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی وحی کے نزول کا ذکر نہیں۔ اگر آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی پر نزولِ وحی کا امکان ہوتا تو اس آیت میں یہ حکم بھی دیا جاتا "وَمَا يُنْزَلُ مِنْ بَعْدِكَ" (اور جو وحی آپ کے بعد نازل ہوگی اس پر بھی ایمان لاتے ہیں۔)

حاشیہ نمبر۴ "حضور کی تمام انبیاء پر فضیلت اور آپ کی شانِ ختمِ نبوت" صفحہ نمبر ۲۶۷ پر دیکھیں۔

ف ۔ ایمان بالانبیاء پر قیاس کرتے ہوئے مریدین اور سالکین کو چاہیے کہ تمام مشائخ کے حق میں حسنِ اعتقاد اور حُسنِ ادب کو ملحوظ رکھیں مگر اتباع میں مقدم اپنے شیخ کو جانیں۔

آیت	مضمون	
۵	۶	**متّقین کا انجام خیر دو اُمور پر مشتمل ہوتا ہے۔**

۱- ہدایتِ ربّانی ۲- حقیقی فلاح و کامیابی۔

آیت	مضمون	
۶	۷	**کفّار و منکرین کا نصیحت کی طرف متوجہ ہونے اور اسے قبول کرنے سے گریز۔**

آیت	مضمون	
۷	۸	**۱- منکرین کا انتہائی تعصّب اور عناد کے باعث قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو جانا۔**

۲- بدبختی پر عذابِ شدید کی وعید۔

ف ۔ شقاوتِ قلبی کے باعث وصولِ فیض اور حصولِ معرفت کے سب دروازے بند ہو جاتے ہیں اور محرومیِ قرب کے تکلیف دہ عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

حاشیہ نمبر ۷ "دعوتِ محمّدی صلے اللہ علیہ وسلم اور ہٹ دھرم کافروں کی محرومی" صفحہ نمبر ۲۶۹ پر دیکھیں۔

آیت	مضمون	
۸	۹	**مُنافقین کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا دعویٰ بھی نامقبول ہوتا ہے۔**

ف ۔ اہلِ دعاوی اخلاص و قبولیت سے محروم ہوتے ہیں۔

حاشیہ نمبر ۸ "منافقین کا دعویٰ ایمان کیوں مقبول نہیں ہے؟" صفحہ نمبر ۲۷۶ پر دیکھیں۔

لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ

کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو کہتے ہیں ہم ہی تو اصلاح کرنے والے

مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ

ہیں - آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ (حقیقت میں) فساد کرنے والے ہیں مگر انہیں (اس کا)

لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ

احساس تک نہیں - اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (تم بھی) ایمان لاؤ جیسے

النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ

(دوسرے) لوگ ایمان لے آئے ہیں، تو کہتے ہیں کیا ہم بھی (اسی طرح) ایمان لے آئیں جس طرح (وہ)

اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا

بیوقوف ایمان لے آئے، جان لو بیوقوف (درحقیقت) وہ خود ہیں لیکن انہیں (اپنی بیوقوفی اور ہلکے پن کا) علم نہیں

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ

اور جب (وہ منافق) اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ

تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں، ہم (مسلمانوں کا تو) محض مذاق اڑاتے ہیں - اللہ انہیں

يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

ان کے مذاق کی سزا دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے (تاکہ وہ خود اپنے انجام تک جا پہنچیں) سو وہ خود اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی لیکن ان کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور وہ (فائدہ مند

تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي

اور نفع بخش سودے کی) راہ جانتے ہی نہ تھے - ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جس نے (تاریک

آیت ۹	مضمون ۱۰	حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دھوکہ دہی کا ارادہ خود باری تعالیٰ سے دھوکہ دہی کا ارادہ تصور ہوتا ہے

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری خود باری تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہے اسی طرح کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دھوکہ دہی کا ارادہ کرنا خود باری تعالیٰ سے دھوکہ دہی کے ارادے کے مترادف ہے یہ اندازِ خطاب تکریمِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اظہار کے لیے اپنایا گیا ہے اس میں توحید و رسالت کے درمیان وحدتِ حکمی کی طرف اشارہ ہے۔

ف ۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب بندوں کے ساتھ بے ادبی، مخالفت، عداوت اور مخادعت کا معاملہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے باری تعالیٰ سے ایسا معاملہ کیا جائے انبیاء واولیاء کے تعلق اور ادب میں یہ نکتہ ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیئے۔

حاشیہ نمبر ۹ "بارگاہِ الٰہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت اور منافقین کی سوچ" صفحہ نمبر ۲۷۹ پر دیکھیں۔

آیت ۱۰	مضمون ۱۱	منافقین کی خود فریبی اور بارگاہِ الٰہی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قدر ومنزلت

حاشیہ نمبر ۱۰ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر منزلت کا انکار دلوں کا روگ ہے" صفحہ نمبر ۲۸۲ پر ملاحظہ کریں۔

۱۔ منافقت دل کی بیماری ہے۔

۲۔ منافقت کی بیماری گھٹنے کی بجائے مزید بڑھتی ہے۔

۳۔ منافقت کی بیماری میں جھوٹ عادت بن جاتا ہے۔

ف ۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کا فقدان، آپ کی قدر ومنزلت کا انکار اور اہل اللہ کی بے ادبی قلبی امراض کے اسباب میں سے ہیں اور قلبی مرض کے سبب انسان حق سے غافل اور دنیا میں شاغل ہوتا چلا جاتا ہے۔

آیت ۱۱	مضمون ۱۲	منافقوں کی اصلاح کے نام پر فساد انگیزی۔

حاشیہ نمبر ۱۱ "منافقت کا گھناؤنا روپ" "نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی" صفحہ نمبر ۲۸۴ پر دیکھیں۔

آیت ۱۲	مضمون ۱۳	منافقوں کو اپنی فساد انگیزی کا شعور نہیں ہوتا۔

اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

ماحول میں) آگ جلائی اور جب اس نے گردونواح کو روشن کر دیا تو اللہ نے اُن کا نور سلب کر لیا

بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ

اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا اب وہ کچھ نہیں دیکھتے ۔ یہ بہرے ، گونگے

عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ

اندھے ہیں پس وہ (راہِ راست کی طرف) نہیں لوٹیں گے ۔ یا ان کی مثال اُس بارش کی سی ہے جو

فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

آسمان سے برس رہی ہے جس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک (بھی) ہے تو وہ کڑک کے

فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ

باعث موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں ، اور اللہ کافروں کو

مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۗ

گھیرے ہوئے ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ بجلی ان کی بینائی اُچک لے جائے گی ، جب

كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۗ

ان کے لئے (ماحول میں) کچھ چمک ہوتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو

وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ اِنَّ

کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل سلب کر لیتا ، بے شک

اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا ع ۲

اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے

رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تمہیں پیدا کیا اور اُن لوگوں کو (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیزگار بن

مضمون	آیت
۱۴	۱۲

منافقوں کا زعمِ باطل

منافق اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ یہ گمان کا گمان باطل ہوتا ہے۔ وہ حقیقت میں خود بے وقوف ہوتے ہیں۔

حاشیہ نمبر ۱۲ "دوسروں کو بیوقوف اور صرف خود کو عقلمند سمجھنا خود بیوقوفی ہے" صفحہ نمبر ۲۸۷ پر ملاحظہ فرمائیں

مضمون	آیت
۱۵	۱۴

منافقانہ کردار کی دو خاص علامتیں

۱۔ سازشی مزاج اور دوغلا پن۔

۲۔ استہزار بالحق۔

منافق اپنے خیال میں دوسروں کی تضحیک اور استہزار کرتا ہے اور ہمیشہ دوہرے کردار کا حامل ہوتا ہے۔

مضمون	آیت
۱۶	۱۵

۱۔ استہزار بالحق کا انجام غضب الٰہی ہوتا ہے۔

۲۔ منافقوں کو اُن کی سرکشی میں ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی تباہی کے آخری کنارے تک جا پہنچیں۔

حاشیہ نمبر ۱۳ "کردار کا دوغلا پن اور سازشی منصوبہ بندی کھلی منافقت ہے" صفحہ نمبر ۲۹۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون	آیت
۱۷	۱۶

۱۔ منافقوں کا ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنا۔

۲۔ منافقوں کی تجارت گھاٹے کا سودا ہے۔

ف۔ قناعت کے بدلے حرص اور توجہ الی اللہ کی بجائے میلانِ دُنیا روحانی خسارے کی علامتیں ہیں۔

مضمون	آیت
۱۸	۱۷

منافقت کی عملی مثال۔

ایمان سے نور میسّر آتا ہے، ماحولِ حیات بھی روشن ہونے لگتا ہے مگر دل میں کفر کی مخفی کیفیات و علامات موجود رہیں اور انہیں ختم کرنے پر محنت نہ کی جائے تو ایمان سے میسر آیا ہوا نور بھی سلب ہو جاتا ہے اور ظاہر و باطن پھر تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں۔ گویا نورِ ایمان کے میسر آنے سے زیادہ مشکل اور کٹھن کام اس کی حفاظت کرنا ہے۔

تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ

جاؤ - جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمانوں کی

السَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ

طرف سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کے لئے (انواع و اقسام کے)

بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا

پھل پیدا کئے، پس تم اللہ کے لئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم (حقیقتِ حال)

وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا

جانتے ہو - اور اگر تم اس (کلام) کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے

نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَ

(برگزیدہ) بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور (اس

ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

کام کے لئے بیشک) اللہ کے سوا اپنے (سب) حمائتیوں کو بلا لو اگر تم (اپنے شک اور انکار میں)

صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا

سچے ہو - پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا

النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ

ایندھن آدمی (یعنی کافر) اور پتھر (یعنی ان کے بت) ہیں، جو کافروں کے لئے

لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

تیار کی گئی ہے - اور آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیں جو ایمان لائے اور نیک عمل

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا

کرتے رہے ان کے لئے (بہشت کے) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب انہیں ان

آیت	مضمون	
۱۸	۱۹	منافق حق سننے، کہنے اور دیکھنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔

آیت	مضمون	
۱۹	۲۰	منافقت کی ماحولیاتی مثال۔

اسلام کے ان پہلوؤں کو آسانی سے قبول کرنا جن میں قربانیاں اور پریشانیاں نہ ہوں مگر راہِ حق کی مصائب و مشکلات سے کترانا، جان بچانا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا، منافقت کی علامات میں سے ہے۔ ہمیں اس پیمانے پر اپنے قلب و باطن کو پرکھنا چاہیے۔

آیت	مضمون	
۲۰	۲۱	منافقت کی نفسیاتی مثال۔

منافقوں کا طرزِ عمل مفاد پرستانہ اور بزدلانہ ہوتا ہے۔ حالات موافق اور سازگار ہوں تو ساتھ چلتے ہیں۔ اگر حالات ناموافق اور ناسازگار ہو جائیں تو رُک جاتے ہیں یا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

(۲۲) اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور قُدرتِ کاملہ کا بیان۔

ف۔ جو لوگ طریقِ صوفیاء کو بلا تحقیق محض تقلیداً اپناتے ہیں اُن میں استقامت نہیں آتی۔ کچھ عرصہ کی طاعت و مجاہدہ کے بعد اگر انہیں حلاوات و کرامات کا نُور دکھائی دے تو آگے چلتے ہیں۔ اگر احتباس اور حجاب رہے اور مشاہدات نہ ہوں تو رُک جاتے ہیں بلکہ اعمال و ریاضات بھی ترک کر دیتے ہیں اس لیے تصوف اور سُلوک میں علم اور تحقیق پہلا قدم ہے۔ اس کے بغیر یہ راستہ سخت خطرناک ہے۔

حاشیہ نمبر۱۴ "منافقین کے دو گروہوں کی مثال" صفحہ نمبر ۳۰۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون	
۲۱	۲۳	عبادتِ الٰہی کا حُکم۔

(۲۴) اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت اور انسانی مبدأ کا بیان۔

(۲۵) غایتِ عبادت تقوٰی ہے۔

ہمیشہ عبادات کے ذریعہ حصولِ تقوٰی کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ تقوٰی اور پرہیزگاری ہی زندگی کا حسن ہے۔

آیت	مضمون	
۲۲	۲۶	انسان کی جسمانی زندگی کی کفالت کا اہتمام۔

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ

باغات میں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو (اس کی ظاہری صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی

رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ

پھل ہے جو ہمیں (دنیا میں) پہلے دیا گیا تھا، حالانکہ انہیں (صورت میں) ملتے جلتے پھل دیئے گئے ہوں گے،

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ

ان کے لئے جنت میں پاکیزہ بیویاں (بھی) ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔ بے شک

اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ (سمجھانے کے لئے) کوئی بھی مثال بیان فرمائے (خواہ) مچھر کی ہو یا (ایسی چیز

فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ

کی جو حقارت میں) اس سے بھی بڑھ کر ہو، تو جو لوگ ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال ان کے

مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ

رب کی طرف سے حق (کی نشاندہی) ہے، اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ (اسے سن کر) کہتے ہیں کہ ایسی

اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ

تمثیل سے اللہ کو کیا سروکار؟ (اس طرح) اللہ ایک ہی بات کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا

بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ

ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس سے صرف انہی کو گمراہی میں ڈالتا ہے جو (پہلے ہی) نافرمان ہیں ۔

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ

(یہ نافرمان وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے عہد کو اس سے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں، اور اس (تعلق) کو کاٹتے ہیں جس کو

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد بپا کرتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے

(۲۷) شرک کی ممانعت اور آثارِ خالقیت و قدرت کے دلائل۔

ف۔ غیر کی طرف قلب و باطن کا التفات تعلق باللہ میں حارج ہوتا ہے۔

آیت	مضمون	
۲۳	۲۸	حقانیت قرآن کے منکرین کو چیلنج۔

(۲۹) انسان کی روحانی زندگی کی کفالت کا اہتمام۔

(۳۰) مسلمانوں کی روحانی کفالت کے دو سرچشمے۔

۱۔ قرآن ـــــ یہ مِمَّا نَزَّلْنَا سے ثابت ہے۔
۲۔ صاحبِ قرآن ـــ یہ عَلٰی عَبْدِنَا سے ثابت ہے۔

قرآنی نسبت اور محمدی نسبت، دونوں کے برقرار رہنے سے ایمان کی حفاظت ہوتی ہے۔

ف۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی عبدیت کاملہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام و مرتبہ کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ حاشیہ نمبر ۱۵ "عبدیت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کا علوِ مرتبت" صفحہ نمبر ۲۰۸ پر دیکھیں۔
حاشیہ نمبر ۱۶ "من دون اللہ کا مفہوم اور شانِ انبیاء و اولیاء کا امتیاز" صفحہ نمبر ۲۱۲ پر دیکھیں۔

آیت	مضمون	
۲۴	۳۱	انکارِ قرآن کا انجام نہایت ہلاکت انگیز ہے۔
۲۵	۳۲	ایمان اور اعمالِ صالحہ پر حسنِ معاد کی بشارت۔

(۳۳) جنّت کے حسین احوال کا بیان۔

آیت کا ایک رُوحانی مفہوم

ایمان کے باغات ہوں اِن کے نیچے اعمالِ صالحہ کی نہریں بہتی ہوں تب انعاماتِ الٰہیہ کے ثمرات نصیب ہوتے ہیں۔ پھر پاکیزہ اُخروی سنگتیں اور صحبتیں میسر آتی ہیں اور بالآخر لطفِ قربِ الٰہی کے باعث احوال میں دوام و استقامت عطا ہوتی ہے۔

ف۔ اہلِ معرفت کو اپنے ایمان و عمل کی برکت سے اسی زندگی میں کئی جنّتیں نصیب ہوتی ہیں۔ مثلاً

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ

والے ہیں ۔ تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ

تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔ وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے

الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ

پیدا کیا، پھر وہ (کائنات کے) بالائی حصوں کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے انہیں درست کر کے ان کے

ع ۳ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ وَاِذْ قَالَ

سات آسمانی طبقات بنا دیئے، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۔ اور (وہ وقت یاد کریں)

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، انہوں نے

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ

عرض کیا، کیا تُو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد انگیزی کریگا اور خونریزی کریگا؟

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّيْٓ

حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (ہمہ وقت) پاکیزگی بیان کرتے ہیں، (اللہ نے) فرمایا

اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔ اور اللہ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیئے پھر

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ

انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر

جنّتِ عبودیت ۔ جنّتِ ربوبیت ۔ جنّتِ محبت ، جنّتِ معرفت ، جنّتِ قُربت ، جنّتِ مشاہدہ ، جنّتِ وصال
جنّتِ بقاء وغیرہ ۔ اِن سب جنّات کے نیچے الگ الگ روحانی نہریں رواں ہوتی ہیں ۔

جنّتِ عبودیت کی نہر حقائق حکمت کا ادراک ہے ۔ جنّتِ ربوبیت کی نہر تجلّیِ حق کی روٴیت ہے ۔

جنّتِ محبت کی نہر رضا ہے ۔ جنّتِ معرفت کی نہر اخلاص ہے ۔ جنّتِ قربت کی نہر نورِ صفاتِ الٰہی ہے ۔

جنّتِ مشاہدہ کی نہر لطائف ہے جنّتِ وصال کی نہر محبت ہے اور جنّتِ بقاء کی نہر سکینہ ہے ۔

پھر ان کے الگ الگ ثمرات ہیں ان میں ناسوتی بھی ہیں ملکوتی بھی جبروتی بھی ہیں اور لاھوتی بھی ۔ وہ من وجہٍ تشابہ اور من وجہٍ متمیز بھی ۔

حاشیہ نمبر ۱۷ "جنتی ثمرات اور ظاہری اور حقیقی مماثلت میں فرق" صفحہ نمبر ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں

آیت ۲۶	مضمون ۳۴	قرآنی تمثیلات کا مقصد حق کو خوب واضح کرنا ہے ۔

(۳۵) اہلِ ایمان تمثیلاتِ قرآنی سے حق کی معرفت حاصل کرتے ہیں ۔

(۳۶) اہلِ کفر تمثیلاتِ قرآنی پر بھی اعتراض کرتے ہیں ۔

(۳۷) ۱۔ حق شناس لوگ قرآنی بیان سے ہدایت لیتے ہیں ۔

۲۔ ہٹ دھرم لوگ قرآنی بیان سے بھی خود کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ۔

حاشیہ نمبر ۱۸ "تمثیلی کلام کے رموز اور شانِ انبیاء و اولیاء کے ادراک میں کوتاہی" صفحہ نمبر ۲۲۲ پر دیکھیں ۔

آیت ۲۷	مضمون ۳۸	نافرمانوں کی صفات و علامات ۔

۱۔ عہدِ الٰہی کو توڑنا ۲۔ قطع رحمی کرنا ۳۔ زمین میں فساد انگیزی کرنا ۴۔ دین و آخرت میں خسارہ اٹھانا ۔

آیت ۲۸	مضمون ۳۹	۱۔ اِنسان کی دو موتیں اور دو زندگیاں ۔

۲۔ قیامت کے دن اُٹھنے سے پہلے بھی اِنسان کو قبر اور برزخ میں زندگی میسّر ہوتی ہے ۔

حاشیہ نمبر ۱۹ "انسانی سفر کے مراحل اور حیاتِ برزخی کا ثبوت" صفحہ نمبر ۲۳۰ پر دیکھیں

هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ

تم (اپنے خیال میں) سچے ہو ۔ فرشتوں نے عرض کیا تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے

لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٢﴾ قَالَ

ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تُو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے ۔

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ

اللہ نے فرمایا، اے آدم! (اب تم) انہیں ان اشیاء کے ناموں سے آگاہ کرو، پس جب آدم نے انہیں ان اشیاء

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ

کے ناموں سے آگاہ کیا تو (اللہ نے) فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی (سب مخفی

الْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٣٣﴾

حقیقتوں کو جانتا ہوں، اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور (وہ وقت بھی یاد کریں) جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے

اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَ

ابلیس کے، اس نے انکار اور تکبر کیا اور (نتیجۃً) کافروں میں سے ہو گیا ۔ اور

قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا

ہم نے حکم دیا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں رہائش رکھو اور تم دونوں اس میں سے

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

جو چاہو، جہاں سے چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

والوں میں (شامل) ہو جاؤ گے ۔ پھر شیطان نے انہیں اس جگہ سے ہلا دیا اور

ف۔ انسان عالمِ خلق اور عالمِ امر دونوں کے اجزاء صفات سے مرکب ہے ایک قسم سے اس کا وجودِ عنصری قائم ہے اور دوسری سے وجودِ روحانی۔ ایک کی فنا سے دوسرے کی بقاء ہے اور اسی سمت میں ارتقاء طریقِ وصال ہے۔

آیت ۲۹	مضمون ۴۰	صفاتِ الٰہیہ کا بیان۔

۱ خلق مافی الارض ۲ سات سماوی طبقات کی تخلیق۔

۳۔ باری تعالےٰ کا احاطۂ علمی۔

حاشیہ نمبر ۲۰ "تخلیق کائنات کا مقصود انسان اور کمال انسانیت کا مرقع وجودِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم" صفحہ نمبر ۲۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت ۳۰	مضمون ۴۱	تخلیقِ آدم علیہ السّلام اور خلافتِ ارضی کا بیان

حاشیہ نمبر ۲۱ تا ۲۴ ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۲۴۲ تا ۲۶۲

کلمہ "اذ" کے ذریعے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تخلیق آدم علیہ السّلام سے پہلے کا واقعہ یاد دلایا جارہا ہے۔ یاد دلانے کے لیے اصلاً اس واقعہ کا پہلے سے علم ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ یاد دلانا درست نہیں۔ اس سے تخلیقِ آدمؑ سے پہلے کے احوال کا علم بھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت ہوتا ہے یہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابتداء سے انتہا تک کے احوال کی اطلاع فرمائی گئی۔

(۴۲) انسانی سرشت میں خونریزی کا جوہر ہی شجاعت اور انقلابیت کے باعث بنائے قیادت و خلافت بنتا ہے۔

ف۔ انسان میں مذموماتِ نفس بھی ہیں اور محمودات روح بھی۔ علم و معرفت کا نور نفسانی ظلمتوں پر غالب آجائے تو یہی خلافت کی بنیاد ہے جن لوگوں میں براہِ راست تزکیہ کی کمی کے باعث قبولِ فیض اور تحمل تجلیات کی استعداد نہیں ہوتی خلافت ان کے لیے واسطہ کا درجہ رکھتی ہے خلیفہ کا فیض بھی شیخ ہی کے فیض کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کی حیثیت مظہر کی ہوتی ہے

(۴۳) محض تسبیح و تحمیدِ الٰہی استحقاقِ خلافت کی بنیاد نہیں۔

(۴۴) انسانی فطرت میں مخفی صلاحیتوں کا بیان۔

قیادت و خلافت کی اہلیت کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ و عبادت اور علم و آگہی کے ساتھ حق کی خاطر

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

انہیں اس (راحت کے) مقام سے، جہاں وہ تھے، الگ کر دیا اور (بالآخر) ہم نے حکم دیا کہ تم نیچے اتر جاؤ،

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ

تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب تمہارے لئے زمین میں ہی معینہ مدت تک جائے قرار ہے اور

اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ

نفع اٹھانا مقدر کر دیا گیا ہے۔ پھر آدم نے اپنے رب سے (عاجزی اور معافی کے) چند کلمات سیکھ لئے پس اللہ

عَلَيْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا

نے اُن کی توبہ قبول فرمالی، بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ ہم نے فرمایا تم سب

مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

جنت سے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَ

کی پیروی کرے گا، نہ اُن پر کوئی خوف (طاری) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے تو وہی دوزخی ہوں گے، وہ

النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾ ع يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اے اولادِ یعقوب! میرے وہ انعام یاد کرو جو میں نے

نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ

تم پر کیے اور تم میرے (ساتھ کیا ہوا) وعدہ پورا کرو میں تمہارے (ساتھ کیا ہوا) وعدہ

بِعَهْدِكُمْ ج وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ اور اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے

کٹ مرنے، جان دینے اور خون بہانے کی جرأت، حوصلہ اور جذبہ بھی ہر اسی سے ماحولِ حیات میں حق و باطل کی معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ انقلاب بپا ہوتے ہیں اور حق غالب آتا ہے اس جرأتِ انقلاب کے بغیر عبادت، بزدلی میں دب کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلبۂ حق کے لیے جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کی سرشت میں یہ جوہر تو دیکھ رہے تھے مگر اس کے مثبت استعمال کی حقیقت ان پر آشکار نہ تھی اس لیے سوال کیا کہ کیا خونریزی کرنے والوں کو نیابت و قیادت دی جا رہی ہے؟

آیت ۳۱	مضمون ۴۵	حضرت آدم علیہ السلام کا علمی فضل و کمال۔

حاشیہ نمبر ۲۵ "حضرت آدم علیہ السلام اور علم الاسماء کی حقیقت" صفحہ نمبر ۳۶۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔
حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاءِ عالم کے اسماء و صفات کا علم اور ان کی معرفت عطا کی گئی۔

آیت ۳۲	مضمون ۴۶	فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے علم کے سامنے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔

آیت ۳۳	مضمون ۴۷	حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر علمی فوقیت۔

حاشیہ نمبر ۲۶ "حضرت آدم علیہ السلام کی علمی عظمت اور فلسفہ تضاد و جدال کی قرآنی اصل" صفحہ ۳۷۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۴۸) فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ اور یاد دہانی۔

آیت ۳۴	مضمون ۴۹	۱۔ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدۂ تعظیمی کا حکم۔

۲۔ ابلیس کا سجدۂ آدم علیہ السلام سے انکار۔

۳۔ کفرِ ابلیس کا سبب تکبّر اور گستاخیِ نبوت بنا۔

ف: تکبر اور گستاخی کا ایک لمحہ طاعات و عبادات کی ساری عمر کی محنت برباد کر دیتا ہے جبکہ عاجزی، تواضع اور ادب سے سابقہ قصور بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

حاشیہ نمبر ۲۷ "حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ کی حقیقت اور تکریم نبوت کی اہمیت" صفحہ نمبر ۳۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون	
۳۵	۵۰	حضرت آدم علیہ السّلام اور حضرت حوّا رضی اللہ عنہا کی جنّت میں سکونت۔

(۵۱) جنّتی نعمتوں کی فراوانی۔

(۵۲) درخت کے قریب جانے کی آزمائشی ممانعت۔

ف۔ درخت کی قُربت فی نفسہٖ ممنوع نہ تھی۔ اصل ممانعت محض اکل (پھل کھانے) کی تھی۔ مگر اکل سے روکنے کی خاطر قربت سے بھی روک دیا۔ کیونکہ قربت، اکل کا باعث ہو سکتی تھی۔ اسی اصول کے تحت صوفیہ تہذیبِ نفس کےلیے مجاہدات کے دوران بعض مباحات سے بھی پرہیز کرتے اور کراتے ہیں تاکہ ان مباحات کی پرہیز کے ذریعے ممنوعات کی پرہیز میں پختگی اور استقامت آجائے۔

آیت	مضمون	
۳۶	۵۳	دونوں کو ابلیس کا بہکاوا۔

(۵۴) جنّت سے خروج اور ھبوط۔

(۵۵) انسانوں کا باہمی تضاد و عداوت اور جدلیات کا قرآنی فلسفہ۔

(۵۶) انسانوں کے لیے مستقر اور متاع کی فراہمی۔

مستقر میں معاشرے کے اندر سیاسی آزادی اور سماجی استحکام کی طرف اشارہ ہے اور متاع میں معاشی و اقتصادی فوائد کا ذکر ہے۔ گویا زمین میں انسانوں کو سیاسی آزادی، سماجی استحکام اور معاشی عدل کے تینوں حقوق بنیادی طور پر یکساں عطا کر دیے گئے ہیں۔ یہ امرِ الٰہی ہے۔ زمینی زندگی میں کچھ لوگ دوسروں سے یہ حقوق سلب کرنا چاہیں گے۔ یہی استحصالی عمل انسانی زندگی میں تضاد و تصادم اور عداوت کی بُنیاد ثابت ہوگا۔ اس تضاد کا حقیقی حل صرف ہدایتِ ربانی کی اتباع میں مُضمر ہے انسان کے تمام تراشیدہ فلسفے اور نظریے ان تضادات کو بڑھا تو سکتے ہیں ختم نہیں کر سکتے اس حکم کی تصریح آگے آیت ۳۸ میں آرہی ہے۔

ف۔ ۱۔ شیطانی حملے صرف ناقص اور مبتدی پر ہی نہیں کامل و منتہی پر بھی ہوتے ہیں۔ منازلِ سلوک میں اوّل سے آخر تک حفاظت و توفیقِ الٰہی کی حاجت رہتی ہے۔

۲۔ نافرمانوں کو گناہوں کے ارتکاب پر مزید ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ نافرمانی اور سرکشی میں خوب بڑھ جائیں اور زیادہ عذاب کے مستحق ٹھہریں۔ مگر فرمانبرداروں اور نیک کاروں کو ادنیٰ لغزش اور غیر ارادی خطا پر بھی فوری گرفت کی جاتی ہے تاکہ

تزکیہ وتصفیہ میں مزید کمال حاصل کریں اور احساسِ خطا سے ندامت اور توبہ کی طرف زیادہ راغب ہوں اس سے انہیں مزید روحانی ترقی میسر آتی ہے سو ڈھیل نافرمانوں کے لیے غضب الٰہی اور گرفت فرمانبرداروں کے لیے رحمت الٰہی ہے۔

آیت	مضمون
٣٧	٥٧

١- حضرت آدمؑ کو بارگاہِ الٰہی سے کلماتِ توبہ کی تعلیم۔

٢- حضرت آدم علیہ السلام کی قبولِ توبہ۔

طبرانی، حاکم، ابو نعیم، ابنِ منذر اور بیہقی نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دُعا کی اور " ربّنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین " کے بعد ان کلمات سے توسّل کیا۔ " اللّٰھمّ انی اسئلک بجاہِ محمد ان تغفرلی خطیئتی " اے اللہ میں تجھ سے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزّت ومرتبت کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ میری خطا معاف فرما دیجئے۔" چنانچہ آپ کی توبہ اور دُعا قبول فرمائی گئی۔

ف- گرفت کے ساتھ کلماتِ توبہ بھی تلقین فرمادیے اور تادیب کے ساتھ معافی کا اشارہ بھی فرمادیا۔ اپنوں سے ایسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ ابتلاء توبہ سے ختم ہوتا ہے اور کثرتِ توبہ ترقیِ درجات کا باعث ہے ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّاؑ نے ندامتہً چالیس روز تک کھانا پینا بند رکھا۔ سو سال تک ایک دُوسرے سے قُربت نہ کی اور دو سو سال تک روتے رہے اور شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ حضرت آدمؑ نے تین سو سال تک حیاءً اپنا سر اوپر نہ اُٹھایا۔ الغرض توبہ میں ندامت، گریہ، استغفار، تضرع اور دُعا کی کثرت محمود ہے۔

حاشیہ نمبر ٢٨ " حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسل سے قبول ہوئی " صفحہ نمبر ٣٨٠ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون
٣٨	٥٨

ذرّیتِ آدم (علیہ السلام) کا زمین پر رہنا اور ان کے لیے ہدایتِ ربّانی کا نزول

(٥٩) ہدایتِ ربّانی کی اِتباع پر حفاظت اور امن کا وعدہ۔

آیت	مضمون
٣٩	٦٠

کُفر اور تکذیبِ حق کی سزا۔

آیت	مضمون
٤٠	٦١

بنی اِسرائیل کو تنبیہہ۔

(٦٢) ایفائے عہد کا حُکم۔

بنی اسرائیل سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی بدولت جنت کا وعدہ۔

ف- ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سندِ صحیح کے ساتھ مروی ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ تم حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَ

(اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر) اتاری (ہے) ۔ (حالانکہ) یہ اسکی (اصلّا) تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾

تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ ہو اور میری آیتوں کو (دنیا کی) تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہ کرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ

اور حق کی آمیزش باطل کے ساتھ نہ کرو اور نہ ہی حق کو جان بوجھ کر چھپاؤ ۔ اور

تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ

نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ

ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ

(مل کر) رکوع کیا کرو ۔ کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو

وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا

اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم (اللہ کی) کتاب (بھی) پڑھتے ہو، تو کیا

تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَ

تم نہیں سوچتے ؟۔ اور صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد چاہو، اور بیشک

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿٤٥﴾ ۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

یہ گراں ہے مگر (ان) عاجزوں پر (ہرگز) نہیں (جن کے دل محبتِ الٰہی سے خستہ اور خشیتِ الٰہی سے شکستہ ہیں) ۔ (یہ وہ لوگ ہیں)

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿٤٦﴾ ع ٥ ع ٥

جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ

اے اولادِ یعقوب! میرے وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیئے اور یہ کہ

کی بعثت پر ایمان اور ان کی اتباع کا عہد پورا کرنا ہیں تمہارے بوجھ ختم کرنے کا عہد پورا کروں گا اور تم سے جنت کا وعدہ ایفاء کروں گا۔ معلوم ہوا کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت غلامی سے مشکلات آسان ہوتی ہیں اور انعامات الٰہیہ نصیب ہوتے ہیں۔

(۶۳) خوفِ الٰہی کی ہدایت اور ذکرِ نعمتِ الٰہی کا حکم۔

ف۔ ایفاء کی دو جہتیں ہیں اور مراتب وفا کثیر ہیں ہر درجہ ہیں ایک وفا بطور شرط و عمل ہماری طرف سے ہے اس پر ایک وفا بطور صلہ و جزاء باری تعالیٰ کی طرف سے۔

تم اپنا عہدِ ایمان وفا کرو میں تمہیں منزلِ صفا عطا کروں گا تم عہدِ طاعت وفا کرو میں تمہیں منزلِ رعایت عطا کروں گا۔ تم عہدِ توکل وفا کرو میں تمہیں منزلِ کفایت عطا کروں گا۔ تم عہدِ محبت وفا کرو میں تمہیں منزلِ قربت عطا کروں گا۔ تم استعداد معرفت کیمطابق مجاہدہ کرو میں تمہیں خزائنِ غیب کا مشاہدہ عطا کروں گا۔ الغرض تم مراحلِ فنا سے گزرو میں تمہیں منازلِ بقا عطا کروں گا۔

حاشیہ نمبر ۲۹ "بنی اسرائیل سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے وعدہ پر جنت کا وعدہ کیا گیا" صفحہ نمبر ۲۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون
۴۱	۶۴

ایمان بالقرآن کا حکم۔

(۶۵) آیاتِ الٰہی کے عوض دُنیا کمانے کی ممانعت۔

حاشیہ نمبر ۳۰ "یہود کی کمالات محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے انکار پر سرزنش" صفحہ نمبر ۲۸۳ پر ملاحظہ فرمائیں

آیت	مضمون
۴۲	۶۶

التباسِ حق و باطل اور کتمانِ حق کی ممانعت۔

یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق شانِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق اور اسے چھپانے کو کتمانِ حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تفصیل کیلئے حاشیہ نمبر ۳۱ صفحہ نمبر ۲۸۴ ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون
۴۳	۶۷

حکمِ صلوٰۃ۔

(۶۸) حکمِ زکوٰۃ۔

(۶۹) نماز با جماعت کی تلقین۔

آیت	مضمون
۴۴	۷۰

۱- اپنی اصلاح کے بغیر دوسروں کو تبلیغ پر تنبیہہ۔

۲- عالم بے عمل کی مذمت۔

عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا

مَیں نے تمہیں (اس زمانے میں) سب لوگوں پر فضیلت دی - اور اُس دن سے ڈرو

لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

جس دن کوئی جان کسی دوسرے کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے سکے گی اور نہ اسکی طرف سے (کسی ایسے شخص کی)

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

کوئی سفارش قبول کی جائیگی (جسے اذنِ الٰہی حاصل نہ ہوگا) اور نہ اسکی طرف سے (جان چھڑانے کیلئے) کوئی معاوضہ قبول کیاجائیگا اور نہ (امرِ الٰہی

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

کے خلاف) ان کی امداد کی جاسکے گی- اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تمہیں قوم فرعون سے نجات بخشی جو تمہیں

الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ

انتہائی سخت عذاب دیتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے،

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا

اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (کڑی) آزمائش تھی - اور جب ہم نے تمہیں (بچانے

بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ

کے) لئے دریا کو پھاڑ دیا سو ہم نے تمہیں (اس طرح) نجات عطا کی اور (دوسری طرف) ہم نے تمہاری آنکھوں

اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً

کے سامنے قوم فرعون کو غرق کردیا - اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ

تھا پھر تم نے موسیٰ (کے چلّہ اعتکاف میں جانے) کے بعد بچھڑے کو (اپنا) معبود بنا لیا اور تم واقعی بڑے ظالم تھے - پھر

عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ

ہم نے اسکے بعد (بھی) تمہیں معاف کردیا تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ - اور جب

مضمون ۷۱	آیت ۴۵

مشکلات میں صبر و صلوٰۃ کے ذریعے استعانت۔

ف۔ ا۔ صبر سے مقامات میں مدد ملتی ہے اور نماز سے مشاہدات ہیں۔
۲۔ صبر تزکیہ کے لیے بڑا مؤثر ہے اور نماز تجلیہ کے لیے۔
۳۔ صبر مضعفِ نفس ہے اور نماز مقوی رُوح۔
۴۔ بعض صوفیہ فرماتے ہیں کہ صبر میں غیر اللہ کا ترک ہے اور نماز میں اللہ تعالیٰ کی معیت۔ سو صبر سبیلِ فنا ہے اور نماز سبیلِ بقاء۔

(۷۲) خشوع اور عاجزی کی فضیلت۔

مضمون ۷۳	آیت ۴۶

خاشعین رب سے ملاقات کا یقین رکھنے والے ہیں۔

ف۔ رجوع الی اللہ اور لقاءِ الٰہی کے قلبی تصور اور استحضار سے خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے۔ تصوف میں تصورِ حضوری اور مراقبہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔

مضمون ۷۴	آیت ۴۷

بنی اسرائیل کو انعاماتِ خداوندی کی مکرر یاد دہانی۔

مضمون ۷۵	آیت ۴۸

قیامت کی ہولناکی اور اس دن کسی کا بغیر اذنِ الٰہی کام نہ آنے کا بیان۔

مضمون ۷۶	آیت ۴۹

ا۔ مظالمِ فرعون سے بنی اسرائیل کی نجات دہی۔
۲۔ بنی اسرائیل کا سخت آزمائش سے گزرنا۔

مضمون ۷۷	آیت ۵۰

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کی غرقابی و ہلاکت۔

مضمون ۷۸	آیت ۵۱

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چالیس روزہ اعتکاف۔

ف۔ یہ آیت تصوف میں چلہ کشی کے ثبوت پر نص ہے اس میں خلوت نشینی اور رات کی عبادت کی فضیلت

اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں فرق کرنے والا (معجزہ) عطا کیا تاکہ تم راہِ ہدایت پاؤ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم! بیشک تم نے بچھڑے کو (اپنا معبود) بنا کر اپنی جانوں پر (بڑا) ظلم کیا ہے

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

تو اب اپنے پیدا فرمانے والے (حقیقی رب) کے حضور توبہ کرو پس (آپس میں) ایک دوسرے کو قتل کر ڈالو (اس طرح کہ جنہوں نے بچھڑے کی پرستش نہیں

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ

کی اور اپنے دین پر قائم رہے ہیں وہ بچھڑے کی پرستش کر کے دین سے پھر جانیوالوں کو سزا کے طور پر قتل کر دیں)، یہی (عمل) تمہارے لئے تمہارے

هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ

خالق کے نزدیک بہترین (توبہ) ہے، پھر اس نے تمہاری توبہ قبول فرمالی، یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور جب تم نے کہا

نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

اے موسیٰ! ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو (آنکھوں کے سامنے) بالکل آشکارا دیکھ لیں پس (اس پر)

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ

تمہیں کڑک نے آلیا (جو تمہاری موت کا باعث بن گئی) اور تم (خود یہ منظر) دیکھتے رہے۔ پھر ہم نے تمہارے مرنے کے بعد

بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ

تمہیں (دوبارہ) زندہ کیا تاکہ تم (ہمارا) شکر ادا کرو۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے تم پر (وادیٔ

الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا

تیہ میں) بادل کا سایہ کئے رکھا اور ہم نے تم پر مَنّ و سلویٰ اتارا کہ تم ہماری عطا کی ہوئی

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ

پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ، سو انہوں نے (نافرمانی اور ناشکری کر کے) ہمارا کچھ نہیں بگاڑا مگر

کا اشارہ بھی ہے جب قرآن مجید میں ایک برگزیدہ رسول کی سُنّت یا حکمِ الٰہی کا ذکر ہو اور بعد میں اس کی نفی یا منسوخی مذکور نہ ہو تو وہ حکم اُمّتِ مسلمہ کے لیے بھی باقی رہتا ہے بلکہ حکمِ قرآنی تصوّر ہوتا ہے۔

۲- بنی اسرائیل کی بچھڑا پرستی۔

ف - بچھڑا سامری کے کرشمۂ جادو سے بولتا تھا۔ اس لیے بنی اسرائیل نے اس کو معبود بنا لیا۔ معلوم ہوا کہ شیطانی استدراج کو کرامت نہ سمجھنا چاہیئے۔ کسی کے خوارق اور کرامات کو دیکھ کر بھی ترکِ توحید (شرک) کی اجازت نہیں۔ بعض جہال مشائخ میں حلول کا عقیدہ رکھتے اور ان کے لیے جوازِ سجدہ نکالتے ہیں۔ یہ سراسر کفر و شرک ہے۔ اس کی تصوّف میں کوئی گنجائش نہیں۔ بعض لوگ سجدۂ آدم سے استدلالِ جواز کرتے ہیں۔ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کے لیئے سجدہ۔ سجدۂ تعظیمی تھا جو پہلی اُمتوں میں جائز رہا مگر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمّت کے لیے اسے بھی حرام قرار دے دیا۔

آیت ۵۲	مضمون ۷۹	بچھڑا پرستی کے جُرم کی مُعافی اور تلقینِ شُکر مندی۔

آیت ۵۳	مضمون ۸۰	۱- حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کو کتاب (تورات) کا عطا کیا جانا۔

۲- آسمانی کتاب کے عطا ہونے کا مقصد ہدایت کی فراہمی ہے۔

آیت ۵۴	مضمون ۸۱	بچھڑا پرستی کے جُرم پر توبہ اور قتلِ نفس کا حکم۔

ف - توبہ منازلِ صدق و قبولیت میں پہلا قدم ہے۔ مجاہدتِ نفس کے باب میں قتلِ نفس سے مُراد ترکِ شہوات اور قطعِ لذّات ہے اس کے بغیر توجہ الی اللہ تام نہیں ہوتی۔

(۸۲) سزا میں اَمرِ خیر کا پہلو اور قبولیّتِ توبہ۔

(۸۳) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت۔

آیت ۵۵	مضمون ۸۴	بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کو سَر کی آنکھوں سے دیکھنے کا مُطالبہ۔

(۸۵) یہ شرطیہ مُطالبہ بارگاہِ نبوّت میں اہانت اور گستاخی تھی۔

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا

اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے ۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے فرمایا اس

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

شہر میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب جی بھر کے کھاؤ اور (یہ کہ)

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہتے جانا (اے ہمارے رب! ہم سب خطاؤں کی)

خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

بخشش چاہتے ہیں (تو) ہم تمہاری (گزشتہ) خطائیں معاف فرما دیں گے اور (علاوہ اس کے) نیکوکاروں کو مزید (لطف و کرم سے)

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

نوازیں گے ۔ پھر (ان) ظالموں نے اس قول کو جو اُن سے کہا گیا تھا ایک اور کلمہ سے بدل ڈالا سو ہم نے (ان)

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا

ظالموں پر آسمان سے (بصورتِ طاعون) سخت آفت اتار دی اس وجہ سے کہ وہ (مسلسل) حکم عدولی

يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا ع ۱۳ ٦

کر رہے تھے ۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسٰی نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا

اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

اپنا عصا اس پتھر پر مارو، پھر اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ

عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا

پڑے، واقعۃً ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا، (ہم نے فرمایا) اللہ کے

وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ

(عطا کردہ) رزق میں سے کھاؤ اور پیو لیکن زمین میں فساد انگیزی نہ

(۸۶) گستاخیٔ رسالت پر اجتماعی موت کی سزا۔

آیت	مضمون	
۵۶	۸۷	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا پر سب کا دوبارہ زندہ کردیا جانا۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر سابقہ امم کے حوالے سے لوگوں کے انفرادی یا اجتماعی طور پر مرنے کے بعد پھر جی اُٹھنے کا ذکر آیا ہے مگر ہر جگہ دوبارہ زندگی انبیاء و مقربین الٰہی کی دُعا والتجا سے ہی ملتی ہے۔ یہ قرآنی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و مقربین کی دُعا سے مردے زندہ ہوتے رہے ہیں اور یہ حق ہے۔

آیت	مضمون	
۵۷	۸۸	۱- بنی اسرائیل پر بادلوں کے سائے کا انعام۔

۲- منّ و سلویٰ کا نزول۔

من سے مُراد ترنجبین اور سلویٰ سے مُراد بٹیر کی طرح چھوٹا سا پرندہ ہے۔ یہ سب انعامات دریائے نیل عبور کرنے کے بعد شام کے راستے میں وادیٔ تیہ میں کیے گئے۔

۳- ان تمام انعاماتِ الٰہیہ کے باوجود بنی اسرائیل کی نافرمانی۔

ف۔ بعض اوقات نافرمانوں اور فاسقوں پر ان کی نافرمانی اور فسق کے باوجود ظاہری وسعتوں اور دُنیوی نعمتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس میں استدراج کا ثبوت ہے کچھ لوگ غلطی سے دُنیوی انعامات اور خوارق کو کرامات اور علامات مقبولیت سمجھتے ہیں۔

آیت	مضمون	
۵۸	۸۹	بنی اسرائیل کو شہرِ بیت المقدّس میں داخلے کا حکم۔

(۹۰) نعمتوں کے اِستعمال کی اجازت

(۹۱) حضورِ الٰہی میں سجدہ ریزی عاجزی اور استغفار کی تلقین۔

اسلام میں بوقتِ فتح الٰہی آداب کا لحاظ ضروری ہے۔

(۹۲) احکامِ الٰہی کی بجا آوری کا صلہ۔

مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى

کرتے پھرو ۔ اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم فقط ایک کھانے (یعنی من وسلویٰ) پر ہرگز صبر

طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ

نہیں کرسکتے تو آپ اپنے رب سے (ہمارے حق میں) دُعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے زمین سے

الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا

اُگنے والی چیزوں میں سے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز پیدا کردے،

وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ

(موسیٰ نے اپنی قوم سے) فرمایا، کیا تم اس چیز کو جو ادنیٰ ہے بہتر چیز کے بدلے

هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ

مانگتے ہو؟ ، (اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو) کسی بھی شہر میں جا اُترو یقیناً (وہاں) تمہارے لئے وہ کچھ (میسر) ہوگا

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

جو تم مانگتے ہو، اور اُن پر ذِلّت اور محتاجی مسلط کردی گئی، اور وہ اللہ کے غضب میں

مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

لوٹ گئے، یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا

کرتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، اور یہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ وہ

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ ع

نافرمانی کیا کرتے اور (ہمیشہ) حد سے بڑھ جاتے تھے۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے

هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ

اور (جو) نصاریٰ اور صابی (تھے ان میں سے) جو (بھی) اللہ پر اور آخرت کے دن پر

مضمون ۹۳	آیت ۵۹

بنی اسرائیل کی حکم عدولی اور احکامِ الٰہی کا استہزاء

(۹۴) نافرمانی پر دوبارہ بلاءِ آسمانی کا نزول۔

مضمون ۹۵	آیت ۶۰

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعے پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹنا۔

(۹۶) ہر قبیلے کو اپنے رزق کے لیے الگ الگ گھاٹ کا عطا کیا جانا۔

ف۔ مختلف ارواح کے لیے معارفِ الٰہیہ کے جُدا جُدا مشارب ہیں جہاں سے وہ اپنا اپنا حصّہ لیتی ہیں۔ عارف روحوں کو ان کی پہچان عطا کی جاتی ہے۔ کسی کا مشرب مقامِ حیرت ہے کسی کا مقامِ وصال کسی کا مقامِ فنا ہے کسی کا مقامِ بقاء کسی کا مقامِ جلال ہے۔ کسی کا مقامِ جمال کسی کا عالَمِ ملکوت ہے۔ کسی کا عالَمِ جبروت۔ ہر رُوح کو اس کی پیاس اور نوعیتِ ذوق کے مطابق شرابِ طہور اور شرابِ معرفت پلائی جاتی ہے۔

(۹۷) صرف اپنا اپنا حق لینے کی ہدایت اور استحصال و فساد انگیزی کی ممانعت۔

(۹۸) بنی اسرائیل کے لیے اسبابِ معیشت کی فراوانی۔

مضمون ۹۹	آیت ۶۱

بنی اسرائیل کا کُفرانِ نعمت۔

(۱۰۰) بنی اسرائیل کا اعلیٰ کی بجائے ادنیٰ کا مُطالبہ۔

(۱۰۱) بنی اسرائیل کا مُطالبہ پُورا کیا جانا۔

(۱۰۲) اِس سرکشی پر بطورِ سزا ذِلّت و مسکنت کا مسلّط کیا جانا۔

(۱۰۳) بنی اسرائیل کے انکارِ حق اور قتلِ انبیاء پر غضبِ الٰہی۔

ف۔ ۱۔ قضا پر ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے۔ نعمت پر شُکر اور بلا پر صبر ہی اطاعت گزاروں کا شیوہ ہے۔

۲۔ معصیت کے نتیجے میں طاعات و عبادات کی روحانی لذت باقی نہیں رہتی۔

۳۔ باری تعالیٰ بندے کے ساتھ جیسا معاملہ فرما رہا ہو سالک کو اسی پر قانع اور راضی رہنا چاہیئے۔ اسے بدلنے کی آرزو باری تعالیٰ کی ناخوشی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً بندہ صاحبِ توکل ہو تو کسب پر تکیہ نہ کرے اور صاحبِ کسب ہو تو ترک

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کیے، تو اُن کے لئے اُن کے رب کے ہاں

رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ وَ

اُن کا اجر ہے، اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے ۔ اور

اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا

(یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور تمہارے اُوپر طور کو اٹھا کھڑا کیا، کہ جو کچھ ہم نے

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ

تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑے رہو اور جو کچھ اس (کتاب تورات) میں (لکھا) ہے اسے یاد رکھو

تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ

تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۔ پھر اس (عہد اور تنبیہ) کے بعد بھی تم نے رُوگردانی کی، پس اگر تم پر اللہ کا

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ

فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً تباہ ہو جاتے ۔ اور (اے یہود!) تم یقیناً

عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا

ان لوگوں سے خوب واقف ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن (کے احکام کے بارے میں) سرکشی کی تھی تو

لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا

ہم نے اُن سے فرمایا کہ تم دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ ۔ پس ہم نے اس (واقعہ) کو اس زمانے

بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَ

اور اس کے بعد والے لوگوں کے لئے (باعثِ) عبرت اور پرہیزگاروں کے لئے (موجبِ) نصیحت بنا دیا ۔ اور

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ

(وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسٰی (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ

اسباب نہ کرے۔

۴۔ سالک کو اعلیٰ نعمتوں سے نوازا جا رہا ہو تو ادنیٰ کی خواہش نہ کرے۔ قربتِ الٰہی کی لذت میسر ہو تو شہوتِ نفسانی کی طرف رغبت نہ کرے یہ ناشکری متصور ہوگی۔ اس کے نتیجے میں اس پر روحانی ذلّت و مسکنت مسلط کردی جائے گی جس میں حبِّ الٰہی کا لباس اتار کر اس کے دل کو حبِّ دنیا کا لباس پہنا دیا جائے گا اور رضا کا لباس اتار کر حرص کا لباس پہنا دیا جائے گا۔

۵۔ لہٰذا بظاہر کسی چھوٹے گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھا جائے وہی بڑے گناہوں کا باعث بنتا ہے۔ نافرمانی اور حدِ اطاعت سے تجاوز کرنا پہلے بعد دیگرے کئی گناہوں کا باعث بنتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ صغائر سے چل کر کبائر تک نوبت آجاتی ہے۔

آیت ۶۲	مضمون ۱۰۴	اہلِ ایمان کے حق میں بشارت۔

ایمان لانے کے بعد پچھلی حالت کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ خواہ کوئی پہلے یہودی تھا، نصرانی تھا یا صابی اگر وہ اب ایمان کی شرائط پوری کرے تو اس میں اور دیگر مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جائے گا۔ سب کے لیے مغفرت اور آخرت کی بشارت یکساں ہوگی۔

آیت ۶۳	مضمون ۱۰۵	بنی اسرائیل کو خوف دلانا اور ان کا عذابِ الٰہی دیکھ کر عہد کرنا۔

آیت ۶۴	مضمون ۱۰۶	عہدِ الٰہی کی خلاف ورزی۔ اس کے باوجود رحمتِ الٰہی کی دستگیری کا ایک اور موقع۔

آیت ۶۵	مضمون ۱۰۷	۱۔ اصحابِ سبت کا انجام۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل سے گریز اور اس کی تضحیک غضبِ الٰہی کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ نافرمانوں کو ذلیل بندر بنا دیا گیا۔

ف ۔ تصوّف میں بعض وظائف و عبادات کو اسی اُصولِ آیت کے مطابق خاص اوقات، خاص ایام اور خاص آداب و شرائط کے ساتھ مقرر کیا جاتا ہے اگر ان کی رعایت نہ کی جائے یا ان شرائط کو ہلکا سمجھا جائے تو ان کی خاص تاثیرات و برکات زائل ہوجاتی ہیں اور کبھی خسارا بھی ہوتا ہے نتیجۃً بعض اوقات ان آداب کی مخالفت سے ذوق اور استعداد میں بھی منفی تبدیلی رونما ہوجاتی ہے

تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ

ایک گائے ذبح کرو، (تو) وہ بولے کیا آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں؟، موسیٰ نے فرمایا اللہ

بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

کی پناہ مانگتا ہوں (اس سے) کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں - (تب) انہوں نے کہا آپ ہمارے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

لئے اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ (وہ) گائے کیسی ہو؟، (موسیٰ نے) کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ وہ

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا

گائے نہ تو بوڑھی ہو اور نہ بالکل کم عمر (اوسر)، بلکہ درمیانی عمر کی (جوان) ہو، پس اب تعمیل کرو جس کا

مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا

تمہیں حکم دیا گیا ہے - وہ (پھر) بولے اپنے رب سے ہمارے حق میں دعا کریں وہ ہمارے لئے واضح کر دے کہ

لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ

اُس کا رنگ کیسا ہو؟، (موسیٰ نے) کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہو، اس کی رنگت خوب گہری ہو

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ

(ایسی جاذب نظر ہو کر) دیکھنے والوں کو بہت بھلی لگے - (اب) انہوں نے کہا آپ ہمارے لئے اپنے

يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ

رب سے درخواست کیجیئے کہ وہ ہم پر واضح فرما دے کہ وہ کونسی گائے ہے؟، (کیونکہ) ہم پر گائے مشتبہ ہو گئی ہے اور یقیناً اگر

اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا

اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت یافتہ ہو جائیں گے - (موسیٰ نے کہا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وہ کوئی گھٹیا گائے

بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

نہیں بلکہ) یقینی طور پر ایسی (اعلیٰ) گائے ہو جس سے نہ زمین میں ہل چلانے کی محنت لی جاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو،

آیت	مضمون	
٦٦	١٠٨	**عذاب کی دو حکمتیں۔**

۱۔ نافرمانی کا رجحان رکھنے والوں کے لیے عبرت۔
۲۔ خوفِ خدا رکھنے والوں کے لیے نصیحت۔

آیت	مضمون	
٦٧	١٠٩	۱۔ بنی اسرائیل کو تفتیشِ قاتل کے سلسلے میں گائے ذبح کرنے کا حکم۔

۲۔ قوم کا حکمِ الٰہی پر غیر مناسب استعجاب۔
۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعوّذ۔
۴۔ امرِ الٰہی کے نام پر مذاق جاہلوں کا شیوہ ہے۔

آیت	مضمون	
٦٨	١١٠	گائے کی تحقیق و تعیین میں قوم کا پہلا سوال اور اس کا الہامی جواب۔

آیت	مضمون	
٦٩	١١١	دوسرا سوال اور اس کا الہامی جواب۔

ف ۔ صوفیہ نے نفسِ امّارہ کو اس گائے سے تشبیہ دی ہے کیونکہ نفس کا نور بھی تیز زرد رنگ کا (اصفر اللون) بتایا جاتا ہے۔

آیت	مضمون	
٧٠	١١٢	تیسرا سوال۔

آیت	مضمون	
٧١	١١٣	۱۔ تیسرے سوال کا جواب۔

۲۔ کثرتِ سوالات اور کج بحثی سے انسان خود کو مشکل میں ڈال لیتا ہے۔
۳۔ بنی اسرائیل کا بادلِ ناخواستہ حکمِ الٰہی پر عمل کرنا۔

ف ۔ یہاں نفسِ امّارہ کی چار علامات کی طرف اشارہ ہے لا ذلول ۔ وہ عبادت و طاعتِ الٰہی میں محنت نہیں کرتا۔

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ

بالکل تندرست ہو اس میں کوئی داغ دھبہ بھی نہ ہو، انہوں نے کہا اب آپ ٹھیک بات لائے (ہیں)،

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا ٨ ع ٨

پھر انہوں نے اس کو ذبح کیا حالانکہ وہ ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے ۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا

فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۚ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾

پھر تم آپس میں اس (کے الزام) میں جھگڑنے لگے اور اللہ (وہ بات) ظاہر فرمانے والا تھا جسے تم چھپا رہے تھے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ

پھر ہم نے حکم دیا کہ اس (مُردہ) پر اس (گائے) کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ فرماتا ہے (یا قیامت کے دن

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ قَسَتْ

مُردوں کو زندہ کریگا) اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل و شعور سے کام لو۔ پھر اس کے بعد (بھی) تمہارے

قُلُوبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ

دل سخت ہوگئے چنانچہ وہ (سختی میں) پتھروں جیسے (ہوگئے) ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت (ہو چکے ہیں)،

اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ

(اس لئے کہ بیشک پتھروں میں (تو) بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں،

مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ

اور یقیناً ان میں سے بعض وہ (پتھر) بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی اُبل پڑتا ہے

الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَ

اور بیشک ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں، (افسوس! تمہارے دلوں میں اسقدر نرمی، خستگی اور شکستگی بھی

مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ

نہیں رہی) اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ (اے مسلمانو!) کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ

یعنی عبودیت میں مذلّل نہیں ہوتا۔ تثیر الارض ۔ دل کی زمین کو نہیں جوتتا، نہ اس میں ذوق کا بیج ڈالتا ہے نہ اسے محبتِ الٰہی کے لیے تیار کرتا ہے۔ ولا تسقی الحرث ۔ اور نہ ہی معرفتِ الٰہی کی کھیتی کو ذکر کے پانی سے سیراب کرتا ہے۔ مسلّمۃ لا شیۃ فیھا ۔ وہ ریاضت و مجاہدہ کی آگ سے محفوظ اور تواضع و محبت کی خشکی سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ان روحانی مجاہدات میں روندا ہوا نہیں ہوتا۔ اس لیے اکڑتا اور نافرمانی و سرکشی کرتا ہے۔

آیت	مضمون	
٧٢	١١٤	ا۔ واقعۂ قتل کا بیان۔

٢۔ بعض اوقات انسان اپنا جرم مختلف حیلوں اور حربوں سے چھپاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اُسے کسی حکمت کے پیش نظر ظاہر فرما دیتا ہے۔

آیت	مضمون	
٧٣	١١٥	ا۔ اعجازِ موسوی۔

٢۔ ذبح شدہ گائے کے ٹکڑے کے مَس سے مُردے کا زندہ ہو جانا۔

٣۔ آثارِ قدرت سے صاحبِ قدرت کی معرفت حاصل کی جائے۔

ف ۔ اگر نفسِ امارہ کو ریاضات و مجاہدات اور ترکِ لذات و شہوات کی تلوار سے مارا جائے تو اس کی موت مُردہ روح کے زندہ ہو جانے کا باعث ہوتی ہے۔

آیت	مضمون	
٧٤	١١٦	یہود کی سخت دلی اور اس کی مثال۔

(١١٧) ا۔ بعض پتھروں سے خشیتِ الٰہی کے باعث نہریں پھوٹ پڑتی ہیں۔

٢۔ بعض پتھر خشیتِ الٰہی سے پھٹ جاتے ہیں اور ان سے چشموں کی صورت میں پانی اُبلنے لگتا ہے۔

٣۔ بعض پتھر خوفِ الٰہی سے گر پڑتے ہیں۔

٤۔ پتھروں کو بھی خوفِ الٰہی، خشیتِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کی کیفیات عطا ہوتی ہیں

يُؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ

وُہ (یہودی) تم پر یقین کرلیں گے جبکہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے (بھی) تھے کہ اللہ کا کلام (تورات)

اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ

سُنتے پھر اسے سمجھنے کے بعد (خود) بدل دیتے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے (کہ حقیقت کیا ہے اور

يَعْلَمُوْنَ ۝٧٥ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ

وہ کیا کر رہے ہیں)۔ اور (ان کا حال تو یہ ہوچکا ہے کہ) جب اہلِ ایمان سے ملتے ہیں (تو) کہتے ہیں ہم (بھی)

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ

تمہاری طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر) ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں (تو) کہتے

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

ہیں کیا تم ان (مسلمانوں) سے (نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت اور شان کے بارے میں) وُہ باتیں بیان کر دیتے ہو جو اللہ نے تم پر

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٧٦ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

(تورات کے ذریعے) ظاہر کی ہیں تاکہ اس سے وہ تمہارے رب کے حضور تمہیں پر حجت قائم کریں، کیا تم (اتنی) عقل (بھی) نہیں رکھتے؟ - کیا وہ نہیں

مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝٧٧ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا

جانتے کہ اللہ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں - اور ان (یہود) میں سے (بعض) ان پڑھ (بھی) ہیں جنہیں

يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝٧٨ النصف

(سوائے سُنی سنائی جھوٹی اُمیدوں کے) کتاب (کے معنی و مفہوم) کا کوئی علم ہی نہیں وہ (کتاب کو) صرف زبانی پڑھنا جانتے ہیں یہ لوگ محض وہم

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ

وگمان میں پڑے رہتے ہیں - پس ایسے لوگوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنے ہی ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا

کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑے سے دام کمالیں، سو ان کیلئے

۵۔ کئی انسان اپنی قلبی حالت میں پتھروں سے بھی کمتر ہوتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ ان سب حالتوں سے باخبر رہتا ہے مگر انسان اپنے حال کی طرف دھیان نہیں کرتا۔

ف۔ جمادات کو بھی اپنے حسبِ حال ذکر و طاعتِ الٰہی کے لیے خاص قسم کا شعور دیا جاتا ہے۔

آیت	مضمون
۷۵	۱۱۸

یہود کا قلبی عناد اور کلامِ الٰہی کی تحریف۔

آیت	مضمون
۷۶	۱۱۹

یہود کا قلبی نفاق۔

(۱۲۰) یہودی ذہنیت ۔ کلامِ الٰہی میں شانِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیان کو چھپانا ہے۔

شانِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عمداً چھپانا تورات میں یہودی تحریف کی پہلی قسم تھی۔ تورات میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے بارے میں واضح بشارات موجود تھیں جنہیں یہود خود پڑھتے جانتے اور ایک دوسرے کو سناتے رہتے تھے مگر بعثتِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بنی اسماعیل میں ہونے کے باعث ان بشارات کو مسلمانوں سے چھپانے لگے اور حذف بھی کرنے لگے تاکہ کہیں مسلمانوں کو وہ بشارات معلوم نہ ہو جائیں۔ (اس سے متعلق حاشیہ نمبر ۲۲ صفحہ نمبر ۲۸۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون
۷۷	۱۲۱

یہود کو علمِ الٰہی کے حوالے سے تنبیہ۔

آیت	مضمون
۷۸	۱۲۲

یہود کے دوسرے گروہ کا حال۔

وہ کتابِ الٰہی سے بے خبری کی بنا پر من گھڑت امیدوں اور بے بنیاد آرزوؤں پر عقائد و خیالات استوار کرتے ہیں۔

آیت	مضمون
۷۹	۱۲۳

یہودی تحریف کی دوسری قسم۔

۱۔ خود ساختہ کلام، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دینا۔

۲۔ یہودیوں کا تورات میں حق کو چھپانے یا بدلنے کے لیے اپنی طرف سے اضافہ کر دینا۔

قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ

اس (کتاب کی وجہ) سے ہلاکت ہے جو ان کے ہاتھوں نے تحریر کی اور اس (معاوضہ کی وجہ) سے

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا

تباہی ہے جو وہ کما رہے ہیں - اور وہ (یہود) یہ (بھی) کہتے ہیں کہ ہمیں (دوزخ کی) آگ ہرگز نہیں چھوئے گی

مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

سوائے گنتی کے چند دنوں کے، (ذرا) آپ (ان سے) پوچھیں کیا تم اللہ سے کوئی (ایسا) وعدہ لے چکے ہو؟ پھر تو وہ

يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا

اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہ کرے گا یا تم اللہ پر یونہی (وہ) بہتان باندھتے ہو جو تم خود بھی

تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ

نہیں جانتے - ہاں واقعی جس نے برائی اختیار کی اور اس کے گناہوں نے اس کو

بِهٖ خَطِيْۤـــَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

ہر طرف سے گھیر لیا تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے

خٰلِدُوْنَ ۝۸۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ

والے ہیں - اور جو لوگ ایمان لائے اور (انہوں نے) نیک عمل کئے تو وہی لوگ

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۲ ۧ وَاِذْ اَخَذْنَا

جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں - اور (یاد کرو) جب ہم نے

مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَ

اولادِ یعقوب سے پختہ وعدہ لیا کہ اللہ کے سوا (کسی اور کی) عبادت نہ کرنا، اور

بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں

(١٢٤) یہودیوں کا موضوع کلام اور من گھڑت مضامین پر دُنیا کمانا۔

(١٢٥) کذب علی اللہ کے عمل پر یہودیوں کی ہلاکت۔

آیت	مضمون	
٨٠	١٢٦	یہودیوں کا اپنے جنّتی ہونے کی نسبت خود ساختہ عقیدہ اور اس کا رد۔

آیت	مضمون	
٨١	١٢٧	کثرتِ گناہ احاطۂ گناہ کا سبب بنتے ہیں۔

ف۔ گناہوں کی کثرت سے قلب باطن پر زنگ اور سیاہی کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ نیکی کا اثر بھی نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ بالآخر یہی حالت قلبی شقاوت تک جا پہنچتی ہے۔

آیت	مضمون	
٨٢	١٢٨	اہلِ ایمان اور نیک کاروں کو اُخروی بشارت۔

اسلامی نظامِ حیات کے (١٠) نکات۔

آیت	مضمون	
٨٣	١٢٩	بنی اسرائیل کا پہلا معاہدۂ عمل۔

١ —— (١٣٠) عبادتِ الٰہی اور ترکِ شرک۔

٢ —— (١٣١) والدین سے حُسنِ سلوک۔

٣ —— (١٣٢) رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک۔

٤ —— (١٣٣) یتیموں سے حُسنِ سلوک۔

٥ —— (١٣٤) بے سہارا اور غریب لوگوں سے حُسنِ سلوک۔

٦ —— (١٣٥) لوگوں سے خوش اخلاقی سے گفتگو۔

٧ —— (١٣٦) اِقامتِ صلوٰۃ

الْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

کے ساتھ بھی (بھلائی کرنا) اور عام لوگوں سے (بھی نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ) نیکی کی بات کہنا اور نماز قائم رکھنا

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ

اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم میں سے چند لوگوں کے سوا سارے (اس عہد سے) رُوگرداں ہوگئے اور تم

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ

(حق سے) گریز ہی کرنے والے ہو ۔ اور جب ہم نے تم سے (یہ) پختہ عہد (بھی) لیا کہ تم (آپس میں) ایک دوسرے کا

دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ

خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو (اپنے گھروں اور بستیوں سے نکال کر) جلا وطن کرو گے پھر تم نے

اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

(اس امر کا) اقرار کرلیا اور تم (اس کی) گواہی (بھی) دیتے ہو ۔ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کر رہے ہو

اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز

اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُن کے وطن سے باہر نکال رہے ہو اور (مستزاد یہ کہ)

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ

ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کے ساتھ (ان کے دشمنوں کی) مدد بھی کرتے ہو، اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے

اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ

پاس آجائیں تو اُن کا فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو (تاکہ وہ تمہارے احسانمند رہیں) حالانکہ ان کا وطن سے نکالا جانا بھی تم پر حرام کر دیا گیا تھا،

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا

کیا تم کتاب کے بعض حصوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو

جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ

شخص ایسا کرے اس کی کیا سزا ہوسکتی ہے سوائے اس کے کہ دنیا کی زندگی میں ذلّت (اور رُسوائی)

۸ —— (۱۳۷) ایتاءِ زکوٰۃ۔

آیت	مضمون
۸۴	۱۳۸

دوسرا معاھدہ قیامِ امن۔

۹ —— (۱۳۹) خون ریزی نہ کرنا۔

۱۰ —— (۱۴۰) لوگوں کو جلاوطن نہ کرنا۔

مذکورہ بالا دو آیات میں دو معاہدات کا حکم ہے "معاہدۂ عمل اور معاہدۂ امن" ان دونوں معاہدات میں مجموعی طور پر دس ہدایات دی گئی ہیں۔ جو زندگی کے انفرادی و اجتماعی، عائلی و سماجی، معاشی و معاشرتی، مذہبی و سیاسی اور قومی و بین الاقوامی تمام سارے پہلوؤں اور دائروں کو حاوی ہیں۔ اگر ان پر سختی سے عمل درآمد ہو تو یہی اسلامی نظامِ حیات ہے جسے بپا کرنے کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس قدر بنی اسرائیل پر عائد کی گئی تھی۔ انہوں نے نافرمانی کی وہ تباہ و برباد ہوئے اور ہم ان سے بڑھ کر نافرمانی کر رہے ہیں۔

الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

ہو، اور قیامت کے دن (بھی) ایسے لوگ) سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

کے بدلے میں دنیا کی زندگی خرید لی ہے، پس نہ اُن پر سے عذاب ہلکا کیا

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى

جائے گا اور نہ ہی ان کو مدد دی جائے گی۔ اور بے شک ہم نے مُوسٰی کو کتاب (توراۃ) عطا کی

الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى

اور ان کے بعد ہم نے پے در پے (بہت سے) پیغمبر بھیجے، اور ہم نے مریم کے فرزند

ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا

عیسٰی کو (بھی) روشن نشانیاں عطا کیں اور ہم نے پاک روح کے ذریعے ان کی تائید (اور مدد) کی تو کیا (ہوا)

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس وہ (احکام) لایا جنہیں تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم (وہیں) اکڑ گئے،

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا

اور بعضوں کو تم نے جھٹلایا اور بعضوں کو تم قتل کرنے لگے۔ اور یہودیوں نے کہا ہمارے

غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

دلوں پر غلاف ہیں، (ایسا نہیں) بلکہ ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے سو وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) آئی جو اس کتاب (توراۃ) کی (اصلاً) تصدیق کرنے والی ہے

آیت	مضمون
۸۵	۱۴۱

عہد شکنی اور برادرانِ وطن پر مظالم۔

(۱۴۲) ان مظالم پر دُنیا میں ذلّت ناک سزا اور آخرت میں بھی شدید عذاب۔

معلوم ہوا کہ اسلامی نظام کو ترک کرنے سے قوموں پر دُنیا میں بھی ذلّت آتی ہے۔

ف ۔ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ (الآیہ) میں مشائخ اور مُریدین کے تعلق میں تربیتِ سلوک کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی گناہوں میں اسیر ہو تو توبہ کے ذریعے گناہوں کی قید سے آزادی ملے گی، اگر کوئی اسبابِ دنیا میں اسیر ہو تو اسے قطعِ علائق کے ذریعے رُوحانی آزادی ملے گی، اگر کوئی صفاتِ نفس میں اسیر ہو تو اسے صفاتِ حق کے ذریعے حُریّت ملے گی اور اگر کوئی عوارضِ بشریات میں اسیر ہو تو اسے لطائفِ ازلیات کے ذریعے آزادی ملے گی۔

آیت	مضمون
۸۶	۱۴۳

آخرت کے عوض دُنیا خریدنے والوں کے لئے ناقابلِ معافی عذاب

آیت	مضمون
۸۷	۱۴۴

حضرت مُوسٰی علیہ السلام اور انبیاءِ سابقین کی حقّانیت۔

(۱۴۵) حضرت عیسٰی علیہ السلام کی فضیلت۔

(۱۴۶) انبیاءِ سابقین کے ساتھ یہود کی بدسلوکیاں۔

تکبر، تکذیبِ انبیاء اور قتلِ انبیاء۔

ف ۔ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب اور قتل ایسے جرائم بھی تکبّر کے باعث ہوئے اس لئے کبر اکثر معاصی، جرائم اور کبائر کا سبب بنتا ہے۔

آیت	مضمون
۸۸	۱۴۷

یہود کی لغوگوئی اور اس کا رد۔

مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ

جو ان کے پاس موجود تھی، حالانکہ اس سے پہلے وہ خود (نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان پر اترنے والی کتاب قرآن کے وسیلے سے)

كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ

کافروں پر فتحیابی (کی دعا) مانگتے تھے، سو جب ان کے پاس وہی نبی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اوپر نازل ہونیوالی کتاب قرآن کے ساتھ)

اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَن

تشریف لے آیا جسے وہ (پہلے ہی سے) پہچانتے تھے تو اسی کے منکر ہو گئے، پس (ایسے دانستہ) انکار کرنیوالوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ انہوں نے اپنی

يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن

جانوں کا کیا بُرا سودا کیا کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کا اِنکار کر رہے ہیں محض اس حسد میں کہ اللہ اپنے فضل سے

فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (وحی) نازل فرماتا ہے، پس وہ غضب در غضب

عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾ وَإِذَا

کے سزاوار ہوئے، اور کافروں کے لئے ذلّت انگیز عذاب ہے۔ اور جب ان سے

قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا

کہا جاتا ہے اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے (اب) نازل فرمایا ہے (تو) کہتے ہیں ہم صرف اس (کتاب) پر

أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ

ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی اور وہ اس کے علاوہ کا اِنکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (قرآن بھی) حق ہے (اور)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ

اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے، آپ (ان سے) دریافت فرمائیں کہ پھر تم اس سے پہلے انبیاء

مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ

کو کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم (واقعی اپنی ہی کتاب پر) ایمان رکھتے تھے۔ اور (صورتِ حال یہ ہے کہ) تمہارے پاس (خود)

آیت	مضمون	
۸۹	۱۴۸	یہود کی قرآن سے واقفیت اور پھر انکار۔

(۱۴۹) یہود کا پہلے زمانے میں وسیلۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کفار پر فتح مانگنا۔

(۱۵۰) یہود کا بعثت کے بعد حسداً نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرنا۔

بارگاہِ الٰہی میں حضور علیہ السلام کے وسیلہ سے دُعا مانگنا پہلی امتوں میں بھی رائج تھا قرآن مجید نے اسکا ذکر فرما کر امتِ مسلمہ کے لئے بھی منصوص کر دیا ہے۔

حاشیہ نمبر ۳۴ "حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگنا پہلی اُمتوں میں بھی رائج تھا" صفحہ نمبر ۲۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ف ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدمِ معرفت محرومی اور کفر کا باعث بن جاتی ہے ۔

آیت	مضمون	
۹۰	۱۵۱	یہود کا حسد اور ضد اور اس کا انجام بد

(۱۵۲) یہود کا کفر وھب وعطاءِ الٰہی کے انکار کی وجہ سے ہے

ف ۔ (۱) وہبی احوال محض فضلِ الٰہی سے نصیب ہوتے ہیں ان میں کسب کا دخل نہیں ہوتا۔

(۲) اہل اللہ کے احوال و مقامات پر حسد، انکار اور ضد غضبِ الٰہی کا باعث بنتا ہے ۔

آیت	مضمون	
۹۱	۱۵۳	قرآن پر ایمان نہ لانے کی وجہ یہود کا فقط اپنی کتاب "تورات" ہی پر ایمان کو کافی سمجھنا ہے۔

صرف اپنی بات اور نقطۂ نظر کو ہی حق اور کافی سمجھنا اور دوسرے کی حق بات کی طرف التفات ہی نہ کرنا بلکہ اسے حسد اور عناد کی بنا پر غلط یا کمتر سمجھنا یہودی ذہنیت ہے یہ آجکل ہمارے مذہبی حلقوں میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔

(۱۵۴) یہود کا اپنی کتاب پر ایمان کا دعویٰ بھی دھوکہ اور فریب ہے۔

بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ

موسیٰ (علیہ السلام) کھلی نشانیاں لائے پھر تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم (حقیقت میں)

ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ

ہو ہی جفا کار ۔ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور ہم نے تمہارے اُوپر طور کو اٹھا کھڑا کیا (یہ فرما کر کہ) اس

الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا

(کتاب) کو مضبوطی سے تھامے رکھو جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے اور (ہمارا حکم) سنو، تو (تمہارے بڑوں نے)

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

کہا ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں، اور ان کے دلوں میں ان کے کفر کے باعث بچھڑے کی محبت رچا دی

بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

گئی تھی، (اے محبوب! انہیں) بتا دیں یہ باتیں بہت (ہی) بُری ہیں جن کا حکم تمہیں تمہارا (نام نہاد) ایمان دے رہا ہے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ

اگر (تم واقعۃً اس پر) ایمان رکھتے ہو ۔ آپ فرما دیں اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک صرف تمہارے لئے

اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ

ہی مخصوص ہے اور لوگوں کے لئے نہیں تو تم (بے دھڑک) موت کی آرزو کرو اگر تم (اپنے

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ

خیال میں) سچے ہو ۔ وہ ہرگز کبھی بھی اس کی آرزو نہیں کریں گے ان گناہوں (اور مظالم) کے باعث جو

اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ

ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں (یا پہلے کر چکے ہیں)، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ۔ آپ انہیں یقیناً سب لوگوں سے

اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ

زیادہ جینے کی ہوس میں مبتلا پائیں گے اور (یہاں تک کہ) مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں سے

معانقة عند المتاخرین

آیت	مضمون	
۹۲	۱۵۵	شریعتِ موسوی کی خلاف ورزی۔

آیت	مضمون	
۹۳	۱۵۶	یہود کی عہد فراموشی اور احکامِ الٰہی کی گستاخی۔

(۱۵۷) بچھڑا پرستی کی پُرانی محبّت یہود کے راہِ حق پر چلنے میں مانع ہوئی۔

پُرانے توہّمات اور باطل محبّتیں اور عصبیتیں راہِ حق پر چلنے میں رکاوٹ بنتی ہیں اس لئے نئے کام کیلئے ذہنی تربیت بہت لازمی ہوتی ہے۔

آیت	مضمون	
۹۴	۱۵۸	یہود کو مَوت مانگنے کا آزمائشی حکم۔

ف ۔ حبِّ مَوت حسنِ آخرت کی علامت میں سے ہے اَولیاء اللہ ہمیشہ مَوت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے خودکشی کا جواز اخذ نہ کیا جائے، وہ حرام ہے۔

آیت	مضمون	
۹۵	۱۵۹	ان کی تمنائے مَوت نہ کرنے کی پیشین گوئی۔

ف ۔ خوفِ مَوت سُوءِ آخرت کی علامت میں سے ہے۔

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ

ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش لمبے ہزار برس کی عمر مل جائے، اگر اسے اتنی عمر مل بھی جائے تو بھی

مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

ع

یہ اسے عذاب سے بچانے والی نہیں ہو سکتی، اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ

آپ فرما دیں جو شخص جبریل کا دشمن ہے (وہ ظلم کر رہا ہے) کیونکہ اس نے (تو) اس (قرآن) کو آپ کے

بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ

دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے (جو) اپنے سے پہلے (کی کتابوں) کی تصدیق کرنیوالا ہے اور مومنوں کے لئے (سراسر)

لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ

ہدایت اور خوشخبری ہے۔ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کا اور

وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿٩٨﴾

جبریل اور میکائیل کا دشمن ہوا تو یقیناً اللہ (بھی ان) کافروں کا دشمن ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا

اور بے شک ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں اتاری ہیں اور ان (نشانیوں) سے سوائے نافرمانوں کے

الْفَاسِقُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ

کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اور کیا (ایسا نہیں کہ) جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے

مِنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ

اسے توڑ کر پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اور (اسی طرح) جب ان کے پاس

رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اللہ کی جانب سے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آئے جو اس کتاب کی (اصلاً) تصدیق کرنیوالے ہیں جو ان کے پاس (پہلے سے) موجود تھی تو انہی

آیت	مضمون
۹۶	۱۶۰

یہود کا زندگی پر شدید حریص ہونا۔

(۱۶۱) زیادتیِ عمر عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

ف ۔ جو لوگ غفلت اور نفسانی شہوات کے باعث اُخروی مشاہدات اور اُلوہی مکاشفات سے محروم اور محجوب ہوتے ہیں وہ طویل عمر کی آرزو کرتے اور موت سے گھبراتے ہیں اور جو لوگ عشقِ الٰہی سے لذت آشنا ہیں وہ موت کو حجاباتِ وحشت کے اُٹھ جانے اور وصال الی اللہ کے نصیب ہو جانے کا سبب جانتے ہیں اس لئے ہر وقت موت اور آخرت کے مُشتاق اور دیدار کے طالب و منتظر رہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا من احبّ لقاء اللہ احبّ اللہ لقاءہ ۔ "جو اللہ کی ملاقات کو محبوب جانے اللہ بھی اس کی ملاقات کو محبوب جانتا ہے"۔ عارف کی موت درحقیقت اس کی بیداری ہے جو موت سے محجوب رہا وہ مُیت سے محجوب رہا۔ اہلِ عشق کے لئے حیات حجاب ہے اور موت رفعِ حجاب۔

آیت	مضمون
۹۷	۱۶۲

قرآن مجید حضرت جبریلؑ لے کر نازل ہوئے۔

(۱۶۳) قرآن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلبِ انور پر نازل کیا گیا۔ قرآن پہلی کتابوں کے لئے تصدیق، طالبانِ منزل کیلئے ہدایت اور اہلِ ایمان کیلئے خوشخبری ہے۔

(۱۶۴) یہود حضرت جبریلؑ سے محض اس لئے دشمنی کرنے لگے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کیوں وحی لے کر اُترے۔

حسد کے باعث انسان عقل و شعور اور عدل و انصاف کی ہر حد توڑ دیتا ہے اور وہ حقائق ثابتہ کا بھی انکار کرنے لگتا ہے۔

آیت	مضمون
۹۸	۱۶۵

اللہ تعالیٰ، رسول اور فرشتوں سے دشمنی کا انجام۔

ف ۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول و مقرب بندوں کی دُشمنی اللہ تعالیٰ کی عداوت کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کی تصریح اس حدیثِ قدسی میں بھی ہے جسمیں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: من عادی لی ولیًا فقد اٰذنتہ بالحرب ۔ "جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی میں اُس کے ساتھ جنگ

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ

اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی (اسی) کتاب (تورات) کو پس پشت پھینک دیا گویا وہ (اس کو) جانتے ہی نہیں (حالانکہ اسی

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا

تورات نے انہیں نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر دی تھی) ۔ اور وہ (یہود تو) اس چیز (یعنی جادو) کے

الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

پیچھے (بھی) لگ گئے تھے جو سلیمان (علیہ السلام) کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے حالانکہ سلیمان (علیہ السلام) نے (کوئی)

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ

کفر نہیں کیا بلکہ کفر تو شیطانوں نے کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اس (جادو کے علم) کے پیچھے (بھی)

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ

لگ گئے جو شہرِ بابل میں ہاروت اور ماروت (نامی) دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا، وہ

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے تھے یہاں تک کہ کہہ دیتے کہ ہم تو محض آزمائش (کیلئے) ہیں سو تم (اس پر اعتقاد رکھ کر)

فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ

کافر نہ بنو ، اس کے باوجود وہ (یہودی) ان دونوں سے ایسا (منتر) سیکھتے تھے جس کے ذریعے شوہر اور اسکی

الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ

بیوی کے درمیان جُدائی ڈال دیتے ، حالانکہ وہ اس کے ذریعے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ

مگر اللہ ہی کے حکم سے ، اور یہ لوگ وہی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کے لئے ضرر رساں ہیں اور انہیں نفع نہیں

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ

پہنچاتیں اور انہیں (یہ بھی) یقیناً معلوم تھا کہ جو کوئی اس (کفر یا جادو ٹونے) کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ

کا اعلان کرتا ہوں۔"

آیت ۹۹	مضمون ۱۶۶	حقّانیتِ قرآن مجید کی نفی اور اس کی حکم عدولی کرنے والے ہی اصل منکر ہیں۔
آیت ۱۰۰	مضمون ۱۶۷	عہد شکنی یہودی ذہنیت و عادت ہے۔
آیت ۱۰۱	مضمون ۱۶۸	شانِ نبوّتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نظر انداز کرنا یہودی ذہنیت کا خاصا ہے

(۱۶۹) شانِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا انکار خود کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دینے کے مترادف ہے۔

یہود نے پوری تورات کا انکار نہیں کیا تھا صرف اُن مقامات کو چھپاتے تھے جہاں حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ اقدس اور فضائل و کمالات کا بیان تھا، ان کے عمل کو باری تعالیٰ نے گویا پوری کتاب الٰہی کو پسِ پُشت ڈال دینے سے تعبیر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شانِ نبوّت کو نظر انداز کر دے اور عقیدۂ توحید سمیت بقیہ کتابِ الٰہی پر پورا ایمان رکھے تو اللہ تعالیٰ کو ایسا عقیدہ و ایمان ہرگز منظور نہیں۔

حاشیہ نمبر ۳۴ "یہود نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے حسد کے باعث اپنی کتاب تورات کو بھی پس پشت ڈال دیا" صفحہ نمبر ۲۸۸ پر ملاحظہ فرمائیں

خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا

نہیں (رہے گا) اور وہ بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں (کی حقیقی بہتری یعنی اخروی فلاح) کو بیچ ڈالا،

يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ

کاش وہ اس (سودے کی حقیقت) کو جانتے ۔ اور اگر وہ ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو اللہ کی بارگاہ سے (تھوڑا سا) ۱۲

عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ ع

ثواب (بھی ان سب چیزوں سے) کہیں بہتر ہوتا، کاش وہ (اس راز سے) آگاہ ہوتے ۔ اے ایمان والو! (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۲

اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۗ

کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے) رَاعِنَا مت کہا کرو بلکہ (ادب سے) اُنْظُرْنَا (ہماری طرف نظرِ کرم فرمائیے) کہا کرو اور (ان کا ارشاد)

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بغور سنتے رہا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ۔ نہ وہ لوگ جو اہلِ کتاب میں سے کافر ہو گئے ہیں اور

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ

نہ ہی مشرکین اسے پسند کرتے ہیں کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی

مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ

بھلائی اترے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص

مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ

کر لیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۔ ہم جب کوئی آیت منسوخ

مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ

کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں (تو بہر صورت) اس سے بہتر یا ویسی ہی (کوئی اور آیت) لے آتے ہیں،

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ

کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر (کامل) قدرت رکھتا ہے ۔ کیا تمہیں معلوم

آیت	مضمون	
۱۰۲	۱۷۰	جادو سیکھنا اور جادو کرنا شیطانی کارنامہ اور سراسر کفر ہے۔

(۱۷۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کی حقانیت اور شیاطین کا ساحرانہ کفر۔

(۱۷۲) چاہِ بابل اور ہاروت و ماروت کا تذکرہ۔

(۱۷۳) جادو کی حقیقت، جادو باذنِ الٰہی اثر کرتا ہے مگر لوگوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے۔

اسی لیے شریعتِ اسلامیہ میں اسے کفر قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے کلیتاً روک دیا گیا ہے۔

(۱۷۴) جادو کے ذریعے میاں بیوی میں تفریق کا عمل نہایت قابلِ مذمت ہے۔

(۱۷۵) جادوگر کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

بیشک جادو اپنا منفی اور شیطانی اثر رکھتا ہے مگر اسلام نے اسے صریح گمراہی، فتنہ، فسق، معصیت اور بعض صورتوں میں کفر قرار دیا ہے اور اس کی پیروی سے مسلمانوں کو منع کیا ہے۔ قرآن مجید کی آخری دو سورتیں (معوذتین) اسی جادو کے اثر کے توڑ کے لیے نازل ہوئیں۔ ان میں دیگر اقسام کے فتنہ و شر کا علاج بھی رکھا گیا ہے۔

آیت	مضمون	
۱۰۳	۱۷۶	ایمان اور تقویٰ کا اجر بہتر اور اُخروی معاوضہ اعلیٰ ہے۔

آیت	مضمون	
۱۰۴	۱۷۷	اَدب و تعظیمِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب اور تقاضے۔

(۱۷۸) شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معمولی سی لفظی گستاخی بھی کفر ہے

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادب و احترام اور تعظیم و تکریم کا ایک اصولی ضابطہ اُمتِ مسلمہ کو عطا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں گفتگو کے آداب کیا ہونے چاہییں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے صحابہ سے کلام فرماتے تو اگر انہیں کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوبارہ سننے کے لئے عرض کرتے "رَاعِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" (یا رسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمائیے) یعنی

ہمیں سمجھانے کے لئے یہ بات دوبارہ ارشاد فرمادیجئے۔ یہ کلمہ فی نفسہٖ گستاخی کا نہ تھا مگر یہودیوں نے اپنے خبثِ باطن کے باعث اسے غلط معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا تھا جس سے دربارِ رسالت میں بے ادبی اور گستاخی کا پہلو نکلتا تھا چنانچہ مسلمانوں پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے اس لفظ کے استعمال کی پابندی لگادی گئی حالانکہ صحابہؓ کرام اس لفظ کو بے ادبی اور گستاخی کے معنی میں بولنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، چونکہ اس میں گستاخی اور بے ادبی کا مفہوم پیدا ہونے یا پیدا کرلئے جانے کا احتمال تھا اسلئے اللہ تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ ایسا لفظ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذؓ اور بعض روایات کے مطابق سعد بن عبادہؓ نے یہود کو لفظ رَاعِنَا غلط معنی میں استعمال کرتے سُنا تو کہا یا اعداء اللہ علیکم لعنۃ اللہ والذی نفسی بیدہ لئن سمعتھا من رجل منکم یقولھا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لاضربن عنقہ، فقالوا او لستم تقولونھا فنزلت ھذہ الآیۃ (تفسیر کبیر، کشاف، قرطبی، روح المعانی وغیرہ) "اے اللہ کے دشمنو! تم پر اللہ کی لعنت ہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں نے تم میں سے کسی کو یہ لفظ "رَاعِنَا" حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حق میں بولتے ہوئے سُن لیا تو میں اس کی گردن اُڑادوں گا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تم بھی تو یہ لفظ بولتے ہو چنانچہ اس لفظ کے استعمال کی منع پر یہ آیت نازل ہوگئی"۔

(۱۷۹) لفظ "رَاعِنَا" میں گستاخی اور بے ادبی کے درج ذیل احتمالات تھے۔

۱۔ یہود کی زبان میں یہ لفظ کلمہ تحقیر کے طور پر استعمال ہوتا تھا وہ اسے بطور گالی استعمال کرتے تھے۔

۲۔ عبرانی اور سریانی زبان میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "تو بہرہ ہو جائے"۔

۳۔ عربی زبان میں لفظ "راعن" کا ایک معنی صاحبِ رعونت یعنی متکبّر کا تھا۔ اور ایک معنی جاہل اور احمق کا بھی تھا۔ گو "راعن" اور لفظ تھا اور وہ رعونت سے تھا اور "راعنا" مراعات سے تھا اور اس کا معنی تھا "ہمارے حال کی رعایت فرمائیے" مگر "راعن" اور "راعنا" میں بولتے وقت کوئی بدطینت اضافت کا تعلق بنا سکتا تھا اور اس طرح لفظ "راعن" کا معنی، مفہوم ادھر منسوب کئے جانے کا امکان تھا۔

۴۔ یہود اپنی گستاخانہ ذہنیت کے باعث آپس میں "راعنا" کے لفظ کو دبا کر "رَاعِیْنَا" کہتے تھے جس کا معنی "ہمارے چرواہے" کا بن جاتا اسطرح وہ اپنی مجلسوں میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی گستاخی اور تضحیک کے ذریعے اپنے بغض و حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرتے تھے اس کا ذکر قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یوں آیا ہے "رَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ"۔ (رَاعِنَا کو اپنی زبان مروڑ کر بولتے ہیں)۔

۵۔ قطرب نے بیان کیا ہے کہ یہ لفظ بعض اوقات اہلِ حجاز تضحیک اور تمسخر کے وقت بھی استعمال کرتے تھے۔

۶۔ الرعی بین اثنین میں دو بولنے والوں کے درمیان برابری اور مساوات کا مفہوم پایا جاتا ہے لہٰذا اس لفظی مناسبت کی بنا پر راعنا میں بوقتِ مخاطبت مفہوماً لوگوں کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مساوات اور برابری کا گمان ہو سکتا تھا۔

۷۔ قاضی عیاضؒ نے "الشفاء" میں بیان کیا ہے کہ لغتِ انصار کے مطابق اس لفظ راعِنا کے استعمال میں قلتِ ادب اور عدمِ توقیر و تعظیم کا پہلو نکلتا تھا کیونکہ مقامی لوگ اس لفظ کو اس جگہ استعمال کرتے تھے جہاں خاص ادب و تعظیم ملحوظ نہ ہوتا اور بلا اہتمامِ خاص گفتگو کرنا مقصود ہوتی۔

ان احتمالات کے پیشِ نظر نہ صرف اس لفظ کو شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بے ادبی قرار دیکر اسے استعمال کی سخت ممانعت کردی گئی بلکہ امام ابو نعیم دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اس آیت کے نزول کے بعد یہ لفظ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں بولے مسلمانوں کو اس کی گردن اڑا دینے کا اذنِ عام دے دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو فتح القدیر از شوکانی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵) تاکہ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی طور پر بھی کوئی گستاخی کی جسارت نہ کر سکے۔

(۱۸۰) مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں آیتِ متذکرہ سے درج ذیل احکام معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ جن الفاظ و کلمات کا استعمال دوسری زبانوں میں غلط اور حقارت انگیز معنی میں ہوتا ہے خواہ ہماری زبان میں اچھے وہ صحیح معنی ہی ہوں ان کا استعمال بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس میں گستاخی تصور کیا جائے گا کیونکہ دشمن اس لفظ کو اپنے بغض و حسد کی بنا پر سرِعام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گستاخی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

۲۔ جن کلمات سے ملتے جلتے معروف الفاظ کسی دوسری یا اپنی زبان میں واضح طور پر اہانت و تنقیص کا معنی رکھتے ہوں ان کا استعمال بھی لفظی مناسبت و مشارکت کی بنا پر گستاخی پر محمول ہوگا۔

۳۔ جس لفظ میں معمولی سے لہجے کی تبدیلی کے ساتھ بولنے سے واضح اہانت اور گستاخی کا معنی پیدا ہو جائے اس کا استعمال بھی شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بے ادبی تصور ہوگا۔

۴۔ جن کلمات کا استعمال مختلف معانی میں ہوتا ہو یعنی وہ ایسے ذو معنی لفظ ہوں کہ ان میں اچھے مفہوم کے علاوہ برا مفہوم بھی معلوم اور متعارف ہو ان کا استعمال بھی صریح گستاخی ہوگا۔

۵۔ ایسے الفاظ و کلمات جن سے کسی بھی امتی کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مساوات اور برابری کا پہلو نکلتا ہو ان کا استعمال بھی شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی ہے کیونکہ قرآن مجید میں صریح حکم ہے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ

بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ "جس طرح تم ایک دوسرے کو آپس میں پکارتے ہو خبردار اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ بلایا کرو"۔

۶۔ ایسے الفاظ و کلمات جن میں معناً ادب و تعظیم اور توقیر کا فقدان یا کمی ہو اور ان میں مخاطب کی عظمت کا لحاظ نہ پایا جاتا ہو خواہ اُن میں ظاہراً کوئی اہانت اور بے ادبی کا معنی بھی موجود نہ ہو ان کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں استعمال کرنا بھی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

۷۔ ایسے الفاظ و کلمات جو گستاخانہ نہ ہوں مگر ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی، بے ادبی اور اہانت کا دروازہ کھلتا ہو اور راہ ہموار ہوتی ہو ان کا استعمال بھی فی نفسہٖ گستاخی کے حکم میں تصور کیا جائے گا۔

سو ایسے تمام الفاظ و کلمات جو خود تو گستاخانہ اور اہانت انگیز نہیں مگر مُوہمِ تحقیر و اہانت (اہانت و تحقیر کا گمان پیدا کرنے والے) اور مُوہمِ مساوات (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برابری کا گمان پیدا کرنے والے) ہیں ان کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بولنا اور لکھنا بھی منع ہے۔ اسے بھی گستاخی قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں معمولی سی گستاخی بھی خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، صریح ہو یا کنایہ حتیٰ کہ وہ کلمہ خواہ فی نفسہٖ ظاہراً مبنی بر اہانت ہو یا فقط مُوہمِ اہانت شریعتِ اسلامی میں کفر ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ موہمِ اہانت کلمہ گستاخی و اہانت کی نیت کے بغیر بولنا بھی صریح حرام ہے اور اس پر مطلع ہو جانے کے بعد اسے ارادۃً یا تکراراً بولنا یا قائم رکھنا صریح کفر ہے۔

۹۔ اس آیت کریمہ اور دیگر قرآنی احکام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کا مُرتکب کافر اور مُرتد ہے اور شرعاً واجب القتل ہے۔ (آیت مذکورہ سے متعلقہ حاشیہ نمبر ۲۵ صفحہ نمبر ۲۸۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون	
۱۰۵	۱۸۱	یہودیوں اور کافروں کا مسلمانوں سے واضح عناد۔

اُمتِ مسلمہ کو اس حقیقت سے ہمیشہ آگاہ رہنا چاہیے کہ یہودی اور کفّار مسلمانوں کے خیر خواہ کبھی نہیں ہو سکتے وہ ہمیشہ عالمِ اسلام کو کمزور کرنے اور اسے بھلائی سے محروم رکھنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ تعجب ہے ان مسلمان حکمرانوں پر جو قرآن مجید کے اس قدر واضح اعلان کے باوجود ان پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں۔

(۱۸۲) اللہ تعالیٰ کی مشیت، رحمت اور فضل کا بیان۔

آیت	مضمون	
۱۰۶	۱۸۳	بعض آیات کا ناسخ اور بعض کا منسوخ ہونا اور اس کی حکمت۔

بعض آیات اور احکام خاص مقاصد اور مصالح کی تکمیل کے لئے نازل کئے گئے جب وہ مقاصد اور مصالح پورے ہوگئے تو انہیں منسوخ کرکے نئے احکام اتارے گئے اور ان پر اسلام کے مستقل نظام کی بنیاد رکھی گئی، اس میں تشریعی اور تکوینی دونوں حیثیتیں پیش نظر تھیں یہی فلسفۂ نسخ ہے۔

ف۔ سالک بعض اوقات قلبی کیفیات اور روحانی واردات میں کسی سے محروم کردیا جاتا ہے حالانکہ اس کا کوئی قصور اور گناہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں باری تعالیٰ سابقہ کیفیت کو منسوخ کرکے اسے نئی اعلیٰ کیفیت سے نوازتے ہیں۔ یہ طریق علاج ہے۔ اطباء بھی مریضوں کے علاج میں صحیح تشخیص اور صحیح تجویز کے باوجود ادویات مرحلہ وار بدلتے رہتے ہیں۔ اس میں فقط ارتقائی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ مشائخ بھی مریدین کی تربیت کے دوران حسب حال مختلف وظائف تجویز کرتے ہیں جس سے تدریجاً ترقیٔ احوال ہوتی ہے۔

(۱۸۴) اللہ تعالیٰ کا ہر چیز پر قادر ہونا۔

آیت	مضمون
۱۰۷	۱۸۵

خدا کی عظمت و حکومت اور مسلمانوں کے حق میں خدا کی ولایت و نصرت۔

اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ

نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے ، اور اللہ کے سوا

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿١٠٧﴾ اَمْ تُرِیْدُوْنَ

نہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ ہی مددگار - (اے مسلمانو!) کیا تم چاہتے

اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ

ہو کہ تم بھی اپنے رسُول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اسی طرح سوالات کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے سوال

وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ

کئے گئے تھے تو جو کوئی ایمان کے بدلے کفر حاصل کرے پس وہ واقعۃً سیدھے راستے سے

السَّبِیْلِ ﴿١٠٨﴾ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ

بھٹک گیا - بہت سے اہلِ کتاب کی یہ خواہش ہے تمہارے ایمان لے آنے

مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ

کے بعد پھر تمہیں کفر کی طرف لوٹا دیں، اس حسد کے باعث جو اُن کے دلوں میں ہے

مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

اس کے باوجود کہ ان پر حق خوب ظاہر ہو چکا ہے ، سو تم درگزر کرتے رہو اور نظرانداز

حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ

کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے ، بیشک اللہ ہر چیز پر کامل قدرت

قَدِیْرٌ ﴿١٠٩﴾ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا

رکھتا ہے - اور نماز قائم (کیا) کرو اور زکوٰۃ دیتے رہا کرو ، اور تم اپنے

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

لئے جو نیکی بھی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے حضور پا لوگے ، جو کچھ تم

آیت	مضمون
۱۰۸	۱۸۶

دربارِ رسالت میں کثرتِ سوال کی ممانعت۔

(۱۸۷) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایذاءً سوال کرنا بھی کفر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادنیٰ اذیت رسائی سے بھی ایمان کفر میں بدل جاتا ہے۔ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادنیٰ سی گستاخی بھی ایسا کفر ہے جس کے بعد دوبارہ ھدایت ملنا محال ہے۔

حاشیہ نمبر ۲۶ "حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ایذاً بے جا سوالات کرنے کی جسارت بھی کفر ہے" صفحہ نمبر ۲۹۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون
۱۰۹	۱۸۸

اہلِ کتاب کا مسلمانوں سے حسد وعناد۔

اہلِ کتاب سے درگزر کرنے کا حکم، اس کے بعد اسلام کے استحکام کے زمانے میں دوسرا حکم نازل ہوا جس میں ان کی ولایت واعتماد سے کلّیۃً منع کردیا گیا۔

آیت	مضمون
۱۱۰	۱۸۹

نماز اور زکوٰۃ کا حکم۔

ہر نیک کام کا صلہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ

کر رہے ہو یقیناً اللہ اسے دیکھ رہا ہے - اور (اہلِ کتاب) کہتے ہیں کہ جنّت میں ہرگز

الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ

کوئی بھی داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ وہ یہودی ہو یا نصرانی ، یہ ان کی باطل امیدیں ہیں ،

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ ۚ

آپ فرما دیں کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو اپنی (اس خواہش پر) سند لاؤ - ہاں ، جس نے

مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ

اپنا چہرہ اللہ کے لئے جھکا دیا (یعنی خود کو اللہ کے سپرد کر دیا) اور وہ نیکو کار ہوگیا تو اس کے لئے اس کا

عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

اجر اُس کے رب کے ہاں ہے اور ایسے لوگوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے -

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَ

اور یہود کہتے ہیں کہ نصرانیوں کی بنیاد کسی شے (یعنی صحیح عقیدے) پر نہیں ، اور نصرانی

قَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ

کہتے ہیں کہ یہودیوں کی بنیاد کسی شے پر نہیں ، حالانکہ وہ (سب اللہ کی نازل

يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

کردہ) کتاب پڑھتے ہیں ، اسی طرح وہ (مشرک) لوگ جن کے پاس (سرے سے کوئی آسمانی) علم ہی نہیں وہ بھی

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

انہی جیسی بات کرتے ہیں ، پس اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس معاملے میں (خود ہی) فیصلہ فرما

فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ

دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں - اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی

(۱۹۰) اللہ تعالیٰ ہمارے تمام چھوٹے بڑے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔

کسی بھی عمل کے بارے میں یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ یہ آخرت میں اپنے صلہ کے اعتبار سے نظر انداز کر دیا جائیگا۔

آیت	مضمون	
۱۱۱	۱۹۱	اپنے سوا دوسروں کے جنّتی نہ ہونے کا خیال فاسد ہے۔

(۱۹۲) صرف اپنے ہی جنّتی ہونے کی سوچ یہودی ذہنیّت کی عکاس ہے۔

(۱۹۳) بلا دلیلِ خاص کسی کے جہنّمی ہونے کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے۔

آیت	مضمون	
۱۱۲	۱۹۴	یہودی ذہنیّت کا رد۔

(۱۹۵) مغفرت پر کسی کی اجارہ داری نہیں، ہر مخلص مسلمان کیلئے اُخروی اجر کی بشارت ہے۔

اسلام کے ساتھ احسان شرطِ ولایت ہے۔

ف۔ اِحسان ہی حدیثِ جبریل کے مطابق (جو صحیح بخاری و صحیح مسلم میں مروی ہے) اخلاص، سلوک اور تصوّف کا طریق ہے۔ اسلام کے عقائد و اعمال کی شرائط کے ساتھ جب تک اس شرط کو پورا نہ کیا جائے وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی نعمتِ خاصہ نصیب نہیں ہوتی۔ یہ آیت اسلام میں تصوف و طریقت کی اصل پر نص ہے۔

آیت	مضمون	
۱۱۳	۱۹۶	یہود و نصاریٰ کا ایک دوسرے کی تنقیص اور تحقیر کرنا

ف۔ مسلمانوں کے مابین فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات میں یہ رُجحان کہ دوسرے مسلک کے لوگوں کو کلیّۃً کافر و مشرک اور بدعتی و جہنّمی قرار دینا اور بلا امتیاز مخالف علماء اور ان کے پیروکاروں کو "لَا شَيْءٍ" اور "لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ" کے فتووں سے نوازنا صحیح نہیں ہے، یہ وطیرہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی مذمت کی ہے

******

مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ

مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کئے جانے سے روک دے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔

خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا

(انہیں ایسا کرنا مناسب نہ تھا بلکہ) ان کو تو یہ چاہیے تھا کہ مسجدوں میں (اللہ سے) ڈرتے

خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ

ہوئے داخل ہوتے، ان کے لئے دنیا میں (بھی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ق فَاَيْنَمَا

(بھی) بڑا عذاب ہے۔ اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا ہے، پس تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر ہی

تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾

اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)، بیشک اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا

اور وہ کہتے ہیں اللہ نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے، حالانکہ وہ (اس سے) پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور

فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ بَدِيْعُ

زمین میں ہے (سب) اسی کی (خلق اور ملک) ہے، (اور) سب کے سب اُس کے فرماں بردار ہیں۔ وہی آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا

اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے، اور جب کسی چیز (کے ایجاد) کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو پھر اس کو صرف

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

یہی فرماتا ہے کہ "تُو ہو جا" پس وہ ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ

کلام کیوں نہیں فرماتا یا ہمارے پاس (براہِ راست) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟، اسی طرح ان سے

ہر فرقے کے عقیدہ و عمل کی مناسبت سے الگ حکم ہونا چاہیئے۔

(۱۹۷) ایک دوسرے پر اپنی فضیلت جتلانے والوں کا صحیح فیصلہ قیامت کے روز ہوگا۔

آیت ۱۱۴	مضمون ۱۹۸

مساجد میں ذکرِ الٰہی سے روکنے والے دراصل مساجد کی بربادی اور ویرانی کا باعث بنتے ہیں۔

(۱۹۹) مساجد میں بیباکی اور ایک دوسرے پر زیادتی کی جسارت سخت بے ادبی اور ظلم ہے۔

(۲۰۰) مساجد کی بے حُرمتی کی سزا۔

مساجد کی بے ادبی و بے حرمتی اور ویرانی کا باعث بننے والے دُنیا میں ذلّت اور آخرت میں عذابِ عظیم کے مستحق ہیں۔

آیت ۱۱۵	مضمون ۲۰۱

شرق و غرب سب اللہ کی مملکت ہے۔

(۲۰۲) ہر سمت میں وجہُ اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا موجود ہونا کسی سمت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ وہ محیط الکل اور علیم بالذّات ہے۔

(۲۰۳) باری تعالیٰ کے اسماءِ صفات۔

ف۔ صُوفیا نے وحدۃ الوجود اور بعض نے وحدۃ الشہود کا استدلال اسی آیت کریمہ سے کیا ہے۔

آیت ۱۱۶	مضمون ۲۰۴

اہلِ کتاب کے عقیدۂ اُولادِ الٰہی کی تردید اور استدلالِ توحید۔

آیت ۱۱۷	مضمون ۲۰۵

باری تعالیٰ کا بالائی اور زیریں کائنات کو اصلاً عدم سے وجود میں لانا۔

(۲۰۶) تکمیلِ اَمر کے لئے حکمِ کُنْ فرمانا۔

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ

پہلے لوگوں نے بھی انہی جیسی بات کہی تھی، ان (سب) لوگوں کے دل آپس میں ایک جیسے ہیں

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ

بیشک ہم نے یقین والوں کے لئے نشانیاں خوب واضح کر دی ہیں۔ (اے محبوب مکرم!) بیشک ہم نے

بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ

آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اہلِ دوزخ کے بارے میں آپ سے

الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى

پرسش نہیں کی جائے گی - اور یہود و نصاریٰ آپ سے (اس وقت تک) ہرگز خوش نہیں ہوں گے جب تک آپ

حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ

ان کے مذہب کی پیروی اختیار نہ کر لیں، آپ فرما دیں کہ بیشک اللہ کی (عطا کردہ) ہدایت ہی (حقیقی)

الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ

ہدایت ہے، (امت کی تعلیم کے لئے فرمایا) اور اگر (بفرضِ محال) آپ نے اس علم کے بعد جو آپ کے پاس

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

(اللہ کی طرف سے) آ چکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کے لئے اللہ سے بچانے والا نہ کوئی دوست

نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ

ہوگا اور نہ کوئی مددگار - (ایسے لوگ بھی ہیں) جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسے

تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ

پڑھنے کا حق ہے، وہی لوگ اس (کتاب) پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو اس کا انکار کر رہے ہیں

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا

سو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں - اے اولادِ یعقوب! میری اس نعمت کو یاد کرو

نصف منزل

۱۴ ع ۹ ۱۴

آیت	مضمون	
۱۱۸	۲۰۷	مشرکین کے بے ہودہ مطالبات اور اُن کا جواب۔

(۲۰۸) دلائل صرف طالبانِ یقین کو فائدہ دیتے ہیں کج بحثی کرنے والوں کو نہیں۔

اللہ تعالیٰ سے نشانی طلب کرنے والوں کو جواب دیا گیا ہے کہ اُن ہی نشانیوں کا عظیم مجموعہ اور پیکرِ اتم تو تمہارے پاس آچکا ہے جس کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جو بشیر و نذیر ہے۔ اس عظیم نشانی کے بعد مزید کس نشانی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

آیت	مضمون	
۱۱۹	۲۰۹	رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق۔

(۲۱۰) منکرین کی نسبت انبیاء سے جواب طلبی نہیں کی جاتی۔

داعیانِ حق کے ذمہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کی بات کس نے مانی اور کس نے نہیں مانی۔ دعوت کا انکار کرنے والوں کی بابت داعیانِ حق سے بازپرس اور جواب طلبی نہیں کی جاتی۔ منکرین کے انکار کے باوجود بھی دعوت حق پر مبنی ہی رہتی ہے۔

(۲۱۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بشیر و نذیر ہونا۔ (حاشیہ نمبر ۲۷ صفحہ نمبر ۲۹ ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون	
۱۲۰	۲۱۲	آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے دعوت و جدّوجہد کے بعض آداب و ہدایات۔

(۲۱۳) یہود و نصاریٰ کسی قیمت پر بھی نظامِ اسلام سے خوش نہیں ہوں گے۔

(۲۱۴) یہود و نصاریٰ کے نظام کی پیروی سے عذابِ الٰہی کی آمد۔

اُمت کے اہلِ فکر و قیادت کو جان لینا چاہیئے کہ جب تک مسلمان اسلام کی راہ پر ہیں عالمِ یہودیت اور عالمِ عیسائیت دونوں ان سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے خواہ مسلم ممالک ہزار مرتبہ ان کی پالیسیوں کی تائید کرتے رہیں۔ مغربی سامراجی طاقتیں صرف اس وقت عالمِ اسلام یا کسی مُسلم سلطنت سے خوش ہونگی جب وہ اسلامی نظام اور اسلامی طرزِ حیات کی بات چھوڑ کر سیکولر ہو جائیں گے۔ آج بنیاد پرستی اور غیر بنیاد پرستی کا جھگڑا اسی حوالے سے ہے۔ "حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" اور "لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ" کی صُورت میں اگر مسلمان ان استعماری اور طاغوتی طاقتوں کا فلسفۂ حیات اور ان کا عطا کردہ نظامِ عالم مان لیں جسے نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے تو خدا کے عذاب اور تباہی سے نہیں بچ سکیں گے۔

آیت	مضمون	
۱۲۱	۲۱۵	کتابِ الٰہی کا حقِّ تلاوت ادا کرنے والے ہی اصل مومن ہیں۔

نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

جو میں نے تم پر ارزانی فرمائی اور (خصوصاً) یہ کہ میں نے تمہیں اس زمانے کے تمام لوگوں پر

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ

فضیلت عطا کی ۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی دوسری جان کی جگہ کوئی بدلہ

نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا

نہ دے سکے گی اور نہ اس کی طرف سے (اپنے آپ کو چھڑانے کیلئے) کوئی معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ اسکو (اذنِ الٰہی کے بغیر)

شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ

کوئی سفارش ہی فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ (امرِ الٰہی کے خلاف) انہیں کوئی مدد دی جا سکے گی ۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو

رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو انہوں نے وہ پوری کر دیں، (اس پر) اللہ نے فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا،

اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي

انہوں نے عرض کیا (کیا) میری اولاد میں سے بھی؟ ، ارشاد ہوا (ہاں مگر) میرا وعدہ ظالموں کو

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ

نہیں پہنچتا ۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے اس گھر (خانہ کعبہ) کو لوگوں کے لئے رجوع (اور اجتماع) کا مرکز

وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ

اور جائے امان بنا دیا، اور (حکم دیا کہ) ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مقامِ نماز بنا لو، اور

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ

ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید فرمائی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف

لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ

کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک (صاف) کر دو ۔ اور جب

(۲۱۶) کتابِ الٰہی کا اِنکار کرنے والے ہی خسارے میں ہوں گے۔

آیت ۱۲۲	مضمون ۲۱۷

بنی اِسرائیل کو نعماتِ الٰہیہ کی سہ بار یاد دہانی۔

آیت ۱۲۳	مضمون ۲۱۸

قیامت اور اُس کی ہولناکی کا خوف دلانا۔

(۲۱۹) روزِ قیامت کوئی دوسرے کی طرف سے حقِ واجب اور بدلہ اَدا نہ کرسکے گا۔

(۲۲۰) روزِ قیامت کسی کی بخشش کے لئے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا جائیگا۔

(۲۲۱) روزِ قیامت غیر حقداروں کو شفاعت بھی کوئی نفع نہ دیگی۔

اِس آیتِ کریمہ کے الفاظ "لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ" سے ثابت ہوا کہ اُس دن اذنِ الٰہی سے شفاعت ہوگی اور حقداروں کو شفاعت سے فائدہ بھی پہنچے گا مگر غیر حقدار اس شفاعت سے بھی کوئی نفع نہ پاسکیں گے۔

(۲۲۲) روزِ قیامت منکرین کی کوئی مدد بھی نہیں کی جائیگی۔

آیت ۱۲۴	مضمون ۲۲۳

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مختلف طریقوں سے آزمایا جانا اور اُن کا ہر آزمائش میں پورا اُترنا۔

(۲۲۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نوعِ انسانی کی امامت و قیادت کا وعدہ۔

(۲۲۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی اَولاد کے لئے بھی نعمتِ امامت کا طلب کرنا۔

(۲۲۶) اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نعمت ظالموں اور نافرمانوں کے حق میں نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ منصبِ عالی کڑی آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد نصیب ہوتا ہے اور اس کے حقدار صرف اطاعت گزار لوگ ہوتے ہیں نافرمان نہیں۔

آیت	مضمون
۱۲۵	۲۲۷

کعبۃ اللہ عوام و خواص کا مرجع ہے ۔

(۲۲۸) کعبۃ اللہ اہلِ اسلام کے لئے مرکزِ امن ہے ۔

(۲۲۹) مقامِ ابراہیم کو مصلّٰی بنایا جائے ۔

مقامِ ابراہیم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے کھڑا ہونے کی جگہ ہے ۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر آپ کے مبارک قدموں کے نشانات ثبت ہیں ۔ اس مقام کو نسبتِ نبوی کے باعث یہ فضیلت اور شرف ملا کہ اسے " جائے نماز " بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے ۔ طوافِ کعبہ کی تکمیل آخر میں اسی مقام پر دُو رکعت نفل ادا کرنے سے ہوتی ہے ۔ معلوم ہوا کہ جن مقامات کو باری تعالیٰ کے محبوب اور مُقرّب بندوں سے نسبت ہو وہاں عبادت کرنے سے زیادہ برکات و فیوضات حاصل ہوتے ہیں ۔

مقامِ ابراہیم کو اس قدر عظمت کیوں ملی ؟

یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب یہ ہے کہ یہی وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ تعمیر فرمایا تھا اور جب تعمیرِ کعبہ فرما چکے تو اسی مقام پر باری تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ نے حضور خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی نسل سے ولادت و بعثت کی دُعا کی ۔ جس کا ذکر آگے آیت : ۱۲۹ میں آ رہا ہے (وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ) چنانچہ باری تعالیٰ نے آپ کی دُعا قبول فرمائی اور آپ ہی کی اولاد (بنی اسمٰعیل) میں سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم متولد ہوئے جبکہ پہلے تمام انبیاء بنی اسرائیل سے چلے آ رہے تھے پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس کعبہ کو قیامت تک کیلئے آباد فرمایا ۔ سو " مقامِ ابراہیم " کی نسبت فقط تعمیرِ کعبہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں سے ہی نہ تھی بلکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت و بعثت کی دعا سے بھی تھی ۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ولادت کے ضمن میں اسی دُعا کا ذکر بھی فرمایا ہے ۔ سو مقامِ ابراہیم کو اس اعتبار سے نسبتِ ابراہیمی سے بھی بڑھ کر نسبتِ محمّدی صلے اللہ علیہ وسلم میسر ہے جس کے باعث اسکو " مصلّٰی " بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے ۔ ورنہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے مبارک قدم تو اور بھی کئی پتھروں پر لگتے ہوں گے ۔ اس لیے نہ صرف یہ پتھر ہی محفوظ رہا ۔ بلکہ اس پر آپ کے قدم بھی محفوظ رکھے گئے تاکہ دُعا کی نشانی قائم رہے ۔

جس شے کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نسبت ہے ، وہ بھی اللہ کے ہاں محبوب ہے ۔

ذاتِ خداوندی کو اپنے محبوب سے اس قدر محبت ہے کہ ہر وہ چیز جسے حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نسبت

ہو جاتی ہے وہ بھی اللہ کے اس قدر و منزلت کے باعث لائق قسم ہو جاتی ہے۔ خدائے ذوالجلال نے قرآن مجید میں اس شہر کی بھی قسم کھائی ہے جس کی خاک کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک پاؤں کے تلوؤں کو چھونے کا شرف حاصل ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ	مجھے قسم ہے اس شہر کی جس میں تو مقیم ہے۔

ذاتِ خداوندی شہرِ محبوب کی قسم اس لیے کھا رہی ہے کہ وہاں اس کے مبارک قدم لگتے ہیں جس طرح ہر مکان کی عزت اس کے مکین کے دم سے ہوتی ہے اس طرح شہر مکہ کو یہ عظمت و رفعت اس لیے نصیب ہوئی کہ وہاں حبیبِ ربِّ دوجہاں اقامت پذیر ہوئے۔ امام خازنؒ فرماتے ہیں۔

فکانه عظم حرمة مكة من اجل انه صلى الله عليه وسلم مقيم بها	پس اللہ تعالیٰ نے مکہ کی عزت و حرمت اس لیے بڑھا دی ہے کہ اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم مقیم ہیں۔

قرآن مجید میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شہرِ جاں نواز اور اس کے گلی کوچوں کی قسم کا کھایا جانا کوئی شاعری نہیں جسے مبالغہ آرائی پر محمول کیا جا سکے بلکہ کلامِ الٰہی ہے اور اسی کی تعلیم قرآن کے ذریعے بندوں کو دی جا رہی ہے۔

بادی النظر میں یہ شہر بھی دوسرے شہروں کی طرح سنگ و خشت سے ہی تعمیر کیا گیا ہے مگر اے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم تیرے وہاں سکونت اختیار کرنے سے اسے وہ عظمت، تقدس اور محبوبیت نصیب ہو گئی ہے کہ وہ میرے نزدیک بھی قسم کھائے جانے کے لائق ہو گیا ہے۔

متعدد کتب سے ثابت ہے کہ حرم مکہ میں بے شمار انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں صاف ظاہر ہے کہ یہ انبیاء دور دراز علاقوں سے ہزار ہا میلوں کی مسافتیں طے کر کے مکہ میں محض اس لیے آئے ہوں گے کہ ان کا مدفن اس زمین پر بنے جسے نبیِّ آخر الزماں کی جائے ولادت اور مسکن ہونے کا شرف حاصل ہونے والا تھا اور انہیں یہ اطلاع بلا شک و شبہ سابقہ آسمانی کتب اور صحائف سے ملی ہو گی کیونکہ پہلی کتابوں میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور جائے ولادت کے تذکرے موجود تھے ان معروضات سے صرف اسی قدر وضاحت مقصود تھی کہ بے شک شہر مکہ کی عظمت میں کعبہ معظمہ، انبیاء کرام کے مقدس مقابر، مقام ابراہیمؑ، مطاف، حجر اسود، صفا و مروہ اور آب زمزم وغیرہ سب کو دخل ہے لیکن ان چیزوں نے شہر مکہ کو اللہ تعالیٰ کی قسم کے لائق نہیں بنایا "لا" کے ذریعے یہی واضح کیا گیا ہے کہ ان تمام نسبتوں کے باوجود میں قسم نہیں کھاتا بلکہ ان سب سے قطع نظر میں اس شہر کی قسم صرف اسی لیے کھا رہا ہوں کہ اے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم اسے تیرے قدموں سے نسبت ہو گئی ہے جس کے مقابلے میں باقی سب نسبتیں ماند پڑ گئی ہیں گویا یہ سب کچھ مکہ میں موجود سہی مگر میں

قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ

ابراہیمؑ نے عرض کیا اے میرے رب! اسے امن والا شہر بنادے اور اس کے باشندوں

اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ

کو طرح طرح کے پھلوں سے نواز (یعنی) ان لوگوں کو جو ان میں سے اللہ پر اور یوم آخرت پر

الْيَوْمِ الْاٰخِرِؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا

ایمان لائے، (اللہ نے) فرمایا اور جو کوئی کفر کرے گا اس کو بھی زندگی کی تھوڑی مدت کیلئے فائدہ پہنچاؤں گا

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٢٦﴾

پھر اسے (اس کے کفر کے باعث) دوزخ کے عذاب کی طرف (جانے پر) مجبور کردوں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

اور (یاد کرو) جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دونوں دعا کر رہے تھے)

اِسْمٰعِيْلُؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ

کہ اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے، بیشک تو خوب سننے والا خوب

الْعَلِيْمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ

جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنے حکم کے سامنے جھکنے والا بنا اور ہماری اولاد سے

ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا

بھی ایک امت کو خاص اپنا تابع فرمان بنا، اور ہمیں ہماری عبادت (اور حج کے) قواعد بتادے

وَ تُبْ عَلَيْنَاۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾

اور ہم پر (رحمت و مغفرت) کی نظر فرما، بیشک تو ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا

اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول مبعوث فرما جو ان پر تیری

پھر بھی اس شہر کی قسم نہیں کھاتا بلکہ محض اس لیے کھاتا ہوں کہ تُو یہاں مقیم ہے۔

(۲۳۰) خانہ کعبہ کو پاک رکھنے کا حکم۔

(۲۳۱) طواف، اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کی فضیلت۔

ف۔"اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ" میرا گھر پاک رکھو کے حکم سے اہلِ معرفت نے صفائے قلب بھی مُراد لیا ہے۔ دل بھی انوارِ الٰہیہ اور فیوضاتِ ربانیہ کا مرکز ہونے کے باعث اللہ کا گھر ہے۔ بندۂ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی نظر اور توجہ کا مقام اور اس کے جلوۂ حُسن کا محل ہے۔

آیت	مضمون
۱۲۶	۲۳۲

مکّہ اور اہلِ مکّہ کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا۔

(۲۳۳) مکّہ معظمہ کا شہرِ امن ہونے کی دُعا۔

(۲۳۴) اہلِ مکّہ کے لئے رزق و ثمرات کی فراوانی کی دُعا۔

(۲۳۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں اہلِ ایمان کی شرط۔

(۲۳۶) دُنیوی رزق اور ثمرات میں کفّار کو بھی شامل کیا جانا۔

(۲۳۷) اُخروی ثمرات میں کفّار کے لئے کوئی حصّہ نہیں۔

آیت	مضمون
۱۲۷	۲۳۸

تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی پہلی دُعا اور حضورِ الٰہی میں قبولیت کی استدعا۔

آیت	مضمون
۱۲۸	۲۳۹

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دوسری دُعا۔

(۲۴۰) حضورِ الٰہی میں اپنی فرمانبرداری کی استدعا۔

(۲۴۱) اپنی اولاد میں سے اُمّتِ مسلمہ کے قیام کی استدعا۔

(۲۴۲) مناسکِ حج، تعلیماتِ اسلام کی رہنمائی اور قبولیتِ توبہ کی استدعا۔

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے (کر دانائے راز بنا دے) اور ان

وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾ وَ

(کے نفوس و قلوب) کو خوب پاک صاف کر دے، بیشک تُو ہی غالب حکمت والا ہے۔ اور کون

مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ

ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے دین سے رُوگرداں ہو سوائے اس کے جس نے خود کو مبتلائے

نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ

حماقت کر رکھا ہو، اور بیشک ہم نے انہیں ضرور دنیا میں (بھی) منتخب فرما لیا تھا، اور یقیناً وہ

فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ

آخرت میں (بھی) بلند رتبہ مقرّبین میں ہوں گے۔ اور جب ان کے رب نے ان سے فرمایا

رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾

(میرے سامنے) گردن جھکا دو، تو عرض کرنے لگے میں نے سارے جہانوں کے رب کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ

اور ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب (علیہ السلام) نے بھی (یہی کہا) اے میرے

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا

لڑکو! بیشک اللہ نے تمہارے لئے (یہی) دین (اسلام) پسند فرمایا ہے سو تم (بہرصورت) مسلمان

وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ

رہتے ہوئے ہی مرنا۔ کیا تم (اس وقت) حاضر تھے جب یعقوب (علیہ السلام)

حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

کو موت آئی، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے (انتقال کے)

آیت	مضمون	
۱۲۹	۲۴۳	حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اپنی نسل میں سے بعثتِ محمدی ﷺ کی دعا۔

(۲۴۴) تلاوتِ آیات۔

(۲۴۵) تعلیمِ کتاب۔

(۲۴۶) تعلیمِ حکمت۔

(۲۴۷) تزکیۂ نفوس۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضور علیہ السلام کا خاتم الانبیاء ہونا معلوم تھا اس لئے اپنی اولاد میں سے آپ کی بعثت کی دعا فرمائی۔ امام بغوی عرباض بن ساریہؓ سے اور امام احمد ابو امامہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتم الانبیاء ہونا لکھا جا چکا تھا جب کہ حضرت آدمؑ ابھی تشکیلِ خاکی کے مرحلے میں تھے اور میں بتاؤں گا کہ میرا پہلا امر یعنی میری ولادت و بعثت کا پہلا اشارہ دعائے ابراہیمی اور بشارتِ عیسیٰ ہے اور میری والدہ کا وہ مشاہدہ (یا خواب) جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا تھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے ملکِ شام کے محلات روشن ہو گئے ہیں۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اپنے نسبی تعلق کے شرف کی خاطر اپنی اولاد میں آپ کی ولادت کی دعا مانگی۔ (حاشیہ نمبر ۳۸ صفحہ نمبر ۲۹۸ ملاحظہ فرمائیں)

ف ۱۔ تزکیۂ نفوس کے پیغمبرانہ منصب سے ہی طریقِ صوفیاء کا سنّت ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ اپنی ذرّیت کے حق میں بقا اور برکت کی دُعا سنّتِ ابراہیمی ہے۔ اسی کے تحت مشائخ اپنے سلاسل اور روحانی خانوادوں کی بقا اور ان کے لئے خیر و برکت کی دُعا مانگتے ہیں۔

آیت	مضمون	
۱۳۰	۲۴۸	دینِ ابراہیمی کی ترغیب اور حضرت ابراہیمؑ کی فضیلت۔

(۲۴۹) حضرت ابراہیمؑ کی شانِ اِصطفاء۔

(۲۵۰) آپ کی شانِ صالحیت۔

ملّتِ ابراہیم یعنی دینِ ابراہیم کی قرآنی اِصطلاح سے معلوم ہوا کہ دین و شریعت اور نظامِ اسلام کی نسبت اس پیغمبر

تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـهَكَ وَ

بعد کس کی عبادت کروگے ؟ ، توانہوں کہا ہم آپ کے معبود اور

اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا

آپ کے باپ دادا ابراھیم اور اسماعیل اور اسحٰقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے

وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلۡكَ اُمَّةٌ

جو معبودِ یکتا ہے ، اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے - وہ ایک امت تھی جو

قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ

گزر چکی ، ان کے لئے وہی کچھ ہوگا جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم کماؤ گے ،

وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوۡا

اور تم سے ان کے اعمال کی باز پُرس نہ کی جائے گی - اور (اہلِ کتاب) کہتے ہیں

كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ

یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے ، آپ فرمادیں کہ (نہیں) بلکہ

اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوۡلُوۡۤا

ہم تو (اس) ابراہیمؑ کا دین اختیار کئے ہوئے ہیں جو ہر باطل سے جُدا صرف اللہ کی طرف متوجہ تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے -

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى

(اے مسلمانو !) تم کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اُس (کتاب) پر جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس پر (بھی) جو ابراہیمؑ

اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَ

اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف اتاری

الۡاَسۡبَاطِ وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَاۤ اُوۡتِىَ

گئی اور ان (کتابوں) پر بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو عطا کی گئیں اور (اسی طرح) جو

اور رسول کی طرف کی جاسکتی ہے جو اسے لے کر مبعوث ہوا ہو اسی طرح نظامِ اسلام کے لیے نظامِ مصطفےٰ یا شریعتِ محمدی کے الفاظ کا استعمال کیا جانا جائز ہے اس میں شخصیت پرستی کا شائبہ نہیں ہوتا۔

ف ۱۔ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ سے معلوم ہوا کہ معرفتِ نفس کے بغیر معرفتِ دین ممکن نہیں اور اس کے بغیر معرفتِ حق ممکن نہیں۔ یہ قرآنی فرمان "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ یہاں اشارہ ہے کہ بعض بندوں کا بارگاہِ الوہیت سے خاص طور پر انتخاب ہوتا ہے اور انہیں فیضِ اصطفا کے ذریعے خاص بزرگی سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں مراتبِ قرب بھی عطا ہوتے ہیں۔

آیت ۱۳۱	مضمون ۲۵۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرماں برداری۔

ف۔ یہاں تسلیم و رضا اور تفویض کے مقامات کی طرف اشارہ ہے اس لیے جب سیدنا جبرئیل نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ باری تعالیٰ سے سوال کیجیے تو آپ نے جواباً فرمایا حسبی من سوالی علمه بحالی میرے سوال کرنے سے زیادہ اس کا میرے حال کو جاننا مجھے کافی ہے۔

آیت ۱۳۲	مضمون ۲۵۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت۔

۱۔ دین سے تمسک کی تعلیم۔
۲۔ اسلام کے تشخص کی تلقین۔

آیت ۱۳۳	مضمون ۲۵۳	حضرت یعقوب علیہ السلام کی بنی اسرائیل کے لیے وصیت۔

۱۔ توحید پر قائم رہنے کی تلقین۔
۲۔ معرفتِ الٰہی کا تحقق بھی نسبتِ نبوی سے کرایا گیا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام یہی دریافت کرنا چاہتے تھے کہ میری اولاد اللہ تعالیٰ کو کس طرح پہچانتی ہے۔ سو آپ کے صاحبزادوں نے جواب دیا کہ "ہم آپ کے بعد بھی اسی رب کی عبادت کریں گے جو آپ کا اور دیگر انبیاء کا رب ہے"۔ مقصود یہ تھا کہ ہم اپنے اللہ کو نسبتِ نبوت اور واسطۂ رسالت سے پہچانتے ہیں اور توحید کی یہی شناخت ہی معتبر ہے۔ جو لوگ بارگاہِ الوہیت میں باریابی اور معرفتِ توحید کے لیے نبوت و رسالت کا واسطہ ضروری اور ناگزیر نہیں سمجھتے وہ طریقِ انبیاء اور تعلیمِ قرآنی سے ہٹ گئے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے فقط یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ "ہم اللہ واحد"

النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ

دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے عطا کی گئیں ، ہم ان میں سے کسی ایک (پر بھی ایمان) میں

مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ

فرق نہیں کرتے ، اور ہم اسی (معبودِ واحد) کے فرماں بردار ہیں ۔ پھر اگر وہ (بھی) اسی طرح ایمان لائیں

مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۚ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا

جیسے تم اس پر ایمان لائے ہو تو وہ (واقعی) ہدایت پا جائیں گے ، اور اگر وہ منہ پھیرلیں تو (سمجھ لیں کہ)

هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ

وہ محض مخالفت میں ہیں ، پس اب اللہ آپ کو ان کے شر سے بچانے کے لئے کافی ہوگا ، اور وہ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ

خوب سننے والا جاننے والا ہے ۔ (کہہ دو ہم) اللہ کے رنگ (میں رنگے گئے ہیں) اور کس کا رنگ اللہ

مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ

کے رنگ سے بہتر ہے ، اور ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں ۔ فرما دیں

أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا

کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا (بھی) رب ہے اور تمہارا (بھی) رب ہے ،

أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾

اور ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں اور ہم تو خالصۃً اسی کے ہو چکے ہیں ۔

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ

(اے اہلِ کتاب !) کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ

اور یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے ، فرما دیں

کی عبادت کریں گے۔ مگر یوں نہیں کہا پہلے فرمایا۔ نعبد الٰھک والٰہ آبائک ۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ تعلق توحید میں بھی نبوی نسبت کو برقرار رکھیں گے۔ اسی واسطہ سے اللہ کو پہچانیں گے۔

۲۔ امتِ مسلمہ کو اپنے تشخص کی تعلیم اسلام کے نام پر دی گئی ہے۔

آیت	مضمون	
۱۳۴	۲۵۴	ہر ایک کا عمل اسی کے لیے ہے دوسرے سے باز پرس نہ ہو گی۔

آیت	مضمون	
۱۳۵	۲۵۵	اہل کتاب کی دعوتِ یہودیت و نصرانیت کی دعوت ہے۔

(۲۵۶) قرآن کی دعوت ملّتِ ابراہیمی کی دعوت ہے۔

(۲۵۷) دعوتِ ابراہیمی۔ عقیدۂ توحید اور ترکِ شرک ہے۔

آیت	مضمون	
۱۳۶	۲۵۸	اسلام کا تصورِ ہمہ گیریت۔

۱۔ تمام پیغمبروں پر اصلاً یکساں ایمان لانا۔

۲۔ ان کی وحی اور معجزوں کی تصدیق میں کوئی تفریق نہ کرنا۔

۳۔ اسلام ہی کو اپنا ملی تشخص سمجھنا۔

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بعض دوسرے الہامی مذاہب کے پیروکاروں کی طرح اپنے پیروکاروں کو بعض انبیاء کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ تمام انبیاء و رسل کو ماننے کو اسلام کا بنیادی فریضہ قرار دیتا ہے۔ اور کسی ایک کے انکار کی صورت میں بھی بقیہ اقرار و تصدیق کو ایمان قرار نہیں دیتا۔ یہ اسلام کا ہمہ گیر کردار آج دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتا۔

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآنی زبان میں دوسرے انبیاء پر (خواہ وہ دیگر مذاہب کے بانی ہی تصور کیے جاتے ہوں) ایمان لانے کا حکم دینا حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوی عظمت اور اسلام کی تعلیمی وسعت کا عظیم آئینہ دار ہے۔

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ

کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ؟ ، اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اس

كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے (کتاب میں موجود) ہے اور اللہ تمہارے

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا

کاموں سے بے خبر نہیں - وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی ، جو اس نے کمایا وہ

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا ۱۶

اس کے لئے تھا اور جو تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہوگا اور تم سے ان کے اعمال کی

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ع ۱۷

نسبت نہیں پوچھا جائے گا۔ ۱۷

آیت	مضمون	
۱۳۷	۲۵۹	اہلِ کتاب کے ایمان لانے اور نہ لانے کا انجام۔

(۲۶۰) مُسلمانوں سے وعدۂ کفایت اور باری تعالیٰ کے اسمائے صفاتی کے ذریعے یقین دہانی۔

آیت	مضمون	
۱۳۸	۲۶۱	۱۔ اللہ کے صِفاتی پَرتو کا بیان۔

۲- ایمان وطاعت اور تسلیم و رضائے الٰہی سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔

۳- تجلّیاتِ الٰہیہ کا پَرتو عبادت و بندگی کے بغیر مُیسّر نہیں آتا۔

ف- صبغۃ اللہ مومنین کا اخلاقِ الٰہیہ سے متخلق ہونا ہے۔ اس میں باری تعالیٰ کی مظہریتِ خاصہ کا بیان ہے جو اہل اللہ کو نصیب ہوتی ہے۔

حُضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مظہریتِ ذاتی حاصل ہوئی۔ دیگر تمام انبیاءؑ کو مظہریتِ صفاتی۔ اولیاء کرام اور مومنین و صالحین کو مظہریتِ اسمائی اور دیگر مخلوقات کو مظہریتِ افعالی۔ یہ مظہریتِ عامّہ ہے اور اوپر کی تین اقسام مظہریتِ خاصّہ میں سے ہیں۔

مظہریتِ الٰہیہ کا رنگ ہر کسی کو اس کے حسبِ حال نصیب ہوتا ہے!

آیت	مضمون	
۱۳۹	۲۶۲	اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑے کی ممانعت۔ وُہ سب کا رَبّ ہے۔

(۲۶۳) ہر ایک کے لیے اُس کے اعمال کا بدلہ ہے۔

(۲۶۴) بندگی و عبادت میں اخلاص کی ضرورت۔

ف- اخلاص۔ بندگی میں نہایت اہم مقام ہے۔ اسی سے جملہ فیوضات کے دروازے کُھلتے ہیں۔

مضمون ۲۶۵	آیت ۱۴۰

اُنبیاءِ سابقین سے متعلق اہلِ کتاب کے عقیدۂ فاسدہ کی تردید۔

(۲۶۶) شانِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بیان، اللہ کی گواہی "شہادۃ من اللہ" ہے۔

(۲۶۷) سابقہ آسمانی کُتب میں بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارتوں کو چُھپانے پر وعید۔

(۲۶۸) شانِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چُھپانے والے سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

مضمون ۲۶۹	آیت ۱۴۱

آباء واجداد کے اعمال کی جزا و سزا ان کیلئے ہوگی اور ہمارے اعمال کی جزا و سزا ہمارے لیے۔

ف۔ محض بزرگوں کی نیکیوں پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسے آجکل "صاحبزادگی" میں ہونے لگا ہے۔

(۲۷۰) نجاتِ اُخروی کا مدار صحتِ عقیدہ اور عمل صالح پر ہے۔ دونوں پر توجہ ہونی چاہیئے۔

الربع

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ

اَب بیوقوف لوگ یہ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو اپنے اس قبلہ (بیت المقدس) سے کس نے پھیر دیا

الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ

جس پر وہ (پہلے سے) تھے، آپ فرما دیں مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کے لئے ہے،

یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ

وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اور (اے مسلمانو!) اسی طرح

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ

ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ)

وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ

رسول تم پر گواہ ہو، اور آپ پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے صرف اس لئے

الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ

مقرر کیا تھا کہ ہم (پرکھ کر) ظاہر کر دیں کہ کون (ہمارے) رسول کی پیروی

یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی

کرتا ہے (اور) کون اپنے اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے، اور بیشک یہ (قبلہ کا بدلنا) بڑی بھاری بات

الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ

تھی مگر ان پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت (و معرفت) سے نوازا، اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ تمہارا ایمان (یونہی)

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ

ضائع کر دے، بیشک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والا مہربان ہے۔ (اے حبیب!) ہم بار بار آپ کے

وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ

رُخِ انور کا آسمان کی طرف پلٹنا دیکھ رہے ہیں، سو ہم ضرور بالضرور آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے

مضمون	آیت
۲۷۱	۱۴۲

تحویلِ قبلہ پر یہود کا اعتراض اور اسکا جواب۔

(۲۷۲) عملِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنے والے بے وقوف ہیں۔

(۲۷۳) قرآنی معیارِ دانش فقط اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

(۲۷۴) مشرق ومغرب کی سب جہات کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا۔

(۲۷۵) ہدایت کا مشیّتِ الٰہی پر انحصار۔

(۲۷۶) ہدایت رسم کی پیروی سے نہیں۔ امر کی پیروی سے متعلق ہے۔

مضمون	آیت
۲۷۷	۱۴۳

اُمّتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت۔

(۲۷۸) اُمّتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ، راہِ اعتدال ہے۔

(۲۷۹) اُمّتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نوعِ انسانی پر گواہ اور نگران ہونا۔

(۲۸۰) حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمّت پر گواہ اور نگرانِ حال ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باری تعالیٰ کے عطا کردہ علم اور نورِ نبوت سے ہر امتی کے اعمال واحوال، اخلاص ونفاق اور ایمانی کیفیات سے آگاہ ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن اُمّت کے حق میں آپ کی گواہی حتمی اور قطعی طور پر مقبول ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّت کے لیے معدّل اور مزکّی ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی گواہی سے اُمّتِ محمّدیہ بھی مقبول الشہادۃ قرار پائے گی۔

(۲۸۱) اگر امّت اپنے مقامِ افضلیت کو پانا چاہتی ہے تو خود کو نگرانیِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دے دے۔ یہی بارگاہ اُمّت کے لیے مرکزِ فیض ہے۔

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ

جس پر آپ راضی ہیں، پس آپ اپنا رخ ابھی مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیجئے، اور (اے مسلمانو) تم جہاں

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ؕ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

کہیں بھی ہو پس اپنے چہرے اسی کی طرف پھیر لو، اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے، ضرور جانتے ہیں

لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ؕ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

کہ یہ (تحویلِ قبلہ کا حکم) ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اور اللہ ان کاموں سے

عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

بے خبر نہیں جو وہ انجام دے رہے ہیں۔ اور اگر آپ اہلِ کتاب کے پاس ہر ایک نشانی (بھی) لے آئیں

بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ

تب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے، اور نہ آپ ہی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں،

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتے، (امت کی تعلیم کے لئے فرمایا) اور اگر (بفرضِ محال)

أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا

آپ نے (بھی) اپنے پاس علم آجانے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو بیشک آپ (اپنی جان پر) زیادتی

لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا

کرنے والوں سے ہو جائیں گے۔ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس رسول (آخر الزماں حضرت محمد ﷺ)

يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ؕ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ

اور ان کی شانِ عظمت کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ بلاشبہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور یقیناً انہی میں سے ایک طبقہ

وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ

حق کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔ (اے سننے والے) حق تیرے رب کی طرف سے ہے سو تُو ہرگز شک کرنے

(۲۸۲) تحویلِ قبلہ کا باطنی سبب فقط لوگوں کو ربطِ رسالت کی پختگی اور معرفتِ مقامِ نبوّت میں آزمانا تھا۔

(۲۸۳) آزمائش دو اُمور میں تھی۔

کون بلاچون وچرا اتباعِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہوئے قبلہ بدل لیتا ہے اور کون انکاری ہو کر پچھلے قبلہ کو ہی تھامے رکھتا ہے۔

(۲۸۴) تحویلِ قبلہ کا فیصلہ لوگوں کے لیے بڑا دُشوار امر تھا۔

ایک طرف سابقہ قبلہ سے دیرینہ وابستگی اور معاشرتی عمل کا تاریخی تسلسل تھا۔ اور دوسری طرف حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے کامل وابستگی اور غیر مشروط پیروی۔ اور حکم یہ تھا کہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے نسبت وتعلق کو قبلہ سے نسبت وتعلق پر بھی ترجیح دے گا وہی مومن ہوگا۔

(۲۸۵) ایمان کی اصل پہچان نسبتِ نبوی سے ہے۔ نسبتِ قبلہ سے نہیں۔

عبادت اور سمتِ عبادت بھی تابعیّتِ نبوی میں ہو تو مقبول ہے ورنہ نہیں۔

(۲۸۶) معرفتِ مقامِ محمدّی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی حقیقت میں ہدایتِ الٰہیہ ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام وعظمت کی معرفت جس قدر زیادہ ہوگی ایمان اسی قدر مضبوط ہوگا اور معرفتِ محمدّی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جس قدر کم ہوگی ایمان اسی قدر کمزور ہوگا۔

(۲۸۷) غلامی وپیرویٔ رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف تمسّک بالقبلہ سے بھی ایمان وعمل ضائع ہوجاتے ہیں۔

(۲۸۸) اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر رافت ورحمت۔

حاشیہ نمبر ۳۹، ۴۰ صفحہ نمبر ۴۰۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون
۱۴۴	۲۸۹

تبدیلیِ قبلہ سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شدید آرزو۔

(۲۹۰) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرۂ اقدس کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا اور باری تعالیٰ کا اس کی طرف نگاہِ محبّت فرمانا۔

(۲۹۱) ۱۔ تحویلِ قبلہ کے لیے وعدۂ الٰہی۔

۲۔ بارگاہِ الٰہی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اکرامِ آرزو۔

(۲۹۲) تحویلِ قبلہ کا مقصود فقط رضائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھا۔

(۲۹۳) حضورِ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے تحویلِ قبلہ (خانہ کعبہ کی طرف چہرہ پھیر لینے) کا حکمِ خاص۔

(۲۹۴) جملہ مسلمانوں کے لیے مسجدِ حرام کی طرف مُنہ کر لینے کا حکمِ عام۔

(۲۹۵) تحویلِ قبلہ کی حقانیّت۔

(۲۹۶) یہود کو تحویلِ قبلہ کی حقانیّت کی طرف متوجہ کرنے کیلئے تنبیہہ۔

یہاں بارگاہِ الٰہی میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ محبوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قبلۂ اسلام جیسے اہم احکام و شعائرِ دین کے تعین میں بھی رضائے رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خُدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خُدا چاہتا ہے رضائے محمد صلے اللہ علیہ وسلم

حاشیہ نمبر ۱۴ صفحہ نمبر ۴۰۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون
۱۴۵	۲۹۷

پیش گوئی کہ اہلِ کتاب تمام دلائل و معجزات کے باوجود قبلۂ اسلام کی پیروی نہ کریں گے۔

ف : ۱۔ اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود و نصاریٰ تمام تر معجزات و کمالاتِ نبوت اور آسمانی نشانیاں یکجا دیکھ لینے کے باوجود بھی آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے امر اور عمل کو حق نہیں مانیں گے اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کا اختلاف آپ صلے اللہ علیہ وسلم سے مبنی بر مغالطہ نہیں مبنی بر حسد و عناد ہے۔

۲۔ معلوم ہوا جو لوگ حسد، بغض اور عناد کے باعث اختلاف یا مخالفت کرتے ہیں ان کے سامنے دلائل و براہین پیش کرنے اور انہیں اپنی صداقت و حقانیت کا یقین دلانے کا کوئی فائدہ نہیں وہ کبھی بھی حق کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے ان کے اختلاف میں دیانت نہیں خیانت کار فرما ہوتی ہے۔

(۲۹۸) اقوامِ عالم میں جہاتِ قبلہ کا مختلف ہونا۔

(۲۹۹) آپ کی اُمّت کو سمتِ قبلہ میں اہلِ کتاب کی پیروی نہ کرنے کی تاکید۔

خطاب بظاہر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مُراد اُمّت ہے۔ ایسے مقامات پر آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے اُمّت کو شدید تحذیر و تنبیہہ مقصود ہوتی ہے۔

(۳۰۰) علمِ یقینی اور ہدایتِ ربّانی کو چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی ظلم ہے۔

یہاں یہ پہلو بھی سمجھایا جا رہا ہے کہ مخالفین و حاسدین چاہتے ہیں کہ اہلِ حق اپنا کام چھوڑ دیں لہٰذا وہ اس مقصد کے لیے آپ سے کہیں گے کہ ہمارے فلاں فلاں مطالبات پورے کر دیں، ہمیں فلاں فلاں طریقے سے مطمئن کر دیں تو ہم بھی تمہارا ساتھ دینے لگیں گے مگر ان کا یہ کہنا نیک نیتی اور سچائی پر مبنی نہ ہوگا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے کہنے میں آجائیں اور انہیں مطمئن کرنے پر اپنا زور صرف کرنے لگیں تاکہ اہلِ حق انہی کے نامعقول مطالبات کو پورا کرنے میں اُلجھ جائیں اور اپنا اصل کام چھوڑ بیٹھیں۔ اس سے ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ تو کبھی مانیں گے نہیں آپ ان کے مطالبات پر کان نہ دھریں۔ بس آپ اپنا کام کیے جائیں۔

اس میں خدمتِ دین اور احیائے اسلام کا کام کرنے والوں کے لیے بڑی حکیمانہ نصیحت اور عمر بھر کام آنے والی تلقین ہے۔

آیت	مضمون
۱۴۶	۳۰۱

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمانی کتابوں کے ذریعے پہلے ہی سے خوب جانے پہچانے جاتے تھے۔

(۳۰۲) یہودیوں کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد اور عناد۔

ع ۱۷ ۱

الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا

والوں میں سے نہ ہو۔ اور ہر ایک کیلئے توجّہ کی ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف رُخ کرتا ہے،

الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ

پس تم نیکیوں کی طرف پیش قدمی کیا کرو، تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تم سب کو جمع کرلے گا، بیشک اللہ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور تم جدھر سے بھی (سفر پر) نکلو اپنا چہرہ (نماز کے وقت)

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ

مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو، اور یہی تمہارے رب کی طرف سے حق ہے

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔ اور تم جدھر سے بھی (سفر پر) نکلو اپنا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ

چہرہ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو، اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ

ہو سو اپنے چہرے اسی کی سمت پھیر لیا کرو، تاکہ لوگوں کے پاس تم پر اعتراض کرنے کی

حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي

گنجائش نہ رہے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں حد سے بڑھنے والے ہیں، پس تم ان سے مت ڈرو مجھ سے

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا

ڈرا کرو اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں اور تاکہ تم کامل ہدایت پا جاؤ۔ اسی طرح ہم نے تمہارے

فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ

اندر تمہیں میں سے (اپنا) رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں (نفساً و قلباً) پاک

(۳۰۳) شانِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حق اور اُسے چھپانے یا تسلیم نہ کرنے کو کتمانِ حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت وفضیلت اور محاسن وکمالات کا کھلے دل سے اعتراف نہ کرنا اور انہیں دل کھول کر بیان نہ کرنا یہودیوں کا طرزِ عمل اور ان کی خاص معاندانہ ذہنیت ہے۔

۲۔ اس میں عمومی تعلیم یہ ہے کہ بربنائے حسد وعناد حق کا انکار کرنے والے حق کو نہ جانتے ہوئے انکاری نہیں ہوتے بلکہ حق کو خوب جانتے ہوئے حق کو چھپاتے اور انکاری ہوتے ہیں اس لیے انہیں مزید سمجھانے کی نہ کوئی ضرورت ہوتی ہے نہ افادیت۔ (حاشیہ نمبر ۴۲ صفحہ نمبر ۴۰۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

آیت ۱۴۷	مضمون ۳۰۴	نئے قبلہ کے برحق ہونے کی مزید تاکید۔

عمومی تعلیم یہ دی جا رہی ہے کہ حاسدین ومعاندین کی باتیں سُن کر اہلِ حق اور ان کے پیروکار اپنے مشن کی نسبت کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ ہُوا کریں بلکہ اپنا اعتماد ویقین قائم رکھتے ہوئے کام جاری رکھیں۔

آیت ۱۴۸	مضمون ۳۰۵	ہر اُمت کے لیے ایک خاص جہتِ عبادت مقرر ہے۔

(۳۰۶) نیکیوں میں سبقت لینے کا حکم۔

(۳۰۷) سارے جہان والوں کا حشر میں جزا وسزا کے لیے جمع کیا جانا۔

(۳۰۸) اللہ تعالیٰ کا اس پر قادر ہونا۔

ف: ہر ایک کے لیے قبلۂ توجہ ہے۔ کعبہ سمتِ توجہ ہے۔ مقصودِ توجہ نہیں، مقصود فقط ذاتِ حق ہے۔ اے طالبانِ حقیقت! چاہیئے کہ تمہارا چہرہ قبلہ کی طرف ہو اور قلب صاحبِ قبلہ کی طرف۔ تم مادّی قبلہ کی طرف سے قلبی قبلہ کی طرف سفر کرو۔ پھر قلبی قبلہ سے روحی قبلہ کی طرف اور پھر روحی قبلہ سے سِرّی قبلہ کی طرف۔ سبقت لینے اور پیش قدمی کرنے میں اسی سفر کے جاری رکھنے کا اشارہ ہے۔ الغرض ہر مقام ومرتبہ کے لیے قبلۂ توجہ جُدا ہے۔ ہر روح کا ایک منہاج ہے۔ ایک قبلہ اور ایک معراج ہے۔

ارواحِ قدسیہ کے لیے انوارِ صفات کا قبلہ ہے۔ ارواحِ موانسہ کے لیے حسنِ صفات کا قبلہ ہے۔ ارواحِ شائقہ کے لیے انوارِ مشاہدہ کا قبلہ ہے۔ ھُوَ مُوَلِّیْهَا کی صورت میں ہر روح جذبِ عشق کے سمندروں میں غوطہ زن

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا

صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ (اَسرارِ معرفت و حقیقت) سکھاتا ہے

تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا معانقة

جو تم نہ جانتے تھے۔ سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کیا کرو اور میری

تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ ع ۵

ناشکری نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد

وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا

چاہا کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی

لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ

راہ میں مارے جائیں انہیں مت کہا کرو کہ یہ مُردہ ہیں، (وہ مُردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن

لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں۔ اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور

وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ

بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان)

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ

صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں۔ جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں بیشک

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ

ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے پے در پے نوازشیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ

ہو کر اپنے اپنے حسبِ حال اُلوہیت و صمدیت کے خزانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ ارواحِ عرفا کے لیے الگ الگ مطالع اور منابع ہیں اور الگ الگ احوال۔ بعض ارواح، ارواحِ والھات ہیں۔ بعض مونسات، بعض عاشقات، بعض فانیات اور بعض باقیات۔ سب روحیں اپنے الگ الگ چشموں سے شرابِ عشق و معرفت پیتی ہیں اور اپنی اپنی سرشاری کے ساتھ سفر پر گامزن رہتی ہیں۔ بعض کی سرشاری ھولِ انقامات سے ہے۔ بعض کی کشف المشاہدات سے بعض کی بروز المعائنات سے اور بعض کی ادراک المغیبات سے پھر انہیں الگ الگ چشموں سے شرابِ وصال کے جام ملتے ہیں اور وہ سب جمالِ حق میں مستغرق ہو جاتی ہیں۔ یوں اہلِ محبت و معرفت سمتِ قبلہ سے مقصودِ قبلہ تک جا پہنچتے ہیں۔

آیت ۱۴۹	مضمون ۳۰۹

بحالتِ سفر بھی سمتِ قبلہ کی پابندی کا حکم۔

(۳۱۰) حکمِ تحویلِ قبلہ کی حقانیت کا مزید اعلان۔

آیت ۱۵۰	مضمون ۳۱۱

حکمِ تحویلِ قبلہ کی مزید تصریح و تاکید۔

(۳۱۲) تمام مسلمانانِ عالم کے لیے اسی قبلہ کا حکم مکرّر کرنا۔

(۳۱۳) مخالفینِ اسلام کے اسبابِ اعتراض کا رد۔

(۳۱۴) دشمنانِ اسلام سے نہ ڈرنے کی ہدایت

(۳۱۵) صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی ہدایت۔

(۳۱۶) نعمتِ ہدایت صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ساتھ خاص ہے۔

(۳۱۷) باری تعالیٰ کا حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بار بار اظہارِ محبت۔

آیت : ۱۴۲ سے آیت : ۱۵۰ تک تحویلِ قبلہ کے حکم کی تصریحات و تاکیدات پندرہ ۱۵ مرتبہ آئی ہیں۔ ایک ہی حکم کا ایک ہی مقام پر مختلف طریقوں سے یوں بار بار تکرار قرآن مجید میں کسی اور جگہ نہیں ہے۔ مقاماتِ تکرار ملاحظہ ہوں:

۱- آیت : ۱۴۲- سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ (عنقریب یہ بیوقوف لوگ کہیں گے مسلمانوں کو اپنے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا۔)

۲- آیت: ۱۴۳- وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (اور جس جہتِ قبلہ پر آپ پہلے تھے ہم نے اسے صرف اس لیے مقرر کیا کہ جانچیں کہ کون رسول کے تابع رہتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔)

۳- آیت: ۱۴۳- وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (قبلہ کی تبدیلی بڑی دشوار بات تھی مگر ہدایت اور معرفت والوں کے لیے آسان ہو گئی) گویا جو مقامِ نبوت کی معرفت سے بہرہ یاب ہو گئے تھے سمجھ گئے کہ سمتِ قبلہ سے ہمارا اپنا تعلق ہی کیا ہے۔ ہمارا کام تو فقط اتنا ہے کہ جدھر محبوب کا چہرہ مُبارک پھرے وہی سمت قبلۂ اسلام ہے ہم بھی اُدھر ہی پھر جائیں۔

۴- آیت: ۱۴۳- وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (اور اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ تمہارے ایمان ضائع ہو جائیں اگر تم رسول سے تمسک کے بجائے سابقہ قبلہ سے تمسک کرتے تو تمہارا ایمان ضائع ہو جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے تم پر رحم فرماتے ہوئے تمہیں توفیق دے دی کہ تم نے سمتِ قبلہ کی بجائے سمتِ رسول اپنائی۔ سو تمہارا ایمان بھی بچ گیا اور قبلہ بھی قائم رہا۔ اگر تم سمتِ رسول کے بجائے سمتِ قبلہ اپنا لیتے تو نہ تمہارا ایمان بچتا اور نہ قبلہ ہی قائم رہتا۔ چنانچہ رسول کا ہو جانے میں ایمان بھی ہے قبلہ بھی۔ مگر قبلہ کا ہونے میں نہ ایمان ہے نہ قبلہ۔

۵- آیت: ۱۴۴- فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا (ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ جس پر آپ راضی ہیں۔)

۶- آیت: ۱۴۴- فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (پس اپنا چہرۂ مُبارک مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیجیے۔)

۷- آیت: ۱۴۴- فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ (اے مُسلمانو تم بھی اپنے چہرے قبلۂ مکرم کی طرف پھیر لو)

۸- آیت: ۱۴۴- أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (بے شک تحویلِ قبلہ کا یہ حکم ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔)

۹- آیت: ۱۴۵- مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ (یہ یہودی آپ کے نئے مقرر کردہ قبلہ کی ہرگز پیروی نہ کریں گے)

۱۰- آیت: ۱۴۵- وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ (اور آپ بھی ان کے قبلہ کی "جس سے آپ نے رُخ پھیر لیا ہے" پیروی کرنے والے نہیں۔)

۱۱- آیت: ۱۴۸- وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (اور ہر ایک کے لیے ایک جہتِ قبلہ مقرر ہے جدھر وہ متوجہ ہوتا ہے) اب آپ کی اُمت کے لیے وہی جہتِ قبلہ مقرر ہو گئی ہے جس پر آپ راضی تھے۔

۱۲- آیت : ۱۴۹- وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اور آپ جہاں بھی تشریف لے جائیں چہرہ مبارک مسجدِ حرام کی سمت کر لیا کریں)

۱۳- آیت : ۱۴۹- وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ (اور یہ تحویل قبلہ کا حکم آپ کے رب کی طرف سے حق ہے)

۱۴- آیت : ۱۵۰- وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اور آپ جہاں بھی تشریف لے جائیں اپنا چہرہ مبارک مسجد حرام کی طرف کر لیا کریں)

۱۵- آیت : ۱۵۰- وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (اور اے مسلمانو! تم جہاں بھی ہوا کرو اسی سمت اپنے چہرے پھیر لیا کرو)

ایک ہی حکم کی پندرہ بار تصریح و تاکید کیوں؟ حالانکہ صرف ایک مرتبہ حکم دینے سے بھی نفس ابلاغ پورا ہو سکتا تھا۔ یہ سارا تکرار مضمونِ محبت ہے کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبدیلی قبلہ کی شدید آرزو میں اپنا چہرہ اقدس بار بار آسمان کی طرف اُٹھایا تھا" قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ " (تقلب بار بار پلٹنے کو کہتے ہیں) اور اس سے پہلے دشمنوں کے طعنے بھی کب سے سنتے چلے آ رہے تھے۔ اسی لیے محبوب کی دلجوئی اور آپ سے اظہارِ محبت کی خاطر باری تعالیٰ نے بھی بار بار تاکیدات کے ساتھ اس حکم کو دُہرایا تاکہ ہر بار تحویلِ قبلہ کا حکم سُن کر محبوب کے دل کو تسکین ہو طبیعت میں خوشی پیدا ہو۔ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شدّتِ آرزو کا خوب اکرام ہو اور اپنوں پرایوں سب کے سامنے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے کمالِ محبت کا اظہار ہو۔ (مزید تفصیل کے لیے حواشی ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون
۱۵۱	۳/۸

تصدیقِ رسالتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم -

حاشیہ نمبر ۴۲ صفحہ نمبر ۴۰۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۳۱۹) رسالتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تربیتی منہاج -

۱- تلاوتِ آیات
۲- تزکیۂ نفوس
۳- تعلیم کتاب
۴- تعلیمِ حکمت
۵- تعلیمِ اسرار و معارف

ف : ۱- انوارِ تلاوت سے باطن میں اُجالا ہوتا ہے اس سے ظلماتِ نفس پر آگاہی ہوتی ہے اور دل میں تزکیہ و تصفیہ کی طلبِ صادق پیدا ہوتی ہے۔ تزکیہ سے نفس کی بیماریوں کا علاج اور تصفیہ سے قلب کے وساوس، خطرات اور

تعلقات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ نتیجۃً سینہ اور قلب علومِ ربّانی اور معارفِ صمدانی کے ورود کے لائق بنتے ہیں۔ پھر تعلیماتِ قرآنی کا روحانی فیض اور حکمت و دانائی کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ حکمت و دانائی کے بعد اسرار و معارف لدنّیہ عطا ہوتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ لہٰذا اولیا۔ عرفا جن اسرار و معارف کی زبان میں کلام کرتے ہیں ان کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ اسی مقام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علومِ کتاب و حکمت کے علاوہ اور علوم و معارف بھی ہیں جو صرف خواص کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔ پہلا علم شریعت ہے۔ دوسرا طریقت۔ تیسرا حقیقت اور چوتھا معرفت۔

آیت ۱۵۲	مضمون ۳۲۰

ذکرِ الٰہی کا حکم (بندے کا اللہ کو یاد کرنا)۔

(۳۲۱) اللہ کا جواباً بندے کو یاد کرنا۔

(۳۲۲) شُکرِ الٰہی کا حکم۔

(۳۲۳) ناشُکری کی ممانعت۔

ف: ۱۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میں بندے سے وہی کرتا ہوں جس کا وُہ مجھ سے گمان کرتا ہے۔ جس وقت وُہ مجھے یاد کرتا ہے میں اسے اپنا قُرب خاص اور ہم نشینی عطا فرماتا ہوں اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں بھی اُسے (اپنی شان کے لائق) اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اجتماع میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے اس سے بہتر اجتماع میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وُہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے میں پورا ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔"

۲۔ ذکرِ الٰہی سے بندہ مذکورِ خدا ہو جاتا ہے اس لیے ذکرِ الٰہی سے قلبی تشویش اور اضطراب ختم ہوتا ہے اور سکون و طمانیت نصیب ہوتی ہے اگر ذکرِ الٰہی کا دائمی استحضار ہو تو دائمی سکون کی دولت میسر آتی ہے۔

۳۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت قبولیت اور مقبولیت دونوں میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔

آیت ۱۵۳	مضمون ۳۲۴

استعانت بالصّبر کا حکم۔

(۳۲۵) استعانت بالصّلوٰۃ کا حکم۔

(۳۲۶) صابرین کے لیے معیّتِ الٰہیہ کا خصوصی وعدہ۔

ف۔ صبر میں مجاہدہ ہے اور نماز میں مشاہدہ۔ مجاہدہ کے بغیر ثمرِ مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا اس لیے صبر کو مقدم رکھا گیا ہے۔

آیت	مضمون	
۱۵۴	۲۲۷	شہداء کی فضیلت اور حکم جہاد و قتال کا اشارہ۔

(۲۲۸) شہداء مُردہ نہیں زندہ ہیں۔

(۲۲۹) شہداء کی حیاتِ جاودانی کا عوام کو شعور نہیں۔

ف۔ شُہداء راہِ حق میں جان دے کر حیاتِ انسانی سے فنا پاتے ہیں اور حیاتِ ربانی سے بقاء پاتے ہیں۔ اولیاء اللہ بھی سبیلِ الٰہی میں تلوارِ عشق کے قتیل ہوتے ہیں اور وصالِ الٰہی کے ذریعے حیاتِ دائمی سے بہرہ یاب کیے جاتے ہیں لہٰذا حیاتِ اولیاء حیاتِ شُہداء ہی کی مثل ہوتی ہے جو لوگ روحانی احوال سے بے خبر ہیں انہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اسی طرح حیاتِ انبیاء حیاتِ اولیاء و شہداء سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے ان کو بعد از وصال جسمانی اور روحانی دونوں زندگیاں بدرجۂ اتم میسر ہوتی ہیں۔

آیت	مضمون	
۱۵۵	۲۳۰	آزمائشی مصائب کے مختلف عنوانات

۱۔ ابتلاء بالخوف —— اہلِ ایمان کو خوف و ہراس کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔
۲۔ ابتلاء بالجوع —— اہلِ ایمان کو فقر و فاقہ کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔
۳۔ ابتلاء بنقصِ الاموال —— اہلِ ایمان کو مالی نقصانات کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔
۴۔ ابتلاء بنقصِ الانفس —— اہلِ ایمان کو جانی نقصانات کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔
۵۔ ابتلاء بنقصِ الثمرات —— اہلِ ایمان کو دیگر دُنیوی نعمتوں کے نقصان کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔

(۲۳۱) صبر شعار لوگوں کو بشارت

ف۔ روحانی مجاہدات میں تکالیف و مصائب بھی نافع ہوتے ہیں اور بعض اوقات ترقی کا باعث ہوتے ہیں صبر و استقامت کے ساتھ ان مراحل سے گزرنے کے بعد اعلیٰ منازل کی بشارت ملتی ہے۔

اہل اللہ کے لیے بھی سلوک میں پانچ خوف معتبر ہیں۔

۱۔ خوف النفس —— نفس کی بیماریوں اور آفتوں کا خوف۔ اس میں تزکیۂ نفس کی فکر و تشویش شامل ہے۔

الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ

ہدایت یافتہ ہیں۔ بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں،

اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ

چنانچہ جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان

اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ

دونوں کے (درمیان) چکر لگائے، اور جو شخص اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو یقیناً اللہ (بڑا) قدر شناس

عَلِيْمٌ ﴿١٥٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

(بڑا) خبردار ہے۔ بے شک جو لوگ ہماری نازل کردہ کھلی نشانیوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں

وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ

اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لئے (اپنی) کتاب میں واضح کردیا ہے تو انہی لوگوں پر اللہ لعنت بھیجتا ہے

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿١٥٩﴾ اِلَّا

(یعنی انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے) اور لعنت بھیجنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر

الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ

جو لوگ توبہ کرلیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں اور (حق کو) ظاہر کردیں تو میں (بھی) انہیں معاف

عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

فرمادوں گا، اور میں بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہوں۔ بیشک جنہوں نے (حق کو چھپاکر) کفر کیا

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ

اور اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہی تھے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں

الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٦١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں (گرفتار) رہیں گے،

۲- خوف الشیطان ——— شیطان کے فتنوں اور حملوں کا خوف - اِس میں دُنیا کے فریب اور قلب کے خطرات و تعلقات کے جال بھی شامل ہیں۔

۳- خوف النار ——— دوزخ کے عذاب کا خوف - یہ فی الحقیقت خوفِ آخرت ہے۔

۴- خوف الحجاب والفراق ——— محبوبِ حقیقی کے محجوب ہونے اور اس کی قُربت سے محروم ہونے کا خوف۔ یہ خوفِ صحبت و جمال ہے۔

۵- خوف التعظیم والجلال ——— باری تعالیٰ کی بُزرگی اور کبریائی کا خوف - یہ خوفِ عظمت و جلال ہے۔

آیت ۱۵۶	مضمون ۳۲۲	صبر والوں کا ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھنا۔

آیت ۱۵۷	مضمون ۳۲۳	صبر کرنے والوں پر اُلوہی نوازشات۔

۱- صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ - اللہ کی خصوصی نوازشات و برکات۔
۲- رَحْمَةٌ - اللہ کی خصوصی رحمتیں۔
۳- هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ - اللہ کی طرف سے خصوصی ہدایت اور کامیابی کی نعمتیں۔

آیت ۱۵۸	مضمون ۳۲۴	صفا و مروہ کا شعائر اللہ ہونا۔

(۳۲۵) حج اور عمرہ، دونوں میں صفا و مروہ کی سعی کا حکم۔

(۳۲۶) اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نیکی کی قدر دانی۔

ف - ۱- حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں صفا و مروہ پر بار بار چڑھیں اور ان کے درمیان دوڑیں۔ ان کے اسی اضطراری فعل کی نسبت سے صفا و مروہ، شعائر اللہ قرار پائے اور ان کے درمیان سعی حج اور عمرہ کا رُکن قرار پائی - اسی دوران حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پیاس کی شدت میں اپنی ایڑیاں رگڑیں۔ باری تعالیٰ نے ان کے لیے پانی کا چشمہ پیدا فرما دیا، وہی آبِ زمزم قرار پایا۔ معلوم ہوا کہ جن مقامات کو انبیاء و اولیاء کے قدموں سے بھی نسبت ہو وہ عند اللہ مقبول و متبرک قرار دیے جاتے ہیں اور ان کا شمار شعائر اللہ (اللہ کی نشانیوں) میں ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے یادِ الٰہی کی نعمت میسر آتی ہے پھر جہاں انبیاء کرام اور اولیاء عظام خود محوِ استراحت ہوں ان جگہوں کی برکت و مقبولیت کا عالم کیا ہو گا۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اور ان پر سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی ۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ

اور تمہارا معبود خدائے واحد ہے ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) نہایت مہربان بہت

الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ ع ۲۱

رحم فرمانے والا ہے ۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کی گردش میں اور

اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي

ان جہازوں (اور کشتیوں) میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی

الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ

چیزیں اٹھا کر چلتی ہیں اور اس (بارش) کے پانی میں جسے اللہ آسمان کی طرف سے اتارتا ہے

مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا

پھر اس کے ذریعے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرتا ہے (وہ زمین) جس میں اس نے

مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ

ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں ، اور ہواؤں کے رُخ بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان

الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

اور زمین کے درمیان (حکمِ الٰہی کا) پابند (ہو کر چلتا) ہے (ان میں) عقلمندوں کے لئے (قدرتِ الٰہی کی بہت سی)

يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ

نشانیاں ہیں ۔ اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے غیروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے

اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

ہیں اور ان سے "اللہ سے محبت" جیسی محبت کرتے ہیں ، اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر)

۲ - اشاراتِ معرفت میں صفا و مروہ حجاباتِ کہ ہیں، کہ حجاب حرم ہے۔ حرم حجاب بیت ہے اور بیت اللہ حجاب حضرتِ الوہیت ہے حجاب کے ذریعے محبوب کی راہ ملتی ہے۔

۳ - اہلِ سلوک کے نزدیک صفا مسندِ عارفین ہے اور مروہ مسندِ زاہدین۔

۴ - بعض نے صفا سے رُوح کا اشارہ مُراد لیا ہے اور مروہ سے قلب کا۔

۵ - سیدنا جعفرِ صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صفا رُوح کا مخالفتِ حق کے میل سے پاک ہونا ہے اور مروہ، نفس کا خدمتِ حق میں قائم ہونا ہے۔

آیت ۱۵۹	مضمون ۳۲۷	اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو چُھپانے والوں کی مذمّت۔

(۳۲۸) حق کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انکار باعثِ لعنت ہے۔

ف - اس میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت اور آپ کی شانِ اقدس کو چُھپانے والوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ علومِ معاملہ دوسروں سے نہیں چُھپانے چاہئیں ان کا بتانا تعلیمِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے حکم میں ہے البتہ علومِ مکاشفہ کا چُھپانا حق ہے۔

آیت ۱۶۰	مضمون ۳۲۹	قبولیتِ توبہ اور رحمتِ الٰہیہ کی شرائط۔

۱ - توبہ ——— ندامت اور اعترافِ خطاء۔

۲ - اصلاح ——— نیت اور عمل کی درستگی۔

۳ - بیانِ حق ——— حق بات کو تسلیم اور بیان کرنا۔

آیت ۱۶۱	مضمون ۳۳۰	کُفر پر مرنے والوں کی سزا۔

کتمانِ حق اور انکارِ حق کرنے والے رحمتِ الٰہیہ سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

آیت ۱۶۲	مضمون ۳۳۱	مُنکرینِ حق کی محرومی اور بدبختی دائمی ہے۔

ان پر عذاب شروع ہو جانے کے بعد نہ تخفیف ہوگی نہ مہلت۔

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ

اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں ۔ اور اگر یہ ظالم (وہ وقت دنیا ہی میں دیکھ لیتے) کہ جب (اخروی) عذاب ان کی آنکھوں

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

کے سامنے ہوگا (تو جان لیتے) کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے (تو کبھی شرک نہ کرتے) اور بیشک اللہ سخت عذاب

الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ

دینے والا ہے ۔ (اور) جب وہ (پیشوایانِ کفر) جن کی پیروی کی گئی اپنے پیروکاروں سے بیزار ہوں گے اور (وہ

اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

سب اللہ کا) عذاب دیکھ لیں گے اور سارے اسباب ان سے منقطع ہو جائیں گے ۔ اور

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ

(یہ بیزاری دیکھ کر مشرک) پیروکار کہیں گے کاش ہمیں (دنیا میں جانے کا) ایک موقع مل جائے تو ہم (بھی) ان سے

كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ

بیزاری ظاہر کریں جیسے انہوں نے (آج) ہم سے بیزاری ظاہر کی ہے ، یوں اللہ انہیں ان کے اپنے اعمال انہی پر حسرت

عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يٰۤاَيُّهَا

بنا کر دکھائے گا ، اور وہ (کسی صورت بھی) دوزخ سے نکلنے نہ پائیں گے ۔ اے لوگو! زمین کی چیزوں

النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا

میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہے کھاؤ ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا

نہ چلو ، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۔ وہ تمہیں بدی اور بے حیائی

يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ

کا ہی حکم دیتا ہے اور یہ (بھی) کہ تم اللہ کی نسبت وہ کچھ کہو جس کا تمہیں (خود)

آیت ۱۶۳	مضمون ۳۴۲	اللہ کی توحید اور صفاتِ رحمت کا بیان۔

آیت ۱۶۴	مضمون ۳۴۳	عجائبِ خلقت اور دلائل الوہیت کا بیان۔

۱۔ زمین اور آسمان کی تخلیق۔

۲۔ گردشِ لیل و نہار۔

۳۔ دریاؤں اور سمندروں میں جہازوں اور کشتیوں کا چلنا۔

۴۔ ان کا لوگوں کو نفع پہنچانا۔

۵۔ آسمان کی طرف سے بارش کا برسایا جانا۔

۶۔ بارش کے ذریعے خشک زمینوں کا شاداب ہونا۔

۷۔ زمین میں مختلف الاقسام جانوروں کا پیدا کیا جانا۔

۸۔ ہواؤں کے رُخ کا وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہنا۔

۹۔ بادلوں کا زمین و آسمان کے درمیان اپنی خدمت کی انجام دہی پر مامور رہنا۔

اہلِ عقل کو قدرتِ الٰہیہ کی ان نشانیوں میں غور و خوض کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ ان نشانیوں سے اس کا نشان پائیں اور اسکی ہستی پر ایمان لائیں۔

آیت ۱۶۵	مضمون ۳۴۴	کافروں کا غیر اللہ سے اور مسلمانوں کا اللہ سے محبت کرنا۔

(۳۴۵) اہلِ ایمان کی علامت اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہے۔

ف ۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اَشَدُّ حُبًّا (بہت ہی شدید محبت) کا حکم آیا ہے۔ سو دیگر اولیاء و صالحین اور دوسروں کے لیے محبت مطلقاً ممنوع نہیں اور نہ ہی وہ محبتِ الٰہی کے منافی ہے بلکہ دونوں میں درجہ کا فرق ہے۔

(۳۴۶) غیر اللہ سے اللہ جیسی محبت کرنے پر کافروں کو زجر و توبیخ۔

(۳۴۷) تمام تر قوت کا مالک اللہ ہے۔

(۳۴۸) اللہ تعالیٰ کی گرفت اور سزا بہت سخت ہے۔

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ

علم نہ ہو - اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اسکی

اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَ

پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی (روش) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اگرچہ

لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾

ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پر ہوں - ان کافروں

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا

(کو ہدایت کی طرف بلانے) کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کسی ایسے (جانور) کو پکارے

لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ

جو سوائے پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا، یہ لوگ بہرے گونگے اندھے ہیں

فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ

اور انہیں کوئی سمجھ نہیں - اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ

طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ

جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کی

تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ

بندگی بجا لاتے ہو - اس نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر

وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ

ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے

اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ

نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں،

آیت ۱۶۶	مضمون ۳۴۹	کافروں سے قیامت کے دن اُن کے پیشواؤں کی بیزاری۔

(۳۵۰) قیامت کے دن کافروں کے تمام اسباب و تعلقات کا منقطع ہو جانا۔

اس سے یہ اخذ ہوا کہ روزِ قیامت باری تعالیٰ اہلِ ایمان کے لیے شفاعت و بخشش کے اسباب اور تعلقات کو برقرار رکھے گا یہ محرومی صرف کفّار و مشرکین اور منکرین و ظالمین کے لیے ہوگی نہ کہ مومنین کے لیے۔

آیت ۱۶۷	مضمون ۳۵۱	کافروں کی حسرت اور پشیمانی۔

آیت ۱۶۸	مضمون ۳۵۲	رزقِ حلال کھانے کا حکم۔

(۳۵۳) شیطان کی پیروی کی ممانعت۔

(۳۵۴) شیطان کی انسان سے صریح دشمنی۔

آیت ۱۶۹	مضمون ۳۵۵	شیطان درج ذیل طریقوں سے انسان دشمنی کرتا ہے۔

۱۔ امر بالسوء۔ برائی پر آمادہ کرتا ہے۔

۲۔ امر بالفحشاء۔ بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے۔

۳۔ امر بالبہتان۔ بہتان تراشی کرواتا ہے۔

ہمیں ہر وقت اپنے اعمال پر نگاہ رکھنی چاہیئے کہ کہیں شیطان کا حملہ تو نہیں ہوگیا۔

آیت ۱۷۰	مضمون ۳۵۶	منکرین کا اتباعِ قرآن سے انکار۔

(۳۵۷) منکرین کا آباؤ اجداد کی پیروی پر اصرار۔

(۳۵۸) آباؤ اجداد کی پیروی اور تقلید صرف اس وقت ممنوع ہے جب وہ صاحبانِ دانش اور ہدایت یافتہ نہ ہوں۔

معلوم ہوا کہ اگر اسلاف اہلِ دانش اور صاحبانِ ہدایت ہوں تو اُن کی پیروی ممنوع نہیں۔ اسی بنا پر بزرگانِ دین اور ائمۂ اُمّت کے طریقوں پر چلنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ

بیشک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے ۔ بیشک جو لوگ کتاب (تورات کی اُن آیتوں) کو جو اللہ نے نازل

اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ

فرمائی ہیں، چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے حقیر قیمت حاصل کرتے ہیں وہ لوگ سوائے اپنے

مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ

پیٹوں میں آگ بھرنے کے کچھ نہیں کھاتے اور اللہ قیامت کے روز ان سے

اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کلام تک نہیں فرمائے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک

اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى

عذاب ہے ۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور مغفرت

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

کے بدلے عذاب، کس چیز نے انہیں (دوزخ کی) آگ پر صبر کرنے والا بنا دیا ہے

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی، اور بیشک جنہوں نے کتاب

اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾ لَيْسَ

میں اختلاف ڈالا وہ مخالفت میں (حق سے) بہت دُور (جا پڑے) ہیں ۔ نیکی صرف

الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ

یہی نہیں کہ تم اپنے مُنہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی

الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی)

آیت ۱۷۱	مضمون ۳۵۹	کفّار کی گمراہ کن پیروی کی مثال۔

آیت ۱۷۲	مضمون ۳۶۰	اکلِ طیّب کا حکم۔

(۳۶۱) شکرِ الٰہی کی بجاآوری کا حکم۔

(۳۶۲) اخلاص فی العبادت کا حکم۔

ف ۔ کبھی بعض مخصوص حلال اور طیب غذاؤں کے کھانے سے محبت و شکرِ الٰہی اور عبادتِ الٰہی کے ذوق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۷۳	مضمون ۳۶۳	بعض محرّمات کا بیان۔

۱ ۔ مُردار

۲ ۔ خُون ۔ (بہنے والا خُون)

۳ ۔ خنزیر کا گوشت

۴ ۔ وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

بعض لوگ اولیاءِ کرام کے ایصالِ ثواب کے لیے پکائے جانے والے کھانوں کو بھی غلطی سے اس حکم کے تحت سمجھتے اور ناجائز گردانتے ہیں۔ حالانکہ "وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" سے مُراد صرف وُہ جانور ہیں جو کُفّار و مُشرکین لات و مَنات، عُزّٰی اور ہبل ایسے بتوں کے نام پر ذبح کرتے اور بوقتِ ذبح باآوازِ بُلند ان بُتوں کے نام پکارتے تھے۔ قرآن مجید نے ایسے جانوروں کا کھانا حرام قرار دیا اور اس کی جگہ فقط تکبیر کے ساتھ ذبح کرنے کا حکم صادر فرمایا یہ مشرکانہ فعل تھا۔ اگر آج بھی کوئی شخص تکبیر کی جگہ اسی طرح غیر اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرے تو اس کا کھانا حرام ہوگا۔ تمام متقدمین اسلاف اور آئمہ تفسیر نے یہی معنی مُراد لیا ہے بزرگوں کے عُرسوں اور ان کے ختم والیصالِ ثواب کے کھانوں پر اس آیت کا اطلاق درست نہیں

(۳۶۴) اضطراری حالت میں استثنٰی کی رعایت دی گئی ہے۔

(۳۶۵) استثنائے اضطراری کی تین شرائط ہیں۔

۱ ۔ انتہائی بے بسی کی حالت ہو۔

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ

کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے ، اور اللہ کی محبت میں (اپنا) مال

عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور محتاجوں پر اور مسافروں پر اور مانگنے والوں

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَ

پر اور (غلاموں کی) گردنوں (کو آزاد کرانے) میں خرچ کرے ، اور نماز

اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

قائم کرے اور زکوٰۃ دے ، اور جب کوئی وعدہ کریں تو اپنا وعدہ

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ

پورا کرنے والے ہوں ، اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدت

حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ

(جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں ، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیزگار

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ

ہیں ۔ اے ایمان والو! تم پر ان کے خون کا بدلہ (قصاص) فرض کیا گیا ہے جو

الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

ناحق قتل کئے جائیں ، آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور

وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ

عورت کے بدلے عورت ، پھر اگر اس کو (یعنی قاتل کو) اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے

فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

کچھ (یعنی قصاص) معاف کردیا جائے تو چاہیے کہ بھلے دستور کے موافق پیروی کی جائے اور (خون بہا کو) اچھے طریقے سے اس

۲- نافرمانی کا ارادہ نہ ہو۔ (طلبِ لذت نہ ہو)

۳- کفایتِ ضرورت سے نہ بڑھے (محض شدید حاجت کے پورا ہونے پر اکتفا کرے یعنی زندگی بچانے سے زائد نہ ہو)

(۳۶۶) ان شرائط کی پابندی کے ساتھ نظریۂ ضرورت درست ہے۔ شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں قرآن کی صریح مخالفت تصور ہوگی اور فعل حرام ہوگا۔

مضمون ۳۶۷	آیت ۱۷۴

آیاتِ الٰہی چھپانے کی مذمت۔ اس سے مراد بھی یہود کا صفات و کمالاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا چھپانا ہے۔

(۳۶۸) دین کو دنیا کی حقیر قیمت کے بدلے بیچنے کی مذمت۔

(۳۶۹) کتمانِ حق اور دین فروشی کی سزا نارِ جہنم ہے۔

(۳۷۰) دین فروشوں سے روزِ قیامت بھی اللہ تعالیٰ ہمکلام نہ ہوگا۔

(۳۷۱) دین فروش گناہوں کی آلودگیوں سے بھی پاک نہیں ہوں گے۔

(۳۷۲) دین فروشوں کے لیے دردناک عذاب۔

ف- معلوم ہوا کہ بعض اعمال اس قدر قبیح ہوتے ہیں کہ اگر ان کا ارتکاب جاری ہے تو طبیعتیں نہ گناہوں سے پاک ہوتی ہیں اور نہ کوشش کے باوجود نیکی ان کے اندر قرار پکڑتی ہے۔

مضمون ۳۷۳	آیت ۱۷۵

دین فروشی، ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنا ہے۔

(۳۷۴) دین فروشی، مغفرت کے بدلے عذاب خریدنا ہے۔

تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ

(مقتول کے وارث) تک پہنچا دیا جائے، یہ تمہارے رب کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے۔ پس جو کوئی اس کے

ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ

بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لئے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں

حَيٰوةٌ يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ

ہی زندگی (کی ضمانت) ہے اے عقلمند لوگو! تاکہ تم (خونریزی اور بربادی سے) بچو۔ تم پر فرض کیا جاتا

عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ

ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آپہنچے اگر اس نے کچھ مال چھوڑا ہو، تو

ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

(اپنے) والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں بھلے طریقے سے وصیت کرے، یہ

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ

پرہیزگاروں پر لازم ہے۔ پھر جس شخص نے اس (وصیت) کو سننے کے بعد اسے

فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ

بدل دیا تو اس کا گناہ انہی بدلنے والوں پر ہے، بیشک اللہ بڑا سننے

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا

والا خوب جاننے والا ہے۔ پس اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے (کسی کی)

اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ

طرفداری یا (کسی کے حق میں) زیادتی کا اندیشہ ہو پھر وہ ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ

بیشک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو! تم پر اسی طرح روزے فرض کئے گئے ہیں

آیت ۱۷۶ | مضمون ۲۷۵ — کتابِ الٰہی میں اختلاف پیدا کرنے کی مذمت۔

(۳۷۶) ضد کے باعث انسان کا حق وصواب سے محروم ہوجانا۔

(۳۷۷) کتابِ الٰہی کا نزول حق ہے۔

آیت ۱۷۷ | مضمون ۲۷۸ — بِرّ (نیکی) کا قرآنی تصوّر۔ محض مشرق ومغرب کا گرویدہ ہونا نیکی نہیں بلکہ مشرقین ومغربین کے ربّ کی معرفت نیکی کی حقیقت ہے۔

(۳۷۹) نیکی کا پہلا عنصر۔ ایمان ہے۔

(۳۸۰) ایمان کے بنیادی ارکان۔

۱- ایمان باللہ
۲- ایمان بالآخرت
۳- ایمان بالملائکہ
۴- ایمان بالکتب
۵- ایمان بالرسل

(۳۸۱) نیکی کا دوسرا عنصر۔ حبِ الٰہی میں ایتائے مال ہے اس سے مراد "انفاق فی سبیل اللہ ہے"۔

(۳۸۲) بنیادی مصارفِ خیر درج ذیل ہیں۔

۱- قریبی رشتہ دار
۲- یتامیٰ
۳- مساکین (محتاج وبے سہارا لوگ)
۴- مسافر

۵۔ مستحق سائلین

۶۔ غلاموں کی آزادی اور بحالی

(۳۸۳) نیکی کا تیسرا عنصر ــــــ اقامتِ صلوٰۃ ہے۔

(۳۸۴) نیکی کا چوتھا عنصر ــــــ ایتائے زکوٰۃ ہے۔

(۳۸۵) نیکی کا پانچواں عنصر ــــــ ایفائے عہد ہے۔

(۳۸۶) نیکی کا چھٹا عنصر ــــــ مصیبت اور تکلیف میں صبر ہے۔

(۳۸۷) نیکی کا ساتواں عنصر ــــــ حالتِ جنگ و جہاد میں صبر ہے۔

(۳۸۸) نیکی کا آٹھواں عنصر ــــــ صداقت و راست بازی ہے۔

(۳۸۹) نیکی کا نواں عنصر ــــــ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

مذکورہ بالا امور سے درج ذیل تین چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ صحتِ عقیدہ ــــــ عقائد کا صحیح ہونا۔

۲۔ صحتِ عمل ــــــ اعمال کا صحیح ہونا۔

۳۔ صحتِ معاملہ ــــــ اخلاق کا اچھا ہونا۔

انہی تین اقسام سے بر اور نیکی کا تصور عبارت ہے۔ اسلام میں نیکی کا تصور عیسائیت کی طرح راہبانہ نہیں بلکہ جامع ہمہ گیر اور عملی ہے قرآن مجید کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نیکی اور دینداری کسی جزوی عمل کا نام نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کی کلیّت (Totality) ہے جس کی جھلک زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں نظر آنی چاہیئے۔ گویا حقیقی نیکی زندگی میں کامل انقلاب بپا کرنے کا نام ہے اگر زندگی میں نیکی داخل ہو جائے تو پھر اس زندگی کے کسی گوشے میں بدی کے باقی رہنے کا جواز نہیں رہے۔

آیت	مضمون
۱۷۸	۳۹۰

قتلِ عمد میں قصاص کا حکم ـــــ خون کا بدلہ خون ہے۔

آزاد کے بدلے آزاد

غلام کے بدلے غلام

عورت کے بدلے عورت

جو قاتل ہو سزائے قتل میں وہی قتل کیا جائے گا۔

(۳۹۱) قتلِ عمد میں دیت (خون بہا) کا حکم بھی ہے (اگر ورثا رآمادہ ہو جائیں)

(۳۹۲) قتلِ عمد میں خون بہا کا تقاضا اور حُسنِ ادائیگی کا حکم۔

(۳۹۳) دیت، حکمِ قصاص میں تخفیف و رعایت ہے۔

(۳۹۴) حکم سے تجاوز کرنے والوں کی سزا

آیت	مضمون
۱۷۹	۳۹۵

قانونِ قصاص تحفظِ زندگی کا ضامن ہے۔

۱ - قانونِ قصاص انسانی برابری اور مساوات کا ضامن ہے۔

۲ - قانونِ قصاص خونریزی کے خاتمے کا ضامن ہے۔

۳ - قانونِ قصاص قومی زندگی کی غیرت مندانہ بقاء کا ضامن ہے۔

۴ - قانونِ قصاص میں انقلابی زندگی کا راز مُضمر ہے۔

ف ۔ قصاص میں حیات کا قاعدہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ فنا میں ہی بقاء ہے۔
سالک خواصِ ناسوتی سے فانی ہو کر خواصِ ملکوتی میں باقی ہوتا ہے۔ اور خواصِ ملکوتی سے فانی ہو کر خواصِ جبروتی ولاہوتی میں باقی ہوتا ہے۔

ع تا فنا نشوی رہ نمی بری بہ بقا

آیت	مضمون
۱۸۰	۳۹۶

وصیّت کے احکام

۱ - وصیت کا واجب ہونا

الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

(یہ) گنتی کے چند دن (ہیں) پس اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر

مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى

ہو تو دوسرے دنوں (کے روزوں) سے گنتی پوری کرلے، اور جنہیں اس کی طاقت

الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ

نہ ہو ان کے ذمے ایک مسکین کے کھانے کا بدلہ ہے۔ پھر جو کوئی اپنی خوشی

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ

سے (زیادہ) نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے، اور تمہارا روزہ رکھ لینا تمہارے لئے بہتر ہے

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ

اگر تمہیں سمجھ ہو ۔ رمضان کا مہینہ (وہ ہے) جس میں قرآن اُتارا گیا ہے جو لوگوں کے

الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَ

لئے ہدایت ہے اور (جس میں) رہنمائی کرنے والی اور (حق و باطل میں) امتیاز کرنے

الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ

والی واضح نشانیاں ہیں، پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پالے تو وہ اس کے روزے ضرور

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ

رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں (کے روزوں) سے گنتی پوری

أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

کرے، اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا،

۲۔ والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کا حکم۔

۳۔ وصیت کا پرہیزگاروں پر لازم ہونا۔

سورۃ النساء کی آیاتِ میراث نازل ہونے کے بعد وجوبِ وصیت اور والدین اور دیگر ورثاء کے حق میں حکمِ وصیت منسوخ ہوگیا۔ مگر غیر ورثاء کے حق میں باقی رہا اور وجوب، اباحت یا استحباب سے بدل گیا۔ البتہ بعض استحقاق اور ضروری معاملات (جیسے یتیم پوتا وغیرہ) میں حکمِ وجوب سے لازمی وصیت کے سرکاری قانون کا استنباط و اجراء بھی ہوسکتا ہے۔

ف۔ معلوم ہوا کہ مالداری (بشرطیکہ حلال ذرائع پر مبنی ہو) منافیٔ تقوی نہیں۔ اس لیے کئی صحابہ کرام اور اولیائے عظام جو کمالِ تقوی کے حامل تھے۔ مالدار بھی تھے۔ مثلاً سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ، حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رضی اللہ عنہ، اور خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم۔ اہل اللہ کی مالداری ان کے دلوں کو یادِ الٰہی سے غافل اور دُنیا میں شاغل نہیں کرتی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"

آیت	مضمون	
۱۸۱	۳۹۷	وصیت بدل ڈالنے والے کے لیے وعید۔

آیت	مضمون	
۱۸۲	۳۹۸	صحتِ وصیت کے عمومی تقاضے۔

۱۔ وصیت کسی وارث کی طرفداری کے لیے نہ ہو۔

۲۔ وصیت کسی وارث کی حق تلفی کے لیے نہ ہو۔

۳۔ وصیت خاندانی یا معاشرتی ناچاقیوں کا باعث نہ ہو۔

۴۔ ایسی صورت میں مصالحت کی ہدایت۔

مضمون ۳۹۹	آیت ۱۸۳

روزوں کی فرضیت۔

(۴۰۰) روزوں کا مقصد تقویٰ ہے۔

ف۔ ۱۔ روحانی ترقی کے لیے مجاہدات ضروری ہیں۔

۲۔ مجاہدات کے خصوصی ثمرات، فوائد اور مقاصد کا بیان کر دینا بھی درست ہوتا ہے تاکہ عامل کے سامنے عمل اور مقصد دونوں رہیں۔

۳۔ روزے تضعیفِ شہوات، تزکیۂ نفس اور تنویرِ باطن کے لیے خاص اثر رکھتے ہیں۔

۴۔ روزوں سے اخلاص، للّٰہیت اور صبر و شکر میں اضافہ ہوتا ہے۔

۵۔ روزوں سے سالک کو ملکوتی صفات میسّر آتی ہیں۔ اس لیے صوفیاء و اولیاء کثرت سے ان کا نفلی اہتمام جاری رکھتے ہیں۔

(۴۰۱) روزے کے لیے گنتی کے دن ہیں۔

مضمون ۴۰۲	آیت ۱۸۴

مریض اور مُسافر کے لیے رعایتی احکام۔

وُہ اپنے قضا روزوں کی تکمیل کسی اور مہینہ میں کرلیں۔

(۴۰۳) کمزوروں اور معذوروں کے لیے حکم فدیہ۔

(۴۰۴) نفلی نیکی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی۔

ف۔ عشاق کے لیے اشارہ محبت ہے۔ زندگی گنتی کے چند دن ہے شہواتِ دُنیا سے پرہیز کرلو، لذاتِ نفسانی سے روزہ رکھ لو۔ جلد ہی اپنے دیدار سے تمہاری افطاری کراؤں گا، اپنے وصال سے تمہیں فرحت بخشوں گا اور اپنے قُرب خاص سے تمہیں راحت و سُرور عطا کروں گا۔

آیت ۱۸۵ | مضمون | رمضان ماہِ نزولِ قرآن ہے۔

(۴۰۵) قرآن ـــــ ھدًی لِلنّاس ہے یہ بنی نوعِ انسان کے لیے ہدایت عام ہے۔

(۴۰۶) قرآن ـــــ بیّنٰتٍ من الھدٰی ہے اسمیں ہدایت کی نشانیاں ہیں۔

(۴۰۷) قرآن ـــــ فرقان ہے۔ یہ حق و باطل میں بنائے امتیاز ہے۔

(۴۰۸) ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت۔

(۴۰۹) مریض اور مُسافر کے لیے رعایتی احکام۔

(۴۱۰) باری تعالیٰ کا ارادۂ یُسر (اللہ تعالیٰ کی جانب سے احکام شریعت میں سہولتیں ہیں)

(۴۱۰) دین میں عدمِ عُسر (عدم حرج اور آسانی) کا تصوّر۔

(۴۱۲) مقررہ شمار کو پُورا کرنے کا حکم۔

(۴۱۳) ہدایتِ الٰہیہ پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنا۔

(۴۱۴) باری تعالیٰ کی شُکر گُزاری کا حُکم۔

آیت ۱۸۶ | مضمون ۴۱۵ | اللہ تعالیٰ کا بندوں سے قریب ہونا۔

(۴۱۶) قبولیتِ دُعا کا وعدہ۔

(۴۱۷) ایمان اور طاعتِ الٰہی کی ترغیب۔

(۴۱۸) رُشد اور نیک بختی کی راہ کی تلقین۔

ف۔ یہاں اسلوبِ کلام میں چند اشارات ہیں۔

۱۔ "اِذَا سَاَلَکَ" ـــــ اے رسول صلے اللہ علیہ وسلم جب (میرے بندے) آپ سے سوال کریں۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کرسکو اور اس لئے کہ اس نے تمہیں جو ہدایت فرمائی ہے اس پر

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ

اسکی بڑائی بیان کرو اور اسلئے کہ تم شکرگزار بن جاؤ — اور (اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری

فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ

نسبت سوال کریں تو (بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿١٨٦﴾

جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے، پس انہیں چاہیے کہ میری فرمانبرداری اختیار کریں اور مجھ پر (پختہ) یقین رکھیں تاکہ وہ راہ (مراد)

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ

پا جائیں — تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ

وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ

حق میں خیانت کرتے تھے سو اس نے تمہارے حال پر رحم کیا اور تمہیں معاف فرما دیا، پس

عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ

اب (روزوں کی راتوں میں بیشک) ان سے مباشرت کیا کرو اور جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا

اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ

ہے چاہا کرو، اور کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ تم پر صبح کا سفید ڈورا

الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠

(رات کے) سیاہ ڈورے سے (الگ ہو کر) نمایاں ہو جائے، پھر

اوّلاً طالبانِ حق کو درِ رسالت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سائل بنایا گیا ہے۔ گویا حق کے طالب ہو تو پہلے درِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سائل بنو۔ ان ہی سے سوال کرو۔ وہی میری خبریں گے اور مجھ تک پہنچائیں گے۔ معلوم ہُوا کہ وصال الی اللہ کے لیے وسیلہ رسالت آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ناگزیر ہے۔

۲۔ "عِبَادِیْ"۔ میرے بندے وہی ہیں جو سائلانِ بارگاہِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جنہیں میرے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبتِ سائلانہ اور تعلقِ گدایانہ نصیب نہیں وہ میری نسبتِ عبدیت سے بھی محروم ہیں۔

۳۔ "سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ"۔ جب میرے بندے میری نسبت سوال کریں۔

میرے بندوں کو میری ہی تلاش ہوتی ہے۔ یہی ان کی پہچان ہے وہ میرے متعلق ہی پوچھتے پھرتے ہیں کہ اللہ کہاں ملے گا، کیسے ملے گا، کب ملے گا؟ انہیں میری حضوری کی طلب تڑپاتی ہے۔ میرے قرب کی آرزو گرماتی ہے اور میرے دیدار کی تمنّا رُلاتی ہے وہ میرے لیے بے چین پھرتے ہیں مَیں بھی اُن کا منتظر ہوتا ہوں۔

۴۔ "فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ"۔ مَیں ان کے قریب ہوتا ہوں۔ میرے بندو میرے متلاشیو مَیں تم سے دُور نہیں تمہارے قریب ہی ہوں۔ تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اپنے ہی اندر جھانکو، تمہارے دل میں ساکن ہوں۔ تمہاری روحوں میں مضمر ہوں۔ اپنے آپ کو پہچانو، میری معرفت پالو گے پھر اپنے آپ سے الگ ہو جاؤ۔ مجھے پالو گے۔ تمہاری ہستی ہی تمہارے اور میرے درمیان حجاب ہے۔ اس حجابِ غیریت کو ہٹاؤ میرا جلوۂ حسن آشکار ہو جائے گا

حاشیہ نمبر ۴۴ صفحہ نمبر ۴۰۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

آیت	مضمون	
۱۸۷	۱۹/۴	روزوں کی راتوں کے احکام۔

(۴۲۰) شبِ ہائے صیام میں وظیفۂ زوجیت کی اجازت ہے۔

(۴۲۱) حقوقِ زوجیت میں مرد و زن کی یکسانیت۔

میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے لیے پردہ و زینت ہیں۔

(۴۲۲) وظیفۂ زوجیت کی سابقہ ممانعت کی منسوخی اور خطاکاروں کی معافی۔

(۴۲۳) وظیفۂ زوجیت کا مقصدِ خیر۔

(۴۲۴) اوقاتِ صوم کی تحدید و تعیین۔

(۴۲۵) مساجد میں اعتکاف کے احکام۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ

روزہ رات (کی آمد) تک پورا کرو، اور عورتوں سے اس دوران شب باشی

وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

نہ کیا کرو جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو، یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدیں

فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

ہیں پس ان (کے توڑنے) کے نزدیک نہ جاؤ، اسی طرح اللہ لوگوں کے لئے اپنی آیتیں (کھول کر)

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٨٧﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں - اور تم ایک دوسرے کے مال آپس میں ناحق نہ کھایا کرو

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ

اور نہ مال کو (بطور رشوت) حاکموں تک پہنچایا کرو کہ یوں لوگوں کے مال کا کچھ حصہ تم (بھی) ناجائز طریقے

النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٨﴾ ع يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ ع

سے کھا سکو حالانکہ تمہارے علم میں ہو (کہ یہ گناہ ہے) - (اے حبیب) لوگ آپ سے

الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ

نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، فرمادیں یہ لوگوں کے لئے اور ماہِ حج (کے تعین) کے لئے وقت کی علامتیں

الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

ہیں، اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم (حالتِ احرام میں) گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی تو (ایسی اُلٹی

مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا

رسموں کی بجائے) پرہیزگاری اختیار کرنا ہے، اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾ وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

رہو تاکہ تم فلاح پاؤ - اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ

(۴۲۶) دورانِ اعتکاف گھروں میں بیویوں کے ساتھ شب باشی کی ممانعت

(۴۲۷) حدودِ الٰہی نہ توڑنے کا حکم۔

(۴۲۸) تبیینِ آیات کا مقصد تلقینِ تقوٰی ہے۔

آیت	مضمون	
۱۸۸	۴۲۹	ایک دوسرے کا مال ناحق کھانے کی ممانعت۔

(۴۳۰) رشوت کی ممانعت۔

اپنا مال حاکموں کو نہ کھلاؤ۔

(۴۳۱) دوسروں کے مال سے ناجائز حصے وصول کرنے کی ممانعت۔

(۴۳۲) کسی کا مال کھانے کے لیے اسے ناحق مقدمہ بازی میں اُلجھانے کی ممانعت

آیت	مضمون	
۱۸۹	۴۳۳	نئے چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کی حکمت۔

(۴۳۴) چاند کا عوام الناس کے لیے پیمانۂ وقت ہونا۔

(۴۳۵) چاند کا زمانۂ حج معلوم کرنے کا ذریعہ ہونا۔

سوال بے مقصد تفصیلات سے متعلق تھا جواب مُختصر اور حکیمانہ دیا گیا ہے۔ اس آیت کا تعلیمی پہلو یہ ہے کہ بے مقصد سوالات کی تفصیلات میں جانے سے اجتناب کیا جائے۔

(۴۳۶) بحالتِ احرام گھر میں داخل ہونے کے جاہلانہ دستور کی تردید۔

(۴۳۷) اسلام کے آدابِ معاشرت کا بجا لانا بھی نیکی اور تقوٰی ہے۔

(۴۳۸) تقوٰی اور پرہیزگاری ہی ذریعۂ فلاح ہے۔

الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

کرتے ہیں (ہاں) مگر حد سے نہ بڑھو، بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند

الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ

نہیں فرماتا ۔ اور (دورانِ جنگ ان) کافروں کو جہاں بھی پاؤ مار ڈالو اور

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ

انہیں وہاں سے باہر نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل

مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

سے بھی زیادہ سخت (جرم) ہے، اور ان سے مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) کے پاس جنگ نہ کرو جب تک

حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ

وہ خود تم سے وہاں جنگ نہ کریں، پھر اگر وہ تم سے قتال کریں تو انہیں قتل کر ڈالو،

كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ

(ایسے) کافروں کی یہی سزا ہے ۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ نہایت

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

بخشنے والا مہربان ہے ۔ اور ان سے جنگ کرتے رہو حتیٰ کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین (یعنی

وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا

زندگی اور بندگی کا نظام عملاً) اللہ ہی کے تابع ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو سوائے ظالموں کے

عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ

کسی پر زیادتی روا نہیں ۔ حرمت والے مہینے کے بدلے حرمت والا مہینہ ہے اور

الْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا

(دیگر) حرمت والی چیزیں ایک دوسرے کا بدل ہیں، پس اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تم بھی اس پر

آیت	مضمون	
۱۹۰	۴۳۹	دفاعی جنگ کا حکم۔

(۴۴۰) زیادتی کی ممانعت اور زیادتی کرنے والوں کو وعید۔

اسلام دفاعی جنگ میں بھی حد سے تجاوز کرنے اور زیادتی کے ارتکاب سے منع فرماتا ہے۔

آیت	مضمون	
۱۹۱	۴۴۱	قتال فی سبیل اللہ کا حکم۔

(۴۴۲) شہر بدری کا بدلہ شہر بدری۔

(۴۴۳) فتنہ پروری، قتل اور خونریزی سے زیادہ بڑا جرم ہے۔

(۴۴۴) مسجدِ حرام کے پاس ازخود جنگ کرنے کی ممانعت۔

(۴۴۵) مسجد حرام کے پاس (بحالتِ مجبوری) مدافعانہ جنگ کی اجازت۔

(۴۴۶) مدافعانہ مقاتلہ کی اجازت۔

آیت	مضمون	
۱۹۲	۴۴۷	فتنہ پروری سے باز آنے والوں کے لیے حکمِ معافی۔

آیت	مضمون	
۱۹۳	۴۴۸	قتال فی سبیل اللہ کا حکم۔

جہاد اور انقلابی جدوجہد دینی فریضہ ہیں۔

(۴۴۹) فتنۂ باطل کے مکمل خاتمہ اور قیامِ امن تک انقلابی جنگ جاری رہنی چاہئے۔

(۴۵۰) غلبہ و نفاذِ دین، جہاد اور انقلابی جنگ کی آخری منزل ہے۔

(۴۵۱) اگر مخالف قوتیں فتنہ پروری سے باز آجائیں تو ان پر سختی نہ کی جائے۔

عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

زیادتی کرو مگر اسی قدر جتنی اس نے تم پر کی، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور

اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩٤﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ

جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے - اور اللہ کی راہ میں خرچ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ

کرو اور اپنے ہی ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور

معانقة

وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٩٥﴾ وَاَتِمُّوا

نیکی اختیار کرو، بیشک اللہ نیکوکاروں سے محبت فرماتا ہے - اور حج اور

الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ

عمرہ (کے مناسک) اللہ کے لئے مکمل کرو، پھر اگر تم (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جو قربانی

مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ

بھی میسر آئے (کرنے کے لئے بھیج دو) اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک قربانی (کا جانور)

الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى

اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے، پھر تم میں سے جو کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو (اس وجہ سے

مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ

قبل از وقت سر منڈوا لے) تو (اس کے) بدلے میں روزے (رکھے) یا صدقہ (دے) یا

نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى

قربانی (کرے)، پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو جو کوئی عمرہ کو حج کے ساتھ ملانے کا فائدہ

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

اٹھائے تو جو بھی قربانی میسر آئے (کرے)، پھر جسے یہ بھی میسر نہ ہو وہ

آیت	مضمون	
۱۹۴	۴۵۲	شعائر اور حرمات کی بے ادبی اور بے حرمتی کا بدلہ لینے کا حکم۔

(۴۵۳) ظلم و زیادتی کا بدلہ لینے کا حکم۔

(۴۵۴) زیادتی کے بدلے میں بھی حد سے تجاوز نہ کیا جائے جس قدر زیادتی ہو۔ اُسی قدر بدلہ لیا جائے۔

(۴۵۵) انتقام اور بدلہ میں بھی تقویٰ کا حکم۔

(۴۵۶) پرہیزگاروں کو معیّتِ الٰہیہ کی نعمت کا میسّر آنا۔

جہاں ذاتی سطح پر ظلم و زیادتی ہو خواہ نوبت قتل تک بھی آ چکی ہو۔ وہاں عفو و درگزر اور معافی کو ترجیح دی گئی ہے مگر یہاں معاملہ دینی اقدار اور اسلامی شعائر کا تھا۔ اس لیے اس سطح پر ظلم و زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنے کی بجائے ان سے بدلہ و انتقام کا حکم ہے اور غلبہ دین تک ان سے جنگ جاری رکھنے کی تلقین ہے۔ آج دینی سطح پر ہماری بے حمیتی کا عالم یہ ہو چکا ہے کہ کوئی ذاتی تکلیف پہنچائے تو اس کا بدلہ لیتے ہیں اور کوئی دین کو گزند پہنچائے، دینی اقدار کو پامال کرے اور اسلامی شعائر کی بے حرمتی کرے تو وہاں عفو و درگزر اور نرم مزاجی کی تلقین کرتے ہیں اور اس روش کو شرافت کا نام دیتے ہیں محض اس لیے کہ دین کا اتنا درد بھی نہیں رہا جتنا اپنی جان و مال کا ہے۔

آیت	مضمون	
۱۹۵	۴۵۷	اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم۔ (انفاق فی سبیل اللہ)

(۴۵۸) ہلاکت سے بچنے کا حکم۔

۱۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور انقلابی مجاہدوں کی امداد نہ کرنا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔

۲۔ بلا سوچے سمجھے بلا ضرورت مال لٹاتے رہنا بھی خودکشی کے مترادف ہے۔

۳۔ مال نیک مقاصد پر خرچ کیا جائے تاکہ انقلابی اور دفاعی قوت محفوظ ہو اور منزل جلد میسر آئے۔

۴۔ مسلمانو! جہاد اور انفاق انہی دو طریقوں میں تمہاری زندگی ہے اور انہیں چھوڑ دینے میں تمہاری موت اور ہلاکت ہے۔ آج ہم ان طریقوں کو چھوڑ کر اپنی ذلت و ہلاکت کا منظر خود دیکھ رہے ہیں۔

۵۔ ہمیں دوبارہ زندہ قوموں کی طرح اُٹھنے یعنی قومی احیاء اور ملی نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی جہاد اور انفاق ہی کی شرائط کو پورا کرنا ہوگا۔

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ

تین دن کے روزے (زمانۂ) حج میں رکھے اور سات جب تم حج سے واپس لوٹو،

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ

یہ پورے دس (روزے) ہوئے، یہ (رعایت) اس کے لئے ہے جس کے اہل وعیال

حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا

مسجدِ حرام کے پاس نہ رہتے ہوں (یعنی جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو)، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور

اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ ع ۸

جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ۔ حج کے چند مہینے معین ہیں (یعنی شوال، ذیقعدہ اور عشرۂ ذی الحجہ)

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ

تو جو شخص ان (مہینوں) میں نیت کرکے (اپنے اوپر) حج لازم کرلے تو حج کے دنوں میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے اور

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ

نہ کوئی (اور) گناہ اور نہ ہی کسی سے جھگڑا کرے، اور تم جو بھلائی بھی کرو اللہ اسے خوب

يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫

جانتا ہے، اور (آخرت کے) سفر کا سامان کرلو بیشک سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے،

وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

اور اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو ۔ اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں

اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ

اگر تم (زمانۂ حج میں تجارت کے ذریعے) اپنے رب کا فضل (بھی) تلاش کرو پھر جب تم عرفات سے

مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪

واپس آؤ تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس اللہ کا ذکر کیا کرو اور اس کا

(۲/۱۹۵) احسان کا حکم۔

(۲/۱۹۵) احسان شعار لوگ محبوبانِ خُدا ہیں۔

آیت	مضمون
۲/۱۹۶	حج اور عمرہ کے احکام۔

(۲/۱۹۶) بصُورت احصار قُربانی کے احکام۔

(۲/۱۹۶) سر منڈوانے کے احکام۔

(۲/۱۹۶) مریض اور معذور کے لیے احکام فدیہ۔

۱: فدیۂ صیام۔

۲- فدیۂ خیرات۔

۳- فدیۂ قربانی۔

(۲/۱۹۶) تمتّع کے احکام (عمرہ اور حج کو ایک ہی سفر میں ملانا)

(۲/۱۹۶) حجِ تمتّع کی قُربانی کے احکام۔

(۲/۱۹۶) غیر مستطیع کا حُکم۔ (دس روزے رکھنا)

۱- تین روزے ایام حج میں

۲- سات روزے ایام حج کے بعد۔

۳- یہ رعایت صرف آفاقی (باہر سے آنے والے حاجیوں) کیلئے ہے مکی (مسجد حرام کے قریب بسنے والوں) کے لیے نہیں۔

(۲/۱۹۶) تقویٰ کا حُکم اور اللہ کی صفتِ قہاری

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ

ذکر اس طرح کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت فرمائی، اور بیشک اس سے پہلے

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

تم بھٹکے ہوئے تھے ۔ پھر تم وہیں سے جاکر واپس آیا کرو جہاں سے (اور)

النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾

لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے (خوب) بخشش طلب کرو، بیشک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ

پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کرچکو تو (منیٰ میں) اللہ کا خوب ذکر کیا کرو جیسے تم

اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ

اپنے باپ دادا کا (بڑے شوق سے) ذکر کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ شدتِ شوق سے (اللہ کا) ذکر کیا کرو، پھر لوگوں میں سے کچھ

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ

ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں (ہی) عطا کردے اور ایسے شخص کے لئے آخرت

خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا

میں کوئی حصہ نہیں ہے ۔ اور انہی میں سے ایسے بھی ہیں جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں

حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾

دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی (سے نواز) اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ

اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کی (نیک) کمائی میں سے حصہ ہے، اور اللہ جلد حساب

الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ

کرنے والا ہے ۔ اور اللہ کو (ان) گنتی کے چند دنوں میں (خوب) یاد کیا کرو، پھر جس

النصف

ف - اس حکم سے یہ تعلیم بھی مقصود ہے کہ ہر وقت صحبت میں رہنے والے باہر سے آنے والوں کے لیے سہولت اور رعایت پیدا کیا کریں اور انہیں حصولِ فیض کا زیادہ موقع دیا کریں اس میں ایثار اور قربانی کی تلقین ہے۔

آیت ۱۹۷	مضمون ۲۶۹

زمانہ حج کا معین ہونا۔

(۲۷۰) زمانہ حج کی خاص محرمات۔

۱- حرمتِ رفث۔ بے ہودہ اور فحش باتوں کا حرام ہونا۔

۲- حرمتِ فسوق۔ حدِ شرع سے تجاوز کرنے کو حرام ہونا۔

۳- حرمتِ جدال۔ لڑائی اور جھگڑے کا حرام ہونا۔

(۲۷۱) اُمورِ خیر کی ترغیب اور شانِ علمِ الٰہی۔

(۲۷۲) سفرِ حج کے دوران زادِ راہ ساتھ لینے کی تاکید۔

(۲۷۳) تقویٰ بہترین زادِ سفر ہے۔

آخرت کے مسافر کے لیے تقویٰ سے بہتر کوئی زادِ سفر اور توشہ نہیں۔

(۲۷۴) دانش مندو! توشۂ تقویٰ ساتھ رکھا کرو۔

ف - معلوم ہوا کہ خواص کے لیے حصولِ تقویٰ کی خاطر اپنے اوپر بعض اُمورِ ریاضت کا غیر معمولی اہتمام و التزام کرنا جائز ہے۔

آیت	مضمون	
۱۹۸	۴۷۵	اثنائے حج تجارت کی اجازت۔

(۴۷۶) وقوفِ عرفات سے فیض یابی کے بعد واپسی۔

(۴۷۷) مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں رُک کر ذکرِ الٰہی کرنا۔

(۴۷۸) ھدایت کے مطابق ذکرِ الٰہی کرنا۔

(۴۷۹) دَورِ جاہلیت کی گمراہی۔

آیت	مضمون	
۱۹۹	۴۸۰	وقوفِ عرفات کی تاکید۔

(۴۸۱) اُمرِ خیر میں عامۃ المسلمین کے ساتھ ہم آہنگی قائم رکھنا۔
اِس میں انسانی مساوات کے تصور کی طرف بھی اشارہ ہے۔

(۴۸۲) استغفار کا حکم اور اُمیدِ بخشش کی یاددھانی۔

آیت	مضمون	
۲۰۰	۴۸۳	مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد کثرتِ ذکرِ الٰہی کی تاکید۔

(۴۸۴) جذبۂ شوق اور شدید والہانہ سرمستیوں سے اللہ کا ذکر کرنا۔

(۴۸۵) محض دُنیا مانگنے والوں کا آخرت کی نعمتوں سے محروم ہونا۔

ف۔ اپنے باپ دادا سے بھی زیادہ رغبت و محبت سے اللہ کو یاد کرنا یُوں ہے کہ اولاد کو باپ کی محبت وشفقت پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ اِسکے تنبیہہ و تادیب کرنے اور مارنے پر بھی دل میں سوءِ ظن پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح بارگاہِ الٰہی کی جانب سے جیسے بھی احوال و حوادث پیش کیے جائیں نہ طبیعت میں ملال ہو نہ عقیدہ میں تزلزل اور نہ یقین میں کمی اور یادِ الٰہی اسی ذوق سے جاری رہے۔

شیخ ابنِ عطا نے فرمایا۔ اللہ کا ذکر زبانوں سے یوں کرو کہ وہ غیر کی تعریف میں متحرک نہ ہوں۔ دلوں سے یوں کرو کہ وہ غیر کے متفکر نہ ہوں۔ ارواح سے یوں کرو کہ وہ اس کے تعلق سے قائم ہو جائیں۔ بیشک انبیاء و اولیاء کا ذکرِ الٰہی اسی شان کا حامل ہوتا ہے۔

آیت ۲۰۱	مضمون ۴۸۶	دُنیا و آخرت دونوں کی بہتری طلب کرنے کی ترغیب۔

(۴۸۷) جامع دُعا کے تین اجزاء۔

۱- دُنیا کی بھلائی

۲- آخرت کی بھلائی

۳- عذابِ جہنّم سے بچاؤ

آیت ۲۰۲	مضمون ۴۸۸	دُنیا اور آخرت کی نعمتوں کے طلبگاروں کو بشارت۔

(۴۸۹) اللہ تعالیٰ کا سَرِیعُ الحساب ہونا۔

آیت ۲۰۳	مضمون ۴۹۰	قیامِ مِنیٰ کے دوران خصُوصیت سے ذکرِ الٰہی کا حُکم۔

(۴۹۱) مِنیٰ سے واپسی میں عُجلت و تاخیر کے احکام۔

۱۲ ذی الحجہ کی شام یا ۱۳ ذی الحجہ کو واپسی کی اجازت۔

(۴۹۲) حج کے بعد تقویٰ و طہارت کی خُو پیدا کرنے کی ترغیب۔

(۴۹۳) آخرت کی یاد دھانی۔

آیت ۲۰۴	مضمون ۴۹۴	مکار لوگوں کا طریقۂ واردات — اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھانا۔

مکّار لوگ دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے اپنے دعووں پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں۔

(۴۹۵) بعض لوگوں کی ظاہری چرب زبانی اور دُنیا داری عوام الناس کیلئے دلکش ہوتی ہے اور وہ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

(۴۹۶) اللہ تعالیٰ کا اعلان کہ ایسے لوگوں کے دلوں میں منافقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ حقیقت میں حق کے شدید دُشمن ہوتے ہیں۔

تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

کسی نے (منیٰ سے واپسی میں) دو ہی دنوں میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ، اور جس نے (اس میں)

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

تاخیر کی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ، یہ اس کے لئے ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے ، اور اللہ سے ڈرتے رہو

اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ

اور جان لو کہ تم سب کو اسی کے پاس جمع کیا جائیگا ۔ اور لوگوں میں کوئی شخص ایسا بھی (ہوتا)

قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا

ہے کہ جس کی گفتگو دنیاوی زندگی میں تجھے اچھی لگتی ہے اور وہ اللہ کو اپنے دل کی بات پر گواہ بھی

فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى

بناتا ہے ، حالانکہ وہ سب سے زیادہ جھگڑالو ہے ۔ اور جب وہ (آپ سے) پھر جاتا ہے

فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ

تو زمین میں (ہر ممکن) بھاگ دوڑ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد انگیزی کرے اور کھیتیاں اور جانیں

النَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ

تباہ کردے ، اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا ۔ اور جب اسے اس (ظلم و فساد پر) کہا

اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ

جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اس کا غرور اسے مزید گناہ پر اکساتا ہے پس اس کے لئے جہنم کافی ہے ،

وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ

اور وہ یقیناً برا ٹھکانہ ہے ۔ اور (اس کے برعکس) لوگوں میں کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے

نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بھی بیچ ڈالتا ہے ، اور اللہ بندوں پر بڑی مہربانی فرمانے والا ہے

۱۔ اہل سرمایہ و اقتدار اور دیگر بالادست طبقات دنیوی وسائل کے سہارے جن میں حکومت اور اس کی مشینری، سرمایہ و دولت اور اس کے ذریعے خریدے ہوئے ایجنٹ، سرکاری و غیر سرکاری ایجنسیاں۔ اخبارات، رسائل و جرائد، صحافتی اور ابلاغیاتی ادارے، الغرض رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے تمام ذرائع کو اپنی حمایت اور حق کی مخالفت میں استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مکر و فریب کے ریاکارانہ نظام کے باعث عوام الناس کو ان کی باتیں، نعرے اور کارکردگی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔

حق دنیوی وسائل کی کمی کی وجہ سے لوگوں تک صحیح انداز اور بھرپور طریقے سے نہیں پہنچ سکتا۔ نتیجتہً عوام صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور حق اور باطل میں، تمیز نہیں کر پاتے اور غلط فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ عصر حاضر میں سرمایہ دارانہ انتخابی نظام، سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اس کے تباہ کن سیاسی نتائج اس حکم قرآنی کی صداقت کے روشن دلائل ہیں۔

۲۔ اہل ایمان کو ان عیاروں کے طریقۂ واردات سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے اور اسے اپنے وعدوں پر گواہ بناتے ہیں۔ مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۳۔ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ — کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ رائے وہی اور فیصلہ وہی کا جو نظام مکر و فریب اور کذب و افتراء کے طریقوں پر مبنی ہوگا اس میں صرف منافقت ہی فروغ پائے گی۔ حق کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے۔

۴۔ ایسی چالوں سے کامیابی چاہنے والے افراد ہمیشہ حق کے دشمن ہوں گے۔ گویا حق کے مخالفوں کو یہی نظام راس آئے گا۔ اور حق کے حامیوں کو یہ نظام نقصان دے گا۔

آیت ۲۰۵	مضمون ۶۹۷

حق کے مخالفین جب عیّاری اور مکّاری سے اپنی بات منوا لیتے ہیں تو:

۱۔ زمین میں فساد انگیزی اور لوٹ مار کرتے ہیں۔

۲۔ کھیتوں یعنی ذرائع پیداوار کو برباد کرتے ہیں۔

۳۔ اور نسلوں کو ذہنی، جسمانی اور اخلاقی و عملی ہر طریقے سے تباہ کرتے ہیں۔ ایسے فتنہ و فساد کے لیے فساد فی الارض، ھلاک الحرث، ھلاک النسل کی تین اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔

(۶۹۸) اللہ تعالیٰ فتنہ و فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہمارے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات ان قرآنی حقائق کی واضح تعبیرات ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّ

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے

لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ

نقش قدم کی پیروی نہ کیا کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن

مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ

ہے۔ پس اگر تم اس کے بعد بھی لغزش کرو جب کہ تمہارے پاس

الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلْ

واضح نشانیاں آچکیں تو جان لو کہ اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے۔ کیا

يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

وہ اسی بات کے منتظر ہیں کہ بادل کے سائبانوں میں اللہ (کا عذاب) آجائے اور

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾ ع

فرشتے بھی (نیچے اتر آئیں) اور (سارا) قصہ تمام ہو جائے، تو سارے کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ

آپ بنی اسرائیل سے پوچھ لیں کہ ہم نے انہیں کتنی واضح نشانیاں عطا کی تھیں، اور

مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ

جو شخص اللہ کی نعمت کو اپنے پاس آجانے کے بعد بدل ڈالے تو بیشک

فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا

اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

آراستہ کر دی گئی ہے اور وہ ایمان والوں سے تمسخر کرتے ہیں، اور

آیت ۲۰۶	مضمون ۴۹۹	ایسے مکّار لوگوں پر نصیحت اثر انداز نہیں ہوتی۔

(۵۰۰) وہ خوفِ خُدا کی تلقین سے اور زیادہ غرُور اور تکبّر میں مُبتلا ہوتے ہیں۔

(۵۰۱) زیادہ غرُور انہیں مزید گناہوں اور نافرمانیوں پر آمادہ کرتا ہے۔

(۵۰۲) بالآخر وہ جہنّم کے بُرے ٹھکانے تک جا پہنچتے ہیں۔

آیت ۲۰۷	مضمون ۵۰۳	حضرتِ صہیب رومیؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

(۵۰۴) رضائے الٰہی کے عوض اپنی جان کا سودا کرنا۔

(۵۰۵) ایسوں پر اللہ تعالیٰ کی خُصوصی عنایات۔

ف۔ یہاں سے رضائے الٰہی میں فنائے نفس (ترکِ خواہشاتِ نفس) کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵۰۶) اسلام کے احکام پر کاملاً عمل کرنے کا حکم۔

آیت ۲۰۸	مضمون ۵۰۷	منسوخ احکام کو مطلقاً ترک کرنے اور شیطان کی پیروی سے باز رہنے کا حکم۔

(۵۰۸) شیطان انسانیت کا کھلا دشمن ہے۔

۱۔ نظامِ اسلام کو جزواً قبول کرنا اور جزواً چھوڑ دینا شیطان کی پیروی ہے۔

۲۔ نظامِ اسلامی میں اپنی مرضی یا مفاد کے پیشِ نظر تبدیلی کرنا بھی شیطان کی پیروی ہے۔ آج ہماری نفس پرستی اور شیطان دوستی کا یہی نتیجہ انفرادی، اجتماعی اور قومی سطح پر واضح دکھائی دے رہا ہے۔

آیت ۲۰۹	مضمون ۵۰۹	تعمیلِ احکام میں لغزش پر وعید۔

آیت ۲۱۰	مضمون ۵۱۰	قبولِ حق کے لیے بے جا مطالبات کی مذمت۔

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ

اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا وہ قیامت کے دن ان پر سربلند ہوں گے، اور اللہ

مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً

جسے چاہتا ہے بے حساب نوازتا ہے۔ (ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی دین پر

وَّاحِدَةً ۣ قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ

جمع تھے، (پھر جب ان میں اختلافات رونما ہوگئے) تو اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈر سنانے

مُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ

والے پیغمبروں کو بھیجا، اور ان کے ساتھ حق پر مبنی کتاب اُتاری تاکہ وہ لوگوں میں

بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ

ان امور کا فیصلہ کر دے جن میں وہ اختلاف کرنے لگے تھے، اور اس میں اختلاف بھی

اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

فقط انہی لوگوں نے کیا جنہیں وہ کتاب دی گئی تھی، باوجود اس کے کہ ان کے پاس واضح نشانیاں

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا

آچکی تھیں (اور انہوں نے یہ اختلاف بھی) محض باہمی بغض و حسد کے باعث (کیا) پھر اللہ نے ایمان والوں کو اپنے حکم سے

فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ

وہ حق کی بات سمجھا دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا

کی طرف ہدایت فرما دیتا ہے۔ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم (یونہی بلا آزمائش)

الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ

جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر تو ابھی ان لوگوں جیسی حالت (ہی) نہیں بیتی جو تم سے پہلے

(۵۱۱) متبعینِ شیطان کو تہدید۔

(۵۱۲) سارے اُمور کا بالآخر اللہ ہی کی طرف لوٹنا۔

اس آیت میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ منکرینِ حق روزِ قیامت کے منتظر ہیں۔

ف۔ ابنِ مردویہ نے حضرت عبداللہ ابنِ مسعود سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن جب تمام اولین و آخرین حساب وکتاب کے منتظر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں عرش سے تجلی فرمائیں گے اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سائبانوں کے ارد گرد ملائکہ ہوں گے۔اس پر بلاتعیین کیفیت ایمان لانا ضروری ہے۔ بنابریں اہلِ معرفت نے کہا کہ باری تعالیٰ بلاکیفیت بعض مخلوقات میں تجلی فرماتا ہے اور ان کے ذریعے اپنا صفاتی جلوہ ظاہر فرماتا ہے۔ جیسے "طور" کے لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ (جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی) اس سے مظہریتِ الٰہیہ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

آیت ۲۱۱	مضمون ۵۱۳	بنی اسرائیل پر نشانیوں اور نعمتوں کی فراوانی کا ذکر۔

(۵۱۴) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بدلنے والے کے لیے سخت سزا کی وعید۔

(۵۱۵) اللہ تعالیٰ کی شانِ قہاریت۔

آیت ۲۱۲	مضمون ۵۱۶	کافروں کی دُنیوی عیش و تنعم پر فریفتگی۔

(۵۱۷) کافروں کا اہلِ ایمان کے فقر و صبر پر مذاق اُڑانا۔

(۵۱۸) حقیقی رفعت و بلندی ظاہری نعمتوں والوں کی نہیں بلکہ اہلِ ایمان و تقویٰ کی ہوگی۔

(۵۱۹) اللہ تعالیٰ کا بے حساب روزی بخشنا۔

ف۔ بعض لوگ ظاہری کرامات اور عنایاتِ الٰہیہ کے ظہور سے خوش ہوتے ہیں کہ ان سے مخلوق میں مقبولیت بڑھتی ہے۔ جبکہ اصل میں بلند درجہ اہلِ استقامت کا ہوتا ہے جو صبر، توکل، رضا اور اخفاء کو ترجیح دیتے ہیں بعض ناسمجھ

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ

گزر چکے، انہیں تو طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور انہیں (اس طرح) ہلا ڈالا گیا کہ (خود) پیغمبر اور

الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ

ان کے ایمان والے ساتھی (بھی) پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ

اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ

ہو جاؤ کہ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ

قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

کریں، فرما دیں جس قدر بھی مال خرچ کرو (درست ہے)، مگر اس کے حقدار تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور محتاج ہیں اور مسافر ہیں، اور جو نیکی بھی تم کرتے

مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ

ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔ (اللہ کی راہ میں) قتال

الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا

تم پر فرض کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں طبعاً ناگوار ہے، اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو

وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ

اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لئے بہتر ہو، اور (یہ بھی) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ (حقیقتاً)

شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾ يَسْئَلُوْنَكَ ع

تمہارے لئے بری ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ لوگ آپ سے

عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ

حرمت والے مہینے میں جنگ کا حکم دریافت کرتے ہیں، فرما دیں اس میں جنگ بڑا گناہ

اِن سے کرامت کا ظہور نہ دیکھ کر ان کی ولایت کا انکار اور ان کے مرتبے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

آیت ۲۱۳	مضمون ۵۲۰

یہ آیت انسانی معاشرے اور ان کے اختلافات کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ ابتداءً تمام انسان ایک مِلّی وحدت کا حصّہ تھے۔

۵۲۱ اغراض وطبائع کے اختلاف کے باعث معاشرے میں باہمی اختلافات رونما ہونے لگے اور پھر نوبت عقائد واعمال کے اختلافات تک پہنچ گئی۔

۵۲۲ اِن اختلافات میں حق کو واضح کرنے کے لیے انبیاء ورسل کو بھیجا گیا۔ اور آسمانی کتابیں اُتاری گئیں۔

۵۲۳ انبیاء کے ساتھ آسمانی کتابیں اُتارنے کا مقصد ان اختلافات میں حق اور باطل کا فیصلہ کرنا تھا۔

۵۲۴ بعض لوگوں نے ضد، تعصّب اور اپنے اپنے مفاد وعناد کے باعث حق کا انکار کیا۔ وہ گمراہ اور کافر ہو گئے۔

۵۲۵ بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہُوئی ہدایت کو قبول کر لیا۔ وہ ہدایت یافتہ مومن ہو گئے۔

۵۲۶ مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ اِنسانی مُعاشرے میں عقائد واعمال کے اختلافات رونما ہو جانے کے بعد حق کو واضح کر دیا جائے۔

مضمون ۵۲۷	آیت ۲۱۴

بلا محنت و آزمائش جنّت نصیب نہیں ہوگی۔

۵۲۸ اہلِ حق کو پہلے مردانِ خدا کی طرح آزمائشی حالتوں میں سے گزرنا ہوگا۔

۵۲۹ پہلے انبیاء و اولیاء کو بھی راہِ حق میں بڑی سختیاں اور تکلیفیں آئیں۔

۵۳۰ اُنہیں ظاہری ناکامی، شہادت، مغلوبیت، ہجرت، بیماری، غُربت اور شکستہ حالی جیسی آزمائشوں میں خُوب جھنجھوڑا گیا۔

۵۳۱ ظاہری حالات کی انتہائی ناسازگاری دیکھ کر بعض پیغمبر اور ان کے ساتھی تک پکار اُٹھے "کہ اللہ کی مدد کب آئے گی"؟

۵۳۲ اس وقت اُنہیں رحمتِ الٰہیہ نے پکارا کہ مدد قریب ہے، ثابت قدم رہو ـــ گویا مددِ الٰہی پر یقین قائم رکھنے کا حکم دیا گیا۔

۱ ـ اہلِ ایمان کو راہِ حق کے انتہائی حوصلہ شکن مصائب میں بھی صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور انہیں ثابت قدمی سے ناسازگاری حالات کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲ ـ حق کی علامت یہ نہیں کہ اسے ظاہراً ناکامی اور پریشانی نہ آئے بلکہ انبیاءِ کرام اور ان کے جلیل القدر اصحاب تک مذکورہ بالا اعصاب شکن مصائب سے دوچار ہوئے اور اس کے برعکس ظاہری حالات کی موافقت کئی بار کفر و باطل کو میسر رہی۔

۳ ـ راہِ حق میں مخالفتوں، اذیتوں اور ظاہری و عارضی ناکامیوں کی نوبت بسا اوقات یہاں تک پہنچ جاتی تھی کہ انبیاء و رسل بھی بارگاہِ الٰہی میں مدد کے لیے بیتابانہ پکار اُٹھتے تھے۔

۴ ـ اہلِ حق کو اسلامی انقلاب اور غلبۂ دین کے جہاد کی راہ میں انتہائی نامساعد حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے۔

۵ ـ باطل، طاغوتی اور استحصالی طاقتوں کا ظاہری غلبہ و تفوّق دیکھ کر حق پر ایمان اور یقین متزلزل نہیں ہونا چاہئیے۔ یہ چیزیں حق و باطل کی پہچان نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی آزمائشیں خود حق کی علامت ہیں۔

آیت	مضمون	
۲۱۵	۵۲۳	حکمِ انفاق اور چھ مصارفِ خیر

۱- والدین ۴- محتاج و مساکین

۲- قریبی رشتہ دار ۵- ضرورت مند مُسافر

۳- یتامیٰ ۶- اُمورِ خیر

(۵۲۴) ہر اَمرِ خیر پر اللہ کی واقفیت اور اس کی ترغیب

آیت	مضمون	
۲۱۶	۵۲۵	جہاد کی فرضیت

(۵۲۶) بعض اوقات تمہاری ناپسندیدہ شئے کی تہہ میں بھلائی اور تمہاری پسندیدہ شئے کی تہہ میں بُرائی ہوتی ہے۔

(۵۲۷) اصل بھلائی اور بُرائی پر اللہ تعالیٰ کی واقفیت ۔اور انسانوں کی نادانی۔

ف -۱- ان حالات میں شرحِ صدر صرف ایمانی قوت اور توکل سے نصیب ہوتا ہے جب انسان درحقیقت اپنے اصل نفع و نقصان سے ہی کماحقہٗ واقف نہیں تو بہتر ہے کہ اس باب میں اَمرِ الٰہی پر بھروسہ اور کامل اعتماد کرے
۲- یہ بھی معلوم ہوا کہ فوائد صرف حالتِ بسط میں ہی نہیں حالتِ قبض میں بھی ہو سکتے ہیں۔

كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَ
ہے، اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ
(خانہ کعبہ) سے روکنا، اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے
عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ
نزدیک (اس سے بھی) بڑا گناہ ہے، اور یہ فتنہ انگیزی قتل و خون سے بھی بڑھ کر ہے، اور یہ (کافر) تم سے
يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا
ہمیشہ جنگ جاری رکھیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر (وہ اتنی) طاقت پا سکیں،
وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ
اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور پھر وہ کافر ہی
كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ
مرے تو ایسے لوگوں کے دنیا و آخرت میں (سب) اعمال برباد ہو جائیں گے، اور
الْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾
یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ
جہاد کیا، یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بڑا بخشنے
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ
والا مہربان ہے۔ آپ سے شراب اور جوئے کی نسبت سوال کرتے ہیں، فرما دیں

آیت	مضمون	
۲۱۷	۵۲۸	حرام مہینوں میں جنگ اور خونریزی کی ممانعت۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔

(۵۲۹) درج ذیل اُمور حرمت والے مہینوں میں جنگ سے بھی زیادہ بڑے گناہ ہیں:

۱۔ اللہ کی راہ سے روکنا۔ (یعنی کسی کو دینِ حق سے برگشتہ کرنا خواہ کوئی طریقہ استعمال کیا جائے)

۲۔ اللہ سے کُفر کرنا۔

۳۔ مسجدِ حرام (یعنی کعبۃ اللہ) جانے سے روکنا۔

۴۔ وہاں کے رہنے والوں کو شہر یا ملک سے نکال دینا۔

(۵۳۰) یہ چاروں اُمور بہت بڑا فتنہ ہیں اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔

(۵۳۱) مُسلمانوں کو دینِ اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کُفار انہیں ہمیشہ حالتِ جنگ میں مُبتلا رکھیں گے۔

(۵۳۲) کُفّار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوگی کہ وہ مُسلمانوں پر اپنا اقتصادی سیاسی اور فوجی تسلّط قائم رکھیں تاکہ وہ کُفار کی محتاجی کے باعث کاملاً دینِ اسلام کی راہ پر نہ چل سکیں اور اپنے دین کو چھوڑے رکھیں۔

آج اُمّت مسلمہ اس امر کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اور "نیو ورلڈ آرڈر" اس قرآنی آیت میں بیان کردہ حقیقت کا عملی ثبوت ہے۔

(۵۳۳) مُرتد کی سزا۔

۱ — اس کے تمام اعمال کا اکارت جانا۔

۲ — اس کا جہنمی ہونا۔

۳ — اس کا ہمیشہ جہنّم میں رہنا۔

معلوم ہُوا کہ مرتد کا کوئی عمل (خواہ ظاہراً کتنا ہی نیک دکھائی دے) مقبول نہیں ہوتا۔ وہ مردود فی الدنیا والآخرۃ ہوتا ہے۔

فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ

ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ (دُنیوی) فائدے بھی ہیں، مگر ان دونوں کا گناہ

مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ

ان کے نفع سے بڑھ کر ہے، اور آپ سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ فرمادیں جو

الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

ضرورت سے زائد ہے (خرچ کردو)، اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتا ہے

تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ

تاکہ تم غور و فکر کرو - (تمہارا غور و فکر) دنیا اور آخرت (دونوں کے معاملات) میں (رہے) اور آپ سے

عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، فرمادیں ان (کے معاملات) کا سنوارنا بہتر ہے، اور اگر انہیں (نفقہ و کاروبار میں)

فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ

اپنے ساتھ ملا لو تو وہ بھی تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ خرابی کرنے والے کو بھلائی کرنے والے سے جدا پہچانتا ہے،

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾ وَ

اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا، بیشک اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے - اور

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

تم مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح مت کرو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، اور بیشک مسلمان لونڈی (آزاد)

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا

مشرک عورت سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں بھلی ہی لگے، اور (مسلمان عورتوں کا) مشرک مردوں سے

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

بھی نکاح نہ کرو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، اور یقیناً مشرک مرد سے مؤمن غلام بہتر ہے

یہاں اہل کفر و طاغوت کے اسلام دشمن عزائم واضح کر کے اُمت مسلمہ کو سخت تنبیہہ کی گئی ہے۔ مسلم رہنماؤں اور حکمرانوں کو اپنی خارجہ پالیسیاں وضع کرتے ہوئے اس قرآنی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے۔ آج عالم اسلام اس حقیقت سے صرفِ نظر کر کے ذلیل و رسوا بھی ہو رہا ہے اور عالمی سطح پر غلبۂ کفر کے باعث اپنا ملی تشخص بھی کھوتا جا رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ !

آیت ۲۱۸	مضمون ۵۴۴	اُمید داریٔ رحمت تین شرائط پر مبنی ہے۔

۱- ایمان۔
۲- ہجرت۔
۳- جہاد فی سبیل اللہ۔

آیت ۲۱۹	مضمون ۵۴۵	شراب اور جوئے کے نقصانات

(۵۴۶) اِن کے بعض ظاہری فوائد کی بناء پر ان کے جواز کی راہ نکالنا صریحاً غلط ہے۔ اِن کے نقصانات مُسلّم ہیں اور فوائد سے بہر صورت زیادہ اور سنگین ہیں۔

حدِ انفاق اور فلسفۂ عفو

۱- ضرورت سے زائد خرچ کر دینے کا حکم
۲- "حکمِ عفو" معاشرے کی اقتصادی ناہمواریاں ختم کرنے اور معاشی و سماجی انقلاب بپا کرنے کے لیے قرآنی بنیاد ہے۔
۳- اسے محض منسوخ حکم قرار دے کر اس سے رہنمائی حاصل نہ کرنا استحصالی سوچ ہے۔
۴- حکمِ عفو سے ایک انقلابی معاشی نظام کی تشکیل کی اُصولی اساس فراہم ہوتی ہے۔
۵- زائد از ضرورت خرچ کر دینے کا حکم قرآنی ہے۔ اس پر اسلام کا اپنا جُداگانہ معاشی نظام استوار کیا گیا ہے۔ اسے اشتراکیت سمجھ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اسلام کی سرمایہ دارانہ تعبیر کرنے والے اس حکم کی اصل روح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ

خواہ وہ تمہیں بھلا ہی لگے، وہ (کافر و مشرک) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں،

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ

اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنی آیتیں

اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾ ع وَيَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ ع ٦٥

لوگوں کے لئے کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور آپ سے حیض

الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى

(ایامِ ماہواری) کی نسبت سوال کرتے ہیں، فرما دیں: وہ نجاست ہے، سو تم حیض کے دنوں میں عورتوں سے

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا

کنارہ کش رہا کرو، اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جایا کرو، اور جب

تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

وہ خوب پاک ہو جائیں تو جس راستے سے اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے ان کے پاس جایا کرو،

يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ

بیشک اللہ بہت توبہ کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور خوب پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ تمہاری عورتیں

حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا

تمہاری کھیتیاں ہیں، پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ، اور اپنے لئے آئندہ کا کچھ سامان

لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ

کرلو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تم اس کے حضور پیش ہونے والے ہو، اور (اے حبیب) آپ اہلِ ایمان

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ

کو خوشخبری سنا دیں (کہ اللہ کے حضور ان کی پیشی بہتر رہے گی)۔ اور اپنی قسموں کے باعث اللہ (کے نام) کو (لوگوں کے ساتھ)

(۵۴۷) توضیح آیات کی غایت تفکر و تدبّر ہے تاکہ اس کے ذریعے نظام کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔

ف۔ عفو (زائد از ضرورت) سے مُراد عرفاء کے نزدیک ماسوی اللہ ہے اسے خرچ کر دینا حقیقت میں محبتِ الٰہی میں ماسوی اللہ کے ہر شغل و تعلق کا ترک ہے۔ یہی کمالِ توحید ہے۔

آیت	مضمون	
۲۲۰	۵۴۸	غور و فکر، دُنیا و آخرت، دونوں اُمور میں رہنا چاہیئے۔

(۵۴۹) یتیموں کے حقُوق کا بیان۔

(۵۵۰) یتیموں کے احوال کی اصلاح کا حکم۔

(۵۵۱) یتیموں کو اپنے ساتھ رکھنا۔

(۵۵۲) اللہ تعالیٰ مفسد اور مصلح دونوں کو پہچانتا ہے۔

(۵۵۳) اللہ تعالیٰ نے احکامِ شرعی میں سخت شرائط نہیں رکھیں۔

(۵۵۴) اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت و حکمت۔

آیت	مضمون	
۲۲۱	۵۵۵	ایمانی غیرت و حمیّت کے چند اہم تقاضے۔

(۵۵۶) مُشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کا حرام ہونا۔

(۵۵۷) محبت الٰہی میں نفس ہر مشرکانہ تعلق سے پاک رہے خواہ وہ تعلق ظاہراً کتنا ہی عزیز اور محبوب تر کیوں نہ ہو۔

(۵۵۸) مُسلمان غُلاموں اور باندیوں کو بھی مُشرکوں سے عزیز جانا جائے۔

أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ

نیکی کرنے اور پرہیزگاری اختیار کرنے اور لوگوں میں صلح کرانے میں آڑ مت بناؤ، اور اللہ خوب

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ

سننے والا بڑا جاننے والا ہے - اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں فرمائے گا مگر ان کا

وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ

ضرور مواخذہ فرمائے گا جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہو، اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت

حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ

حلم والا ہے - اور ان لوگوں کے لئے جو اپنی بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم کھالیں چار ماہ کی مہلت

أَشْهُرٍ ۖ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا

ہے، پس اگر وہ (اس مدت میں) رجوع کریں تو بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے - اور اگر انہوں نے

الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾ وَالْمُطَلَّقَاتُ

طلاق کا پختہ ارادہ کرلیا ہو تو بیشک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے - اور طلاق یافتہ عورتیں

يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ

اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں، اور ان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے

أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ

چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا فرما دیا ہو اگر وہ اللہ پر

يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں، اور اس مدت کے اندر ان کے

بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ

شوہروں کو انہیں (پھر) اپنی زوجیت میں لوٹا لینے کا حق زیادہ ہے اگر وہ اصلاح کا ارادہ کرلیں،

(۵۵۹) مُشرکوں کا بلاوا "دعوۃ الی النار" ہے۔

(۵۶۰) اللہ تعالیٰ کا بلاوا "دعوۃ الی الجنۃ والمغفرۃ" ہے۔

(۵۶۱) توضیح آیات سے حکمت و تذکر حاصل کرنے کی تلقین۔

یہ آیات معاشرے میں اسلام کے ملی تہذیبی اور ثقافتی تشخص کو قائم رکھنے کی اہمیت اور عملی اساس فراہم کرتی ہیں۔

آیت ۲۲۲	مضمون ۵۶۲	حیض طبعی آلائش اور ناپاکی ہے۔

(۵۶۳) ایام حیض میں عورتوں سے مباشرت کی ممانعت۔

(۵۶۴) اللہ تعالیٰ کی توبہ اور طہارت سے محبت۔

ف۔ توابین کو متطہرین پر مقدم رکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے بغیر طہارتِ باطنی ناممکن ہے کیونکہ توبہ "ترکِ جفا" ہے اور طہارت "راہِ وفا"۔ توبہ حقیقی ندامت ہے اور طہارت اساسِ استقامت، توبہ ترکِ خطا ہے اور طہارت بنائے صفا، توبہ ترکِ غفلت ہے اور طہارت نورِ ریاضت اس لیے توابین کی محبوبیت ان کے افعال کے باعث ہے اور متطہرین کی محبوبیت ان کے احوال کے باعث۔

آیت ۲۲۳	مضمون ۵۶۵	بیویوں پر مردوں کے حقوق زوجیت

(۵۶۶) مقاصدِ ازدواج کا بیان

(۵۶۷) اعمالِ خیر کی ترغیب اور تقویٰ کا حکم۔

(۵۶۸) اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خوشخبری۔

ف۔ ۱۔ اہلِ محبت کے لیے اس سے بڑی خبر اور کیا ہے کہ محبوب سے ملاقات ہو گی۔

۲۔ تقویٰ کا کمال اس میں ہے کہ بندہ دیدارِ الٰہی کے خیال میں ہر خیالِ غیر ترک کر دے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جس کے باعث محبوبِ حقیقی کی ناراضگی اور ملاقات کے وقت شرمندگی ہو۔

مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ

اور دستور کے مطابق عورتوں کے بھی مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، البتہ مردوں کو

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ اَلطَّلَاقُ ع ٢٨ ١٢

ان پر فضیلت ہے ، اور اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے ۔ طلاق (صرف) دو بار

مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ

(تک) ہے ، پھر یا تو (بیوی کو) اچھے طریقے سے (زوجیت میں) روک لینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـــًٔا

اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو چیزیں تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو

اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ

سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ (اب رشتۂ زوجیت برقرار رکھتے ہوئے) دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں

اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ

اندیشہ ہو کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، سو (اندریں صورت) ان پر کوئی گناہ نہیں کہ بیوی (خود) کچھ

بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ

بدلہ دے کر (اس تکلیف دہ بندھن سے) آزادی لے لے، یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں پس تم ان سے آگے مت بڑھو، اور

حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا

اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں سو وہی لوگ ظالم ہیں ۔ پھر اگر اس نے (تیسری مرتبہ)

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰي تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ

طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر کے ساتھ نکاح کرے

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ

پھر اگر وہ (دوسرا شوہر) بھی طلاق دے دے تو اب ان دونوں (یعنی پہلے شوہر اور اس عورت) پر کوئی گناہ نہ ہوگا اگر وہ

آیت ۲۲۴	مضمون ۵۶۹	نیکی سے روکنے والی قسم توڑنے کا حکم۔

(۵۷۰) لوگوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک، تقویٰ اور لوگوں میں صلح واصلاح سے روکنے والی قَسمیں ممنوع ہیں۔

آیت ۲۲۵	مضمون ۵۷۱	مختلف النوع قسموں کا بیان۔

(۵۷۲) لَغو اور غیر ارادی قَسموں پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

(۵۷۳) ارادی قَسموں پر مؤاخذہ ہے۔

آیت ۲۲۶	مضمون ۵۷۴	"ایلاء" بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کا بیان۔

(۵۷۵) مُدّتِ ایلاء چار ماہ ہے۔

(۵۷۶) ارادۂ طلاق سے رجوع کرلینے کا حکم اور اُس پر وعدۂ معافی۔

آیت ۲۲۷	مضمون ۵۷۷	طلاقِ ایلاء واقع ہونے کا حُکم۔

آیت ۲۲۸	مضمون ۵۷۸	عدّتِ طلاق تین حیض ہیں۔

بصورتِ طلاق حاملہ ہونے کو چھپانا ممنوع ہے۔

(۵۷۹) طلاق سے رجوع کرلینے کا حُکم۔

(۵۸۰) رجوع ارادۂ اصلاح پر مبنی ہو۔ ارادۂ ایذاء پر نہیں۔

(۵۸۱) عورتوں اور مَردوں کے حقوق میں عادلانہ اور فطری یکسانیت۔

ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

(دوبارہ رشتۂ زوجیت میں) پلٹ جائیں بشرطیکہ دونوں یہ خیال کریں کہ (اب) وہ حدودِ الٰہی قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ کی

يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ

(مقرر کردہ) حدود ہیں جنہیں وہ علم والوں کیلئے بیان فرماتا ہے - اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ

فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ

اپنی عدت (پوری ہونے) کو آپہنچیں تو یا انہیں اچھے طریقے سے (اپنی زوجیت میں) روک لو یا انہیں اچھے طریقے

بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ

سے چھوڑ دو، اور انہیں محض تکلیف دینے کے لئے نہ روکے رکھو کہ (ان پر) زیادتی کرتے رہو

يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ

اور جو کوئی ایسا کرے پس اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا، اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ،

اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ

اور یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر (کی گئی) ہے اور اس کتاب کو جو اس نے

عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا

تم پر نازل فرمائی ہے اور دانائی (کی باتوں) کو (جن کی اس نے تمہیں تعلیم دی ہے) وہ تمہیں (اس امر کی)

اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا

نصیحت فرماتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے - اور جب تم

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت (پوری ہونے) کو آپہنچیں تو جب وہ شرعی دستور کے مطابق باہم

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

رضامند ہو جائیں تو انہیں اپنے (پرانے یا نئے) شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو، اس شخص کو

(۵۸۲) عورتوں پر مردوں کی یک گونہ فضیلت۔

۱۔ اس فضیلت سے عورتوں کے حقوق کی نفی نہ کی جائے ورنہ اُس کے حوالے سے شرفِ نسوانیت کا انکار کیا جائے۔

۲۔ یہ فضیلت محض انتظامِ حیات، تدبیرِ اُمور اور عائلی و معاشرتی نظام کے حُسنِ ترتیب کے لیے ہے۔

آیت	مضمون
۲۲۹	۵۸۳

طلاق رجعی دو طلاقوں تک ہے۔

دو بار تک دی گئی طلاق سے رجوع ممکن ہے۔

(۵۸۴) امساک بالمعروف یا تسریح بالاحسان کی تعلیم۔

۱۔ عورتوں کو رشتۂ زوجیت میں حُسنِ سلوک کے ساتھ رکھنا۔

۲۔ عدمِ موافقت کی صورت میں حُسنِ سلوک کے ساتھ علیحدگی کرنا۔

(۵۸۵) بصورتِ طلاق عورتوں کو دی ہوئی چیزوں (مہر وغیرہ) کے واپس لینے کی ممانعت۔

(۵۸۶) بصورتِ خلع مال واپس لینے کی اجازت۔

(۵۸۷) حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرنے کی ممانعت اور سزا۔

۱۔ اس آیت سے یہ نصیحت ملی کہ ترکِ تعلقات میں عجلت کرنا مناسب نہیں۔ خلافِ مصلحت ہے بعض اوقات ندامت ہوتی ہے۔

۲۔ ترکِ تعلقات کے وقت اچھے تعلقات کا گزرا ہُوا زمانہ یاد رکھنا چاہیئے۔ اور اس زمانے کے لحاظ سے علیحدگی بھی بطریقِ احسن ہونی چاہیئے۔ یہ خوش خلقی اور ایمانداری کا تقاضا ہے۔ گویا ترکِ تعلق میں بھی تعلق کی عمدگی اور شائستگی ملحوظ ہے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

اس امر کی نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہو، یہ

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

تمہارے لئے بہت ستھری اور نہایت پاکیزہ بات ہے، اور اللہ جانتا ہے

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ

اور تم (بہت سی باتوں کو) نہیں جانتے ۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس

حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

تک دودھ پلائیں یہ (حکم) اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے،

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے،

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ

کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے (اور) نہ ماں کو اس کے بچے کے باعث

بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ

نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کے سبب سے، اور وارثوں پر بھی یہی

مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا

حکم عائد ہوگا؛ پھر اگر ماں باپ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے (دو برس سے پہلے ہی)

وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم اپنی اولاد کو (دایہ سے)

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ

دودھ پلوانے کا ارادہ رکھتے ہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ جو تم

آیت ۲۳۰	مضمون ۵۸۸	تیسری بار طلاق دینے سے طلاق کا مغلظہ ہو جانا۔

(۵۸۹) طلاقِ مغلّظہ کی صُورت میں بغیر حلالہ کے رجُوع ممکن نہیں۔

(۵۹۰) حلالہ سے مُراد یہ ہے کہ انقضائے عدّت کے بعد کسی دوسرے شوہر سے نکاح (مباشرت) کیا جائے۔ اگر اسے دوسرا خاوند بھی طلاق دیدے تو اس طلاق کی عدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرے۔

(۵۹۱) محض تحلیل کے لیے نکاح ثانی کا اہتمام کرنا اور منصوبے کے تحت طلاق لینا جائز نہیں۔

(۵۹۲) اس میں حدودِ الٰہیہ کا قائم رکھنا شرط ہے۔

آیت ۲۳۱	مضمون ۵۹۳	دورانِ عدت مطلّقہ عورتوں سے بھی حُسنِ سلوک کا حکم۔

(۵۹۴) ضرر رسانی کے لیے عورت کو نکاح میں روکے رکھنا ظُلم اور آیاتِ الٰہی کا مذاق ہے۔

(۵۹۵) طلاقِ رجعی کی صُورت میں امساکِ معروف یا تسریحِ معروف کا حکم۔

(۵۹۶) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد دہانی۔

(۵۹۷) نزولِ کتاب و حکمت کا مقصد لوگوں کو نصیحت کرنا ہے۔

(۵۹۸) تقویٰ کا حکم اور شانِ علمِ الٰہی کے ذریعے تاکید۔

۱- ظاہراً اچھا کام بھی بُری نیت سے کیا جائے تو مذموم ہوتا ہے۔

۲- تعلق ہو یا ترکِ تعلق ہر عمل میں طہارت و تقویٰ کا خیال رہنا چاہیئے۔

مَآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

دستور کے مطابق دیتے ہو انہیں ادا کردو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان لو کہ بیشک

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ

جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ اور تم میں سے جو فوت ہو جائیں

مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ

اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دن

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

انتظار میں روکے رکھیں، پھر جب وہ اپنی عدت (پوری ہونے) کو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

آپہنچیں تو پھر جو کچھ وہ شرعی دستور کے مطابق اپنے حق میں کریں تم پر اس معاملے

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ

میں کوئی مواخذہ نہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح خبردار ہے۔

عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ

اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ (دورانِ عدت بھی) ان عورتوں کو اشارۃً نکاح کا

اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ

پیغام دے دو یا (یہ خیال) اپنے دلوں میں چھپا رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم عنقریب ان سے ذکر کروگے

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا

مگر ان سے خفیہ طور پر بھی (ایسا) وعدہ نہ لو سوائے اس کے کہ تم فقط شریعت کی (رُو سے کنایۃً)

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ

معروف بات کہہ دو، اور (اس دوران) عقدِ نکاح کا پختہ عزم نہ کرو یہاں تک کہ

آیت	مضمون	
۲۳۲	۵۹۹	اگر مطلقہ عورت اپنی مرضی سے (حسبِ احکامِ شریعت) کہیں عقدِ ثانی کرنا چاہے تو اُسے روکا نہ جائے۔

(۶۰۰) نصیحتوں کے صحیح اہل مومن ہی ہیں۔

(۶۰۱) مطلّقہ عورت کے عقدِ ثانی کی تاکید۔

عمر بھر یُوں ہی بیٹھے رہنے کی نسبت اس میں زیادہ طہارت اور پاکیزگی ہے۔ بعض مطلقہ عورتیں دوسری جگہ نکاح کرنا عار سمجھتی ہیں، یہ تصور غلط ہے۔

(۶۰۲) احکامِ الٰہیہ کی اصل مصلحتوں کا علم اللہ ہی کو ہے۔ لوگ ان مصالح کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔

آیت	مضمون	
۲۳۳	۶۰۳	زمانہ رضاعت کا پُورے دو سال ہونا۔

(۶۰۴) بصُورتِ طلاق بھی رضاعت کے اخراجات باپ کے ذمّہ ہیں۔

(۶۰۵) اِن احکامِ شرعی میں بھی اِستطاعت اور گنجائش کا لحاظ رہنا چاہئیے۔

(۶۰۶) کسی شخص کو اس کی وسعت وطاقت سے بڑھ کر تکلیف دینا ممنوع ہے۔

(۶۰۷) ماں باپ میں سے کسی کو بھی بچے کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

(۶۰۸) باپ کی عدم موجودگی میں ورثاء پر نفقہ کی ذِمّہ داری۔

(۶۰۹) باہمی رضامندی سے مُدّتِ رضاعت میں کمی کی اجازت۔

(۶۱۰) اُجرت پر بچے کی رضاعت کا حکم۔

(۶۱۱) تقویٰ کا حکم اور اللہ کی صفتِ علم کے ذریعے تنبیہہ۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

مقررہ عدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے ، اور جان لو کہ اللہ تمہارے دلوں کی

يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

بات کو بھی جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہا کرو ، اور (یہ بھی) جان لو کہ

اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ ع

اللہ بڑا بخشنے والا بڑا حلم والا ہے - تم پر اس بات میں (بھی) کوئی گناہ نہیں کہ اگر تم نے (اپنی

النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ

منکوحہ) عورتوں کو ان کے چھونے یا ان کے مہر مقرر کرنے سے بھی پہلے طلاق دے دی ہے

وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ

تو انہیں (ایسی صورت میں) مناسب خرچہ دے دو ، وسعت والے پر اس کی حیثیت کے مطابق (لازم) ہے اور

قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ، (بہرطور) یہ خرچہ مناسب طریق پر دیا جائے ، یہ بھلائی کرنے والوں پر واجب ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ

اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے طلاق دے دی درآنحالیکہ تم ان کا مہر

فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

مقرر کرچکے تھے تو اس مہر کا جو تم نے مقرر کیا تھا نصف دینا ضروری ہے

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ

سوائے اس کے کہ وہ (اپنا حق) خود معاف کردیں یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے معاف

النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا

کردے (یعنی بجائے نصف کے زیادہ یا پورا ادا کردے) ، اور (اے مردو!) اگر تم معاف کردو تو یہ تقویٰ کے قریب تر ہے ، اور

آیت ۲۳۴ | مضمون ۶۰۲ | بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔

اس عرصہ میں عام گھومنے پھرنے، بناؤ سنگھار اور نکاح سے باز رہنا چاہیئے۔

(۶۰۳) اختتام عدت کے بعد زیب و زینت اور نکاح وغیرہ کی اجازت ہے۔

(۶۰۴) اصلاحِ نیت کے لیے صفتِ علمِ الٰہی کے ذریعے تنبیہ۔

آیت ۲۳۵ | مضمون ۶۰۵ | دورانِ عدّت منگنی یا وعدۂ نکاح کی ممانعت۔

(۶۰۶) دورانِ عدت کسی مرد کی طرف سے ہمدردانہ (حکمت و مصلحت کی بناپر) بیوہ کو فقط اشارۃً ارادۂ نکاح کا پیغام پہنچانے کی اجازت ہے تاکہ اسے نامساعد حالات کے باعث آئندہ کی زندگی میں عدمِ تحفظ کا احساس پریشان نہ کرے۔

(۶۰۷) دورانِ عدت اشارۃً کوئی بات شریعت و رواج کے مطابق کہنے کی اجازت ہے۔

(۶۰۸) بحالتِ عدت قصدِ نکاح کی ممانعت ہے۔

(۶۰۹) بیانِ علمِ الٰہی اور اس کے ذریعہ نافرمانی سے بچنے کی تاکید۔

(۶۱۰) باری تعالیٰ کی شانِ مغفرت و رحمت کے ذریعے سامانِ تسکین۔

آیت ۲۳۶ | مضمون ۶۱۱ | قبل از خلوت طلاق کا بیان۔

(۶۱۲) مہر مقرر نہ ہونے کی صورت میں قبل از خلوت طلاق کا بیان۔

الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

(کشیدگی کے ان لمحات میں بھی) آپس میں احسان کرنا نہ بھولا کرو، بیشک اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَ

سب نمازوں کی محافظت کیا کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کی، اور اللہ کے حضور

قُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿٢٣٨﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ

سراپا ادب و نیاز بن کر قیام کیا کرو۔ پھر اگر تم حالتِ خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار (جیسے بھی ہو

رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم

نماز پڑھ لیا کرو)، پھر جب تم حالتِ امن میں آجاؤ تو انہی طریقوں پر اللہ کی یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھائے

مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ

ہیں جنہیں تم (پہلے) نہیں جانتے تھے۔ اور تم میں سے جو لوگ فوت ہوں اور (اپنی)

مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم

بیویاں چھوڑ جائیں، ان پر لازم ہے کہ (مرنے سے پہلے) اپنی بیویوں کے لئے انہیں ایک سال تک کا

مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا

خرچہ دینے (اور) اپنے گھروں سے نہ نکالے جانے کی وصیت کر جائیں، پھر اگر وہ خود (اپنی مرضی سے) نکل

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن

جائیں تو دستور کے مطابق جو کچھ بھی وہ اپنے حق میں کریں تم پر اس معاملے میں کوئی گناہ

مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ

نہیں، اور اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔ اور طلاق یافتہ عورتوں کو بھی مناسب

بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ

طریقے سے خرچہ دیا جائے، یہ پرہیزگاروں پر واجب ہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے

(۶۲۳) ایسی صورت میں حیثیت و دستور کے مطابق مہر کی جگہ خرچہ دینے کا حکم ہے

(۶۲۴) نیک لوگوں پر اس حق کا لازمی ہونا۔

آیت	مضمون
۲۳۷	۶۲۵

مہر مقرر ہونے کی صورت میں قبل از خلوت طلاق کا بیان۔

(۶۲۶) ایسی صورت میں مقررہ مہر کا نصف ادا کرنے کا حکم ہے۔

(۶۲۷) منکوحہ کو مہر معاف کرنے کا اختیار ہے۔

(۶۲۸) مرد کو اندریں صورت بھی پورا مہر ادا کرنے کا حق ہے بلکہ اسکی فضیلت ہے

(۶۲۹) باہم حسن سلوک اور احسان کی ترغیب۔

آیت	مضمون
۲۳۸	۶۳۰

نمازوں کی محافظت کا حکم۔

(۶۳۱) درمیانی نماز (نمازِ عصر) کی خاص فضیلت۔

بعضوں نے اس سے مراد نمازِ فجر، یا نمازِ مغرب یا عشاء بھی لی ہے۔ ہر ایک کے اسباب جدا ہیں۔

(۶۳۲) اللہ تعالیٰ کے حضور ادب و خشوع کی تلقین۔

ف۔ اس میں نمازوں کے ظاہری اور باطنی آداب کی رعایت کا حکم ہے ظاہری آداب میں نماز کے ارکان، واجبات، سنن اور مستحبات کا لحاظ ہے۔ اور باطنی آداب میں ذکر و محبتِ الٰہی میں جملہ باطنی مذمومات، غفلات، خطرات اور تعلقات کا قطع کرنا ہے۔ تاکہ تمام حجابات مرتفع ہوں اور نماز معراج بن جائے اسی امر کو بخاری و مسلم میں حدیثِ احسان کے ذریعے یوں واضح کیا گیا ہے۔ " ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" (کہ تو اللہ کی عبادت یوں کرے گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اُسے نہ دیکھ سکے تو اس یقین کا استحضار کامل ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔) پہلی صورت حالتِ مشاہدہ کی ہے۔ دوسری صورت حالتِ مجاہدہ کی ہے۔

طاعات و عبادات کے جو انوار و تجلیات نصیب ہوں، اور جو واردات و کیفیات میسر آئیں،

اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى

اپنے احکام واضح فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو ۔ (اے حبیب!) کیا آپ نے

الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ

اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل گئے حالانکہ وہ ہزاروں

الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ

(کی تعداد میں) تھے ، تو اللہ نے انہیں حکم دیا مرجاؤ (سو وہ مرگئے) ، پھر انہیں زندہ فرمادیا ، بیشک

اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

اللہ لوگوں پر فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ (اس کا) شکر ادا

يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا

نہیں کرتے ۔ (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ خوب

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ

سننے والا جاننے والا ہے ۔ کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے پھر وہ

قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ

اس کے لئے اسے کئی گنا بڑھا دے گا ، اور اللہ ہی (تمہارے رزق میں)

يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى

تنگی اور کشادگی کرتا ہے ، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے ۔ (اے حبیب) کیا

الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ

آپ نے بنی اسرائیل کے اس گروہ کو نہیں دیکھا جو موسٰی کے بعد ہوا ، جب

قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ

انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیں تاکہ ہم (اسکی قیادت میں)

انہیں ہر وقت محفوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آیت ۲۳۹ | مضمون ۶۳۳ | **نمازِ خوف کا حکم۔**

(۶۳۴) پیادہ ہوں یا سوار ہر حالت میں جیسے بھی ممکن ہو نماز ادا کی جائے۔

(۶۳۵) حالتِ امن میں معروف طریقے پر نماز پڑھنے کا حکم۔

آیت ۲۴۰ | مضمون ۶۳۶ | **بیوہ عورتوں کے لیے وصیّت کا حکم۔**

دورِ جاہلیت میں عدتِ بیوگی ایک سال تھی۔ اسلام نے بعد ازاں چار ماہ دس دن مقرر کردی۔

(۶۳۷) بیوہ عورتوں کے مکان سے اِخراج اور زیب و زینت سے متعلق احکام۔

آیت ۲۴۱ | مضمون ۶۳۸ | **مطلقہ عورتوں کے لیے نفقہ کا حکم۔**

(۶۳۹) اس حق کی بجا آوری کا پرہیزگاروں کے لیے لازم ہونا۔

آیت ۲۴۲ | مضمون ۶۴۰ | **توضیحِ آیات کا مقصد تعقل و تدبّر ہے۔**

آیت ۲۴۳ | مضمون ۶۴۱ | **جہاد سے گھبرا کر بھاگنے والوں کا انجام تباہی ہے۔**

(۶۴۲) موت سے بھاگنے والوں کے لیے حکمِ موت ہے۔

(۶۴۳) اجتماعی و قومی بُزدلی کی مذمّت

(۶۴۴) حضرت حزقیلؑ کی دُعا سے ہزارہا مُردہ افراد کا دوبارہ زندہ ہونا۔

(۶۴۵) لوگوں کی اکثریت ناشُکر گزار ہے۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ

اللہ کی راہ میں جنگ کریں، نبی نے (ان سے) فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر قتال فرض

الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ

کردیا جائے تو تم قتال ہی نہ کرو، وہ کہنے لگے ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ

راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہمیں اپنے گھروں سے اور اولاد سے جدا کردیا

اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا

گیا ہے، سو جب ان پر قتال فرض کردیا گیا تو ان میں سے چند ایک کے سوا سب

قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ

پھر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اور ان سے ان کے

لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ

نبی نے فرمایا بیشک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے،

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ

تو کہنے لگے کہ اسے ہم پر حکمرانی کیسے مل گئی حالانکہ ہم اس سے حکومت (کرنے) کے

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ

زیادہ حقدار ہیں اسے تو دولت کی فراوانی بھی نہیں دی گئی، (نبی نے) فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي

بیشک اللہ نے اسے تم پر منتخب کرلیا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ

الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

کشادگی عطا فرما دی ہے، اور اللہ اپنی سلطنت (کی امانت) جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے،

۱ - اس واقعہ سے ایک اصول تو یہ معلوم ہوا کہ اجتماعی بزدلی کا ارتکاب کرنے والی قوموں یا طبقات کا انجام ہلاکت و تباہی ہوتا ہے۔

۲ - باری تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے موت و حیات دونوں پر قادر ہے۔

۳ - ہزار ہا مُردہ افراد کا ایک نبی کی دُعا سے زندہ کر دیا جانا۔

باری تعالیٰ اپنے مقبول بندوں (انبیاء و اولیاء) کی دُعا سے مردوں کو زندہ فرما دیتا ہے۔

آیت	مضمون
۲۴۴	۶۴۶

حکمِ جہاد اور صفاتِ الٰہیہ کے بیان کے ذریعے تنبیہ و تاکید۔

آیت	مضمون
۲۴۵	۶۴۷

قرضِ حسنہ کی ترغیب

(۶۴۸) کسی مستحق کو قرضِ حسنہ دینا اکراماً "اللہ کو قرض دینا" قرار دیا گیا ہے۔

(۶۴۹) انفاق کے عمل کی عظیم قدر افزائی اور منفق (خرچ کرنے والے) پر کمال درجہ شفقت۔

(۶۵۰) قرضِ حسنہ کا صلہ کئی گُنا ہے۔

(۶۵۱) رزق کی تنگی اور کشادگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

(۶۵۲) روزِ محشر کی یقین دہانی۔ ہر کسی کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی خدمت کو اپنی خدمت قرار دیا ہے حالانکہ وہ ہر ایک ان کا مالک اور ہر ایک شئے سے مستغنی ہے۔ مگر اس نے اپنے بندوں کے اکرام کی خاطر بعض نیک اعمال کی قدر و منزلت اور بعض امور کی خصوصی ترغیب کے لیے انہیں مجازاً اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اسی طرح قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بعض بندوں سے فرمائیگا۔ "میں بیمار تھا تو نے میری عیادت کیوں نہ کی، میں بھوکا تھا تُو نے مجھے کھانا کیوں نہ کھلایا، میں پیاسا تھا تُو نے مجھے پانی کیوں نہ پلایا؟"

درحقیقت یہ تنبیہ بیماروں کی عیادت نہ کرنے بھوکوں کو کھانا نہ کھلانے اور پیاسوں کو پانی نہ پلانے پر ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود ان عوارض سے پاک ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ

اور اللہ بڑی وسعت والا خوب جاننے والا ہے ۔ اور ان کے نبی نے اُن سے فرمایا! اس کی سلطنت (کے

مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ

منجانبِ اللہ ہونے) کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس صندوق آئے گا اس میں تمہارے رب کی طرف

رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ

سکونِ قلب کا سامان ہوگا اور کچھ آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہوں گے

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

اسے فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہوگا، اگر تم ایمان والے ہو تو بیشک اس میں تمہارے لئے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ ع ۳۲/۱۶

بڑی نشانی ہے ۔ پھر جب طالوت اپنے لشکروں کو لے کر شہر سے نکلا، تو اس نے کہا بیشک

اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ

اللہ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے، پس جس نے اس میں سے پانی پیا سو وہ میرے (ساتھیوں میں)

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ

سے نہیں ہوگا ۔ اور جو اس کو نہیں چکھے گا پس وہی میری (جماعت) سے ہوگا مگر جو شخص ایک چُلّو (کی حد تک)

غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ

اپنے ہاتھ سے پی لے (اس پر کوئی حرج نہیں) سو ان میں سے چند لوگوں کے سوا باقی سب نے اس سے پانی پی لیا،

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا

پس جب طالوت اور ان کے ایمان والے ساتھی نہر کے پار چلے گئے، تو کہنے لگے آج ہم میں جالوت

طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ

اور اس کی فوجوں سے مقابلے کی طاقت نہیں، جو لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ (شہید ہوکر یا مرنے

ف۔ صُوفیاء کے کلام میں بھی بعض ایسے اشارات و انتسابات اُصولِ مجاز و اکرام کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کی اصل تعبیر کو سمجھنا چاہیئے۔ غلط مفہوم مراد نہیں لینا چاہیئے۔

آیت	مضمون
۲۴۶	۶۵۳

بنی اسرائیل کی ایک جماعت کا ذکر جو اپنی نافرمانی اور بدکرداری کے باعث محکوم اور غلام بنا دی گئی تھی۔

(۶۵۴) ان کا اپنے پیغمبر (حضرت شمویلؑ) سے مطالبہ کرنا کہ جالوت (کافر بادشاہ جوان پر غالب آچکا تھا) سے جنگ کرنے کے لیے ہمارے اوپر ایک بادشاہ مقرر کیا جائے۔

(۶۵۵) غلامی اور محکومی کی انتہائی ذلت کے بعد ان میں جہاد کا خیال پیدا ہوا۔

(۶۵۶) پیغمبر کا اپنی قوم کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا کہ کہیں وقت آنے پر وہ پھر جہاد سے منحرف نہ ہو جائے۔

(۶۵۷) جہاد کی بابت قوم کا عہد اور یقین دہانی۔

(۶۵۸) جابر حکمرانوں کے مظالم کا بیان۔

۱۔ لوگوں کو بے گھر اور وطن بدر کرنا۔

۲۔ لوگوں کو بچوں سے جُدا کرنا۔

(۶۵۹) جہاد (قتال) کا حکم آنے پر قوم کا دوبارہ انحراف، بزدلی اور بدعہدی۔

(۶۶۰) تھوڑے لوگوں کا وعدۂ جہاد پر قائم رہنا۔

(۶۶۱) اللہ تعالیٰ کا ظالموں اور بدعہدوں کے حالات سے خوب واقف ہونا۔

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

کے بعد) اللہ سے ملاقات کا شرف پانے والے ہیں، کہنے لگے کئی مرتبہ اللہ کے حکم سے تھوڑی سی

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ

جماعت (خاصی) بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا

اپنی معیت سے نوازتا ہے۔ اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابل ہوئے تو عرض کرنے

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا

لگے اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر میں وسعت ارزانی فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ

غلبہ عطا فرما۔ پھر انہوں نے ان (جالوتی فوجوں) کو شکست دی، اور داؤد نے

قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ

جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے ان کو (یعنی داؤد کو) حکومت اور حکمت عطا فرمائی

وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

اور انہیں جو چاہا سکھایا، اور اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ

کے ذریعے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین (میں انسانی زندگی بعض جابروں کے مسلسل تسلط اور ظلم کے باعث) برباد ہو

ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا

جاتی مگر اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم انہیں (اے

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

حبیب!) آپ پر سچائی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں۔

آیت	مضمون	
۲۴۷	۶۶۲	حکمرانی کے لیے طالوت کا تقرر۔

(۶۶۳) اس قوم کی غلامانہ سوچ اور طالوت کے تقرر پر اعتراض۔

(۶۶۴) غلامانہ اعتراض: ایک غریب شخص ہم مالداروں پر کیسے حکمران بن سکتا ہے۔ حکمران کوئی سرمایہ دار ہونا چاہیئے۔

(۶۶۵) اِستحقاقِ حکمرانی کی قرآنی بنیاد۔

۱- بسطةً فی العلم:- طالوت مستحقِ حکمرانی ہے کیونکہ اُسے تم پر علم میں فوقیت حاصل ہے۔
۲- بسطةً فی الجسم:- طالوت مستحقِ حکمرانی ہے کیونکہ ذہنی وجسمانی صلاحیت میں اسے فراخی حاصل ہے۔

(۶۶۶) قوم کے مالداروں کے اِستحصالی فکر کا ردّ اور قرآنی موقف کہ "حکمرانی کا تعلق کسی کی غربت و امارت سے نہیں بلکہ اس کی علمی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے ہے۔"

آیت	مضمون	
۲۴۸	۶۶۷	طالوت کے مِن جانب اللہ مقرر ہونے کی نشانی۔

(۶۶۸) تابوت (صندوق) کے اندر سرمایۂ تسکین کا ہونا۔

(۶۶۹) تابوتِ سکینہ میں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے تبرکات کا ہونا۔

(۶۷۰) تبرکاتِ انبیاء والے تابوت کا تعظیماً فرشتوں کے ذریعے اُٹھوایا جانا۔

(۶۷۱) اس صندوقِ تبرکات میں اہلِ ایمان کے لیے اعتقاد و اطمینان کی نشانی کا ہونا۔

حاشیہ نمبر ۴۵ صفحہ نمبر ۴۰۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون	آیت
۶۷۳	۲۴۵

لشکرِ طالوت کی آزمائش۔

(۶۷۳) انہیں امتحاناً نہر سے پانی پینے کی سخت ممانعت کی گئی۔

ف ۔ ۱۔ یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جہاد سے پہلے نہر کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔ دُنیا نہرِ شہوات ہے اور نفس اس کا طالب ہے یہ آزمائش مجاہدۂ نفس کی ہے اور یہی جہادِ اکبر ہے۔ حکم یہ ہے کہ جو کوئی دُنیا کی نہرِ شہوات خواہشات میں سے بقدرِ ضرورت (چلّو بھر) لے تاکہ زندگی کا توازن اور قوائے بدن کی طاقت برقرار رہے۔ وُہ اہلِ روحانیت میں سے ہوگا اور جو کوئی دُنیوی شہوتوں اور خواہشوں سے سیرابی حاصل کرے وہ اہلِ نفسانیت میں سے ہے۔ اس کے لیے عرفان، ایقان اور مشاہدۂ رحمان کی عنایات کا کوئی حصّہ نہیں۔

۲۔ بیشتر نفوس ارضی صفات ہوتے ہیں وہ سفلی و نفسانی شہوات سے سیرابی حاصل کرتے ہیں اور کم نفوس ملکوتی صفات ہوتے ہیں وہ جبروتی و لاہوتی لذات سے سیرابی پاتے ہیں۔

۳۔ ملکوتی صفات نفوس ہی لقاء و وصالِ الٰہی کے طالب ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے قلت کو بھی کثرت سے بدل دیا جاتا ہے۔

(۶۷۴) لشکر کی امتحانی حکم سے سرتابی و سرکشی۔

(۶۷۵) لشکر کی بُزدلی اور جنگ سے انکار۔

(۶۷۶) مومنین کاملین کا استقلال اور مستعدی۔

(۶۷۷) تھوڑے مومنوں کا باذنِ الٰہی بہت سے کافروں پر غالب آنا۔

(۶۷۸) صبر کرنے والوں کی فضیلت۔

ف ۔ پُرخطر ماحول اور اہلِ لشکر کی اجتماعی بُزدلی و نافرمانی کے باوجود جہاد میں وہی مومن ثابت قدم رہے جو رب سے مُلاقات چاہتے اور اس کا یقینِ کامل رکھتے تھے یہ ثابت قدمی تعلق حبّی کی سعی ہے اور توکل کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ تصوّف ایمان کی اسی حالت کو حاصل کرنے کی کوشش ہے۔

آیت	مضمون	
۲۵۰	۶۷۹	اہلِ طاعت لشکریوں کی دُعا درج ذیل اُمور پر مشتمل تھی۔

۱- طلبِ صبر
۲- طلبِ استقامت
۳- طلب فتح و نُصرت

آیت	مضمون	
۲۵۱	۶۸۰	لشکرِ طالوت کی فتح یابی اور لشکرِ کفار کی شکست۔

حضرت داؤدؑ کا جالوت کو قتل کرنا۔

(۶۸۱) حضرت داؤدؑ کو تین امتیازی نعمتیں عطا کی گئیں۔

۱- نعمتِ سلطنت
۲- نعمتِ حکمت
۳- نعمتِ علم

(۶۸۲) حق و باطل کے تضاد اور انقلابی جنگ کی اہمیت و حکمت۔

۱- بعضوں کے ذریعے بعضوں کا ہٹایا اور مٹایا جانا۔
۲- اگر حق کی خاطر انقلابی جدوجہد جاری نہ رہے تو زمین پر فساد ہی فساد بپا ہو جائے گا۔ یعنی بالادست استحصالی طبقات کمزوروں اور زیردست طبقات کو بالکل کچل ڈالیں گے اور فتنہ باطل مضبوطی کے ساتھ ہر طرف اپنا تسلط جمائے گا۔
۳- خیر کی بقاء اور حق کا فروغ انقلابی عمل کے تسلسل پر منحصر ہے
۴- اگر انقلابی جنگ اور مسلسل جہاد کا عمل رک جائے تو نیکیوں کا نظام بھی درہم برہم ہو جائیگا۔
۵- انسانی اقدار اور دینی شعائر کا تحفظ بھی حق کی خاطر باطل سے ٹکراتے رہنے سے ممکن ہوتا ہے۔
۶- اس میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اُمت کے ہر دور میں کچھ مفسدین اور کچھ مصلحین ہوتے ہیں ان کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے۔ کیونکہ حق، باطل سے سمجھوتہ نہیں کرتا اس لیے دفع الناس بالناس کا عمل جاری رہتا ہے۔
۷- اہلِ حق کے اہلِ باطل سے ٹکراؤ کو ناپسندیدہ نہ سمجھا جائے کیونکہ یہی طریقہ اصلاح ہے

اور اسی عمل کی تائید سے قومیں فضل واحسان الہٰی کی حقدار ٹھہرائی جاتی ہیں۔

(۶۸۳) جہاد کا عمل اللہ تعالیٰ کا فضل ہے

آیت	مضمون
۲۵۲	۶۸۴

قرآن مجید اور اسکی تعلیمات کی حقانیت۔

(۶۸۵) حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کی تصدیق۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا

کسی سے اللہ نے (براہِ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی (یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

درجات میں سب پر بلندی عطا فرمائی) اور ہم نے مریم کے فرزند عیسٰی کو واضح نشانیاں عطا کیں اور ہم نے پاکیزہ روح کے ذریعے ان کی

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ

مدد فرمائی، اور اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے پیچھے آنے والے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آجانے کے بعد آپس میں کبھی بھی نہ لڑتے

بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

جھگڑتے مگر انہوں نے (اس آزادانہ توفیق کے باعث جو انہیں اپنے کئے پر اللہ کے حضور جوابدہ ہونے کیلئے دی گئی تھی) اختلاف کیا

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ قف

پس ان میں سے کچھ ایمان لائے اور ان میں سے کچھ نے کفر اختیار کیا، (اور یہ بات یاد رکھو کہ) اگر اللہ چاہتا (یعنی انہیں ایک ہی بات پر مجبور

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا

رکھتا) تو وہ کبھی بھی باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں

مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ

سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور (کافروں کیلئے)

لَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

نہ کوئی دوستی (کارآمد) ہوگی اور نہ (کوئی) سفارش، اور یہ کفار ہی ظالم ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ

اللہ، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے)

آیت	مضمون	
۲۵۳	۲۸۶	نفسِ رسالت میں تمام رسولوں کا برابر ہونا۔
	۶۸۷	مراتب و فضائلِ رسالت میں رسولوں کا باہم متفاوت ہونا۔
	۶۸۸	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف۔
	۶۸۹	مختلف انبیاء و رسل کی جزوی فضیلتیں۔
	۶۹۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمہ گیر فضیلت اور کلی رفعتِ درجات۔
	۶۹۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح القدس (جبرائیلؑ) کے ذریعے تائید و نصرت۔
	۶۹۲	کھلی نشانیوں کے باوجود پہلی امتوں کا آپس میں جھگڑنا۔
	۶۹۳	ان کے باہمی جنگ و جدال میں مشیتِ الٰہی کی کارفرمائی۔
	۶۹۴	ان اختلافات میں انبیاء کی بات ماننے والوں کا مومن ہو جانا اور ان کی بات کا انکار کرنے والوں کا کافر ہو جانا۔
	۶۹۵	مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ لوگ اپنے ارادہ و اختیار سے اچھی یا بری راہ کو اپنائیں۔

تاکہ اپنے کئے پر ذمہ دار ٹھہرائے جاسکیں ایمان یا کفر لوگوں پر منجانب اللہ مسلط نہیں کیا گیا گویا انسان مومن و کافر، متقی و فاسق یا اچھے اور برے جبراً نہیں بنائے گئے بلکہ انھیں اپنے ارادے سے اپنی زندگی میں یہ سب کچھ اختیار کرنے کا موقع دیا گیا ہے تاکہ بعد ازاں وہ عمل پر جوابدہ بھی ہوں اور جزاو سزا کے مستحق بھی۔

۶۹۶ اللہ تعالیٰ "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْد" ہے۔ (حاشیہ نمبر ۲۴ صفحہ نمبر ۸۰۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

ف

۱۔ اللہ تعالیٰ نے (حضور اکرم ﷺ کے علاوہ) دیگر انبیاء و رسل میں سے علی التخصیص کسی ایک کا نام لے کر دوسرے پر فضیلت بیان نہیں فرمائی سو ہمیں بھی تخصیصاً اور تصریحاً ایسا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۲۔ اس سنت سے اہلِ طریقت و سلاسل کو یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ محض ذاتی رائے یا نسبت کے باعث مختلف اولیاءِ کرام اور مشائخ عظام میں سے بعض کا نام لے کر بعض پر ترجیح اور تفضیل نہ

وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ

قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے،

ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

کون ایسا شخص ہے جو اس کے حضور اس کے اذن کے بغیر سفارش کرسکے، جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا) ہے

اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ

یا ہوچکا ہے اور جو کچھ ان کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے، اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی

عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ

چیز کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے مگر جس قدر وہ چاہے، اور اس کی کرسی (سلطنت و قدرت) تمام آسمانوں اور زمین

الْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ٢٥٥

کو محیط ہے، اور اس پر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رتبہ بڑی عظمت والا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

دین میں کوئی زبردستی نہیں، بیشک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہوچکی ہے،

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ

سو جو کوئی معبودانِ باطلہ کا انکار کردے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے

اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَ

ایک ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لئے ٹوٹنا (ممکن) نہیں، اور

اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ٢٥٦ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ

اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے، وہ انہیں

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔــهُمُ

تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے حمایتی

کی جائے تاوقتیکہ اہلِ طریقت وولایت میں کسی کی نضیلت پر اجماع یا صریح دلیل موجود نہ ہو جیسا کہ سیدنا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی فضیلت اولیائے کبار کے اجماع سے ثابت ہے۔ مثلا فرمایا گیا ہے:

غوث	اعظم	درمیان	اولیاء
چوں	محمد	درمیان	انبیاء

۳۔ البتہ شخصی موازنہ اور تقابل کے بغیر بزرگانِ دین کے فضائل و کمالات کا بیان کیا جانا قرآنی طریقہ ہے۔ اور اپنے اپنے مشائخ طریقت کے فضائل و درجات کا اس طرح بیان کرنا بھی جائز ہے جس سے اہلِ نسبت کے دلوں میں اپنے مشائخ کے لئے محبت میں اضافہ ہو اور تعلق میں مزید پختگی نصیب ہو۔ مگر ایک کی تفضیل سے دیگر کی تنقیص کا پہلو نہیں نکلنا چاہیے۔

آیت	مضمون
۲۵۴	۶۹۷

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں عجلت اور سبقت کا حکم۔

۶۹۸ روزِ قیامت:۔

ا۔ نہ اعمال کے عوض کوئی سودا بازی ہوگی۔
۲۔ نہ بخشش کے لئے دنیاوی دوستیاں کام آئیں گی۔
۳۔ نہ کافروں اور ظالموں کے لئے کسی کی شفاعت ہوگی۔

۶۹۹ منکرینِ حق حقیقی ظالم ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں قیامت کے روز کسی کی سفارش (شفاعت) کام نہ آنے کے باب میں تصریح کردی گئی ہے کہ یہ محرومی صرف کافروں اور ظالموں کے لئے ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے شفاعت کام آئے گی یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ بعض لوگ نفئِ شفاعت کی آیات کا اطلاق سیاق و سباق دیکھے بغیر تمام لوگوں پر کردیتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔

آیت	مضمون
۲۵۵	۷۰۰

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور توحید کا بیان۔

۷۰۱ اللہ تعالیٰ خود قائم ہے اور کائنات کو قائم رکھنے والا ہے۔

۷۰۲ اللہ تعالیٰ کا اونگھ اور نیند یعنی غفلت کی جملہ کیفیات سے پاک ہونا۔

۷۰۳ آسمانوں اور زمینوں (یعنی کائناتِ بالا وزیریں) پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی

۷۰۴ اللہ تعالیٰ کی سطوت و جبروت کا بیان۔

۷۰۵ اذنِ الٰہی کے خلاف کسی کا بارگاہِ الٰہی میں شفاعت پر قادر نہ ہونا۔

۷۰۶ ماذون الشفاعت لوگوں کا بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کرنا۔انبیاء' اولیاء اور صلحاء کو بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کا اذن حاصل ہوگا اور وہ گنہگار مسلمانوں کی شفاعت کریں گے حتیٰ کہ معصوم بچے بھی اذنِ شفاعت کے حامل ہوں گے۔

۷۰۷ اللہ کی شانِ علم۔ اس کا علم اول تا آخر ہر شے' ہر زمان اور ہر مکان پر دوراً' کاملاً اور تفصیلاً محیط ہے۔

۷۰۸ مخلوقات میں سے کوئی علمِ الٰہی پر قادر اور محیط نہیں۔

۷۰۹ علمِ ذاتی کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونا۔

۷۱۰ مخلوق کے لئے علمِ عطائی کا ثبوت۔ یہ اِلَّا بِمَا شَآءَ سے ثابت ہوا۔

۷۱۱ جس کو جس قدر علم عطا ہوتا ہے وہ علمِ الٰہی کا ہی فیض اور پرتو ہوتا ہے۔

۷۱۲ سلطنت واقتدار الٰہیہ کا کائناتِ ارض وسماء پر محیط ہونا۔

۷۱۳ اللہ تعالیٰ کے لئے زمین و آسمان کی ساری سلطنت کی حفاظت بھی قطعاً گراں نہیں۔

۷۱۴ اللہ تعالیٰ کا بلند رتبہ اور بڑی عظمت والا ہونا۔

ف۔

۱۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سے تین نور نصیب ہوتے ہیں۔

نور ہدایت' نور کفایت اور نور عنایت' جسے نور ہدایت عطا ہو جائے وہ خواص میں سے ہو جاتا ہے۔ جسے نور کفایت عطا ہو جائے وہ کبائر و فواحش سے محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جسے نور عنایت عطا ہو جائے وہ خطراتِ فاسدہ سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

۲۔ ان انوار کے علاوہ ان کلمات کی برکات میں سے چار اور خصلتیں بھی ہیں۔

تصدیق۔ تعظیم۔ حلاوت اور حرمت

تصدیق کے بغیر انسان منافق ہے، تعظیم کے بغیر مبتدع، حلاوت کے بغیر ریاکار، اور حرمت کے بغیر فاسق۔

۴۔ کوشش کرنی چاہیے کہ کلمہ طیبہ سے مذکور برکات میسر آئیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب نفی (لَآ اِلٰہَ) بھی کامل ہو اور اثبات (اِلَّا اللہُ) بھی کامل۔ (حاشیہ نمبر ۲۷، صفحہ نمبر ... ملاحظہ فرمائیں)

آیت	مضمون	
۲۵۶	۷۱۵	دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں۔ اس کے کئی معانی اور اطلاقات ہیں تفصیلی مطالعہ کے لئے ہماری کتاب "لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ" کی طرف رجوع فرمائیں۔
	۷۱۶	ہدایت ربانی کا از خود واضح اور گمراہی سے ممیز ہونا۔
	۷۱۷	مسلمانوں کی سلامتی کی شرائط:۔

۱۔ ہدایت اور گمراہی میں امتیاز کا شعور۔

۲۔ کفر بالطاغوت۔ گمراہ کرنے والوں کی بات کا کھلا رد اور انکار۔

۳۔ ایمان باللہ۔ اللہ تعالیٰ کی بات کا سچا اقرار۔

۴۔ تمسک بالعروۃ الوثقیٰ۔

مسلمان جب اس قدر ایمانداری اور جرأتمندی سے، باطل سے سمجھوتہ اور مصالحت کے بغیر خالصتاً اسلام کا دامن تھام لیں گے تو یہ ایسا مضبوط حلقہ ہوگا جو مسلمانوں کو حقیقی سلامتی سے ہمکنار کردے گا۔

۷۱۸ اسلام سے وابستگی کا ایسا حلقہ ٹوٹنے والا نہیں۔

۱۔ محض اسلام کو قبول کرنا مگر خلاف اسلام امور کو واضح طور پر رد نہ کرنا، کمزوریٔ ایمان ہے۔

۲۔ ایمانی وابستگی کی پختگی اور مضبوطی کے لئے ایمان باللہ سے بھی پہلے کامل شعور اور واضح امتیاز کے ساتھ کفر بالطاغوت یعنی خلاف اسلام نظام اور رجحانات کے کھلے انکار اور رد کی شرط عائد کی گئی ہے۔ گویا ایمان کے لئے حق کو ماننے سے پہلے باطل کو رد کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہی فلسفہ کلمہ توحید کا بھی ہے۔ پہلے لَآ اِلٰہَ کی صورت میں نفیٔ باطل ہے پھر اِلَّا اللہُ کی صورت میں اثباتِ حق۔

۳۔ جب تک لوحِ قلب و عمل سے باطل نقش و نگار اور طاغوتی وابستگیوں کے اثرات و علامات پہلے خوب مٹائے نہ جائیں۔ محض اوپر سے اسلام کی وفاداری کے دم بھرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

شیطان ہیں، وہ انہیں (حق کی) روشنی سے نکال کر (باطل کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں،

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾ أَلَمْ تَرَ

یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اے حبیب!) کیا

إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے سلطنت دی تھی ابراہیم سے (خود) اپنے رب (ہی)

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا

کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا، جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ (بھی) کرتا ہے اور مارتا (بھی) ہے، تو (جواباً) کہنے

أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ

لگا میں (بھی) زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا بیشک اللہ سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے

مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي

تُو اسے مغرب کی طرف سے نکال لا سو وہ کافر دہشت زدہ

كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ أَوْ كَالَّذِي

ہوگیا، اور اللہ ظالم قوم کو حق کی راہ نہیں دکھاتا۔ یا اسی طرح اس شخص

مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ

کو (نہیں دیکھا) جو ایک بستی پر سے گزرا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، تو اس نے کہا

أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ

کہ اللہ اسکی موت کے بعد اسے کیسے زندہ فرمائے گا، سو (اپنی قدرت کا مشاہدہ کرانے کیلئے)

مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ

اللہ نے اسے سو برس تک مُردہ رکھا پھر اسے زندہ کیا، (بعد ازاں) پوچھا تُو یہاں (مرنے کے بعد) کتنی دیر ٹھہرا رہا (ہے)؟، اس نے

ایسے لوگوں کو ایمان کی پختگی اور سلامتی نصیب نہیں ہو سکتی۔

۴۔ جو لوگ ایمان اور کفر، حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی، خیر اور شر اور اسلام و خلافِ اسلام دونوں کو ساتھ ساتھ چلاتے ہیں اور ملاوٹ کا نام "دین اور دنیا" رکھتے ہیں ان کا عمل سوائے خود فریبی اور فریب دہی کے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

۵۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کی انفرادی، عائلی، سماجی قومی اور سیاسی زندگی بالعموم اس منافقت کی تصویر بن چکی ہے۔ آج امت نے اجتماعی طور پر دنیوی مفادات یا مخالفانہ خطرات کے پیش نظر دوہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں۔

۶۔ ایسی حالت میں قوموں کو اسلام کی سلامتی کی دولت نصیب نہیں ہوا کرتی وہ ہمیشہ ذلت و رسوائی کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔

آیت	مضمون	
	۷۱۹	العروۃ الوثقیٰ کا ایک معنیٰ "ذاتِ محمد مصطفیٰ ﷺ" کا بھی کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمان دامنِ مصطفوی ﷺ سے صحیح طور پر وابستہ نہیں ہوتے کامیابی ناممکن ہے۔
۲۵۷	۷۲۰	اللہ تعالیٰ کا اہلِ ایمان کے لئے حقیقی کارساز ہونا۔ اگر ظاہری اسباب نہ بھی ہوں تب بھی باری تعالیٰ ان کے کام بنا دیتا ہے۔
	۷۲۱	اللہ تعالیٰ "مخرج من الظلمات الی النور" ہے یعنی وہ انسانیت کو باطل کے اندھیروں سے نکال کر حق کے اجالوں کی طرف لے جاتا ہے۔
	۷۲۲	کافروں کے رفیقِ کار شیطان ہیں۔ یہ فسادی اور گمراہ کن قوتیں ہیں۔
	۷۲۳	شیطانی اور طاغوتی طاقتیں "مُخْرِجٌ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰت" ہوتی ہیں۔

ف۔

تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے سے مراد بندوں کو صفاتِ بشریت سے نکال کر اخلاقِ ربوبیت تک پہنچانا اور شک کے اندھیروں سے نکال کر یقین کی روشنی تک پہنچانا ہے اور اہلِ مجاہدہ کے نفس کو مقامِ قلب تک پہنچانا ہے۔

يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ

کہا میں ایک دن یا ایک دن کا (بھی) کچھ حصہ ٹھہرا ہوں ، فرمایا (نہیں) بلکہ تو سو برس پڑا رہا (ہے)

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

پس (اب) تو اپنے کھانے اور پینے (کی چیزوں) کو دیکھ (وہ) متغیر (باسی) بھی نہیں ہوئیں ، اور (اب

اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى

اپنے گدھے کی طرف نظر کر (جسکی ہڈیاں بھی سلامت نہیں رہیں) اور یہ اس لئے کہ ہم تجھے لوگوں کیلئے (اپنی قدرت کی)

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا

نشانی بنادیں اور (اب ان) ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم انہیں کیسے جنبش دیتے (اور اٹھاتے) ہیں پھر انہیں گوشت (کا لباس)

تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾

پہناتے ہیں ، جب یہ (معاملہ) اس پر خوب آشکار ہوگیا تو بول اٹھا میں (مشاہداتی یقین سے) جان گیا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ

خوب قادر ہے ۔ اور (وہ واقعہ بھی یاد کریں) جب ابراہیم نے عرض کیا میرے رب ! مجھے دکھا دے کہ تُو مُردوں کو کس طرح زندہ

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ

فرماتا ہے ، ارشاد ہوا کیا تم یقین نہیں رکھتے ، اس نے عرض کیا کیوں نہیں (یقین رکھتا ہوں) لیکن (چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ

بھی خوب سکون نصیب ہو جائے ، ارشاد فرمایا سو تم چار پرندے پکڑ لو پھر انہیں اپنی طرف مانوس کر لو پھر (انہیں ذبح کر کے)

اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر انہیں بلاؤ وہ تمہارے پاس

يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾ ع

دوڑتے ہوئے آجائیں گے ، اور جان لو کہ یقیناً اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے ۔

آیت	مضمون
۲۵۸	۷۲۴

حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کا مباحثہ۔

۷۲۵ نمرود وجودِ باری تعالیٰ سے انکاری ہوا اور حضرت ابراہیمؑ کے دلائل کا الٹا سیدھا جواب دینے لگا۔

۷۲۶ نمرود بالآخر دلائل نبوت کے سامنے مبہوت ہو گیا۔

۷۲۷ ظالموں کو ہدایت سے محروم رکھا جاتا ہے۔

۷۲۸ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کی مخالفت و مزاحمت وقت کے جابر اور مستبد حکمران نے کی۔

اس کی مخالفت کی بنیاد دیانت، بصیرت اور دلائل پر نہ تھی فقط حکومت اور اقتدار پر تھی۔ ہر داعیٔ انقلاب جب اپنی دعوت قوم کے سامنے پیش کرتا ہے تو استحصالی مقتدر اور مفاد پرست طبقات ہمیشہ بلاجواز اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نمرود کے قول "انا احی و امیت" (میں لوگوں کو زندہ کرتا اور مارتا ہوں) کے مطابق اسی زعم باطل میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عوام کا جینا مرنا اور ان کی عزت و ذلت سب کچھ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ایسا ہی نظام برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس میں لوگ انہی کے رحم و کرم پر جئیں اور ان کے خلاف سر اٹھانے پر مار دیئے جائیں چنانچہ پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب اسی "نمرودی نظامِ ظلم و استحصال" کے خلاف ہوتی ہے۔ پھر ایسے اہل دعوت کو مصائب و مشکلات کی نمرودی آگ میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

آیت	مضمون
۲۵۹	۷۲۹

ایک تباہ شدہ بستی (بیت المقدس یا دیر ہرقل) کا حال دیکھ کر حضرت عزیرؑ یا حضرت یرمیاہؑ کا بارگاہِ الٰہی میں بعث بعد الموت کی حقیقت کا عملی مشاہدہ کروانے کا سوال جس پر ان کو سو سال تک مردہ رکھنے کے بعد زندہ فرمایا گیا۔

۷۳۰ آپؑ کا کھانے پینے کا سامان سو سال گزرنے کے باوجود باسی نہ ہوا بلکہ اپنی اصل حالت پر ترو تازگی کے ساتھ برقرار رہا۔

۷۳۱ آپ کا گدھا ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔

۷۳۲ آپ کو موت کی سو سال کی مدت فقط ایک دن یا اس سے بھی کم لگی۔

۷۳۳ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کی دعا اور استفسار پر حیات کو موت میں

اور موت کو حیات میں بدلنے کے کئی مناظر دکھائے۔

۲۴ء اس واقعہ سے تمثیلی رہنمائی کے تحت یہ بھی معلوم ہوا کہ خدائی نظام میں اسی طرح مردہ قوموں کو زندگی ملتی ہے۔

مگر قوموں کو اجتماعی موت سے ہمکنار ہو جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے لئے ایک طویل عرصہ اور جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ یہ عرصہ سو سال یا کم وبیش بھی ہو سکتا ہے۔ تب جا کر اقوام کو حیاتِ نو نصیب ہوتی ہے۔

ف۔

۱۔ پیغمبر پر موت وارد ہوئی مگر سو سال تک جسم سلامت رہا اور ہر قسم کے طبعی اور کیمیائی تغیرات سے بھی محفوظ رہا۔ معلوم ہوا کہ وفات کے باوجود جسم سلامت رہ سکتے ہیں۔ یہ قدرتِ الٰہیہ میں داخل ہے۔ چنانچہ انبیاء اور شہداء واولیاء کے جسم بھی اللہ تعالیٰ بعد از وفات قبروں میں سلامت رکھتے ہیں۔

۲۔ سو سال کی مدت کو احساس اور ادراک میں ایک دن سے بھی کم عرصہ تک سکیڑ دیا گیا۔ اسے اصطلاحِ تصوف میں "طیِّ زمانی" کہتے ہیں اسی طرح اھل اللہ کو قیامت کا ۵۰ ہزار سال کا دن نمازِ عصر کی چار رکعات کے وقت جتنا محسوس ہوگا چنانچہ معجزاتِ انبیاء اور کراماتِ اولیاء میں سے یہ بھی ہے کہ تھوڑے وقت کے پیمانے میں زیادہ زمانہ سمو دیا جائے۔ ایسا کئی اولیاءِ کرام کے معاملے میں ثابت ہے۔

۳۔ کھانا اور سواری دونوں خدمت کے لئے تھے۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ سواری میں اپنا ارادہ موجود تھا۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے فانی نہ ہوئی تھی اس لئے بقا نہ پا سکی لہٰذا سواری پر موت کے اثرات غالب آگئے۔ مگر کھانا اپنے ارادے اور اختیار دونوں سے فانی تھا اس لئے اسے بقا مل گئی۔ اور وقت کے اثرات سے بھی محفوظ رہا۔ سو جو لوگ حضورِ باری تعالیٰ میں اپنے ارادہ و اختیار سے فانی ہو جاتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں۔

۴۔ ایک نبی کے لئے باری تعالیٰ نے مردے کی بوسیدہ ہڈیوں میں بھی جان ڈال دی۔ یہ عمل بھی معجزاتِ انبیاء اور کراماتِ اولیاء دونوں سے ثابت ہے۔ بعض اولیاءِ کرام مردوں کو "قُم بِاِذنِ اللہ" کہتے، مردے اذنِ الٰہی سے زندہ ہو جاتے۔

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ایسی کرامات کثرت سے منقول ہیں

آیت	مضمون	
۲۶۰	۷۳۵	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی "نظامِ احیائے موتیٰ" کے مشاہدہ کی درخواست۔
	۷۳۶	قدرت الٰہیہ پر ایمان کا اقرار و اعلان۔
	۷۳۷	اطمینانِ قلب کے لئے مشاہداتی یقین کی افادیت۔
	۷۳۸	حضرت ابراہیم ؑ کا پرندوں کو پہلے اپنی ذات کے ساتھ مانوس کرنا۔
	۷۳۹	بعد ازاں ان پرندوں کو ذبح کردینا اور ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں پر بکھیر دینا۔
	۷۴۰	حضرت ابراہیم ؑ کی آواز پر ذبح شدہ پرندوں کا جی اٹھنا۔
	۷۴۱	مردوں کے نظام پر اللہ تعالیٰ کا قادر و غالب ہونا۔
	۷۴۲	اس نظام اور بیان میں اللہ تعالیٰ کی الوہی حکمتوں کی طرف اشارہ ہے۔
	۷۴۳	آیت کا تعلیماتی پہلو:-

اولاً:- یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح پرندوں کی موت اور ان کے اجزائے جسم کے منتشر ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اسی طرح وہ سب انسانوں کے مرنے کے بعد قیامت کے دن ایک ہی آواز پر سب کو دوبارہ زندہ کرکے اپنے حضور کھڑا کردے گا۔

ثانیاً:- یہ سمجھایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعا سے مردوں کا زندہ ہونا حق ہے اور باری تعالیٰ چاہے تو یہ اثر اپنے دیگر محبوب اور مقرب بندوں یعنی اولیائے کرام کی دعا میں بھی رکھ سکتا ہے۔ یہی حال ہماری قلبی اور روحانی موت و حیات کا ہے۔ اگر دل اور روح مردہ ہوجائیں تو کسی "صاحبِ دعوت" کی دعا، توجہ اور صحبت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ میسر آجائے تو مردہ دل بھی زندہ ہوجاتے ہیں۔

ثالثاً:- یہ سمجھایا گیا ہے کہ مردہ قوموں کو دوبارہ زندگی کیسے مل سکتی ہے؟ انقلاب بپا کرنے والوں کو پہلے "صاحبِ دعوت" بننا پڑتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ دعوت مبنی برانس و محبت ہو۔ جیسے حضرت ابراہیم ؑ نے پہلے مختلف پرندوں کو اپنی ذات کے ساتھ مانوس کیا داعی اور دعوت

حق سے تعلق محبت کا رشتہ مضبوط ہو گیا۔ تو پھر انہیں کٹ مرنے کی طرف لایا گیا۔ یہ دوسرا اشارہ تھا کہ مردہ قوموں کو زندگی کٹنے مرنے اور جانوں کا نذرانہ دینے کے بغیر نہیں مل سکتی۔ یہ قانونِ قدرت اور پیغمبرانہ سنت ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد قوموں میں دوبارہ زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ (فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار)

ف۔

ا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشاہدہ کے ذریعے "اطمینان" کے طالب ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے اطمینان قلب نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلوک میں اہل اللہ کے دو مقام ہوتے ہیں۔ مقامِ عروج اور مقامِ نزول' نزول بروج سے افضل و اکمل ہوتا ہے۔ مقامِ عروج میں "سیر الی اللہ" ہوتی ہے اور مقامِ نزول میں "سیر من اللہ"۔ پہلے مقام میں وہ صفاتِ بشریت سے انخلاع کرتے ہیں اور "اسباب" کو ترک کرتے ہیں۔ دوسرے مقام میں وہ اپنی تکمیل کے بعد دوبارہ صفاتِ بشریت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور "اسباب" کو اختیار کرتے ہیں۔ پہلے مقام میں انھیں اسباب اور اور صفاتِ بشریت ترک کرنے سے "اطمینان" ملتا ہے۔ مگر دوسرے مقام کو پالینے کے بعد انھیں وہی "اطمینان" اسباب اور صفاتِ بشریت کو اختیار کرنے سے میسر آتا ہے۔ گویا عروج میں اسباب' بندے اور مولیٰ کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں مگر نزول میں اسباب' حجاب نہیں بن سکتے۔ لہٰذا مقامِ نزول پر آکر اہل اللہ دوبارہ ظاہراً عوام جیسی "مبنی بر اسباب" زندگی اپنا لیتے ہیں تاکہ ان کی اور عوام کی عمومی زندگی میں حیرت انگیز اور غیر معمولی فرق نظر نہ آئے اور وہ لوگوں میں رہ کر ان کے لئے قابلِ عمل نمونۂ تقلید پیش کر سکیں۔ یہ "مقامِ دعوت" ہوتا ہے۔ اور "داعی" کو غیر فطری' کرشماتی اور محیر العقول طرز کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ انھیں سنتِ انبیاء پر چلنا ہوتا ہے۔ مقامِ نبوت یہی ہے کہ وہ اسباب کے اندر رہ کر اپنا تعلق مسبب سے قائم رکھتے ہیں اور عام مخلوق جیسی بشری زندگی گزار کر مخلوق کو "دعوت الی الخالق" دیتے ہیں۔ وہ صفاتِ بشریت کے اندر احوال ملکوتیت کا مزہ پاتے ہیں' مخلوق کی جلوت میں بیٹھ کر خالق کے ساتھ خلوت کرتے ہیں۔ اور اسباب کو بھرپور طریقے سے اپنا کر اللہ پر توکل برقرار رکھتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی۔ اور غزوات میں اپنی حفاظت کے لئے لوہے کی ڈھال استعمال کی گویا ظاہراً اسباب کو اپنایا مگر توکل' اللہ تعالیٰ پر کیا۔ یہ "اطمینانِ قلب" کی وہ اعلیٰ اور مضبوط حالت ہے جو ترک اسباب میں میسر نہیں آسکتی۔ حضرت ابراہیمؑ نے نبوت

کے مقامِ جلیل پر اسباب یعنی مشاہدہ کی صورت میں اسی "حالتِ اطمینان" کو چاہا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرما دی بعض کم فہم لوگ عروج و نزول اور طریقِ ولایت اور طریقِ نبوت کے احوال کے فرق کو نہ سمجھنے کے باعث کئی اہل اللہ کے معاملات سے مغالطہ اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سو آگاہ رہنا چاہیے کہ اہلِ عروج کے لئے ترکِ اسباب میں کمال ہے جبکہ اہلِ نزول کے لئے اختیارِ اسباب میں کمال ہے۔ اور اہلِ نزول کا درجہ اہلِ عروج سے بہت بلند ہوتا ہے۔ عوام کا اسباب کو طلب کرنا اور ہے اور خواص کا اسباب کو طلب کرنا اور ہے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۲۔ اس آیت میں ایک سالکانہ تربیت کا نکتہ ہے۔ چار پرندے جو ذبح کئے گئے مور' مرغ' کوا اور کبوتر تھے۔ یہ نفس کی چار صفات سے استعارہ ہے مور سے تکبر اور خود پسندی مراد ہے' مرغ سے شہوت پرستی' کوے سے حرص و لالچ اور خساست (کمینہ پن) اور کبوتر سے عجلت اور جلد طلبی' سالکانِ راہِ حق کو تعلیم دی گئی ہے کہ اگر نفس کی ان چار شہوات اور صفات کو ذبح کر دیا جائے تو قلب و روح زندہ ہو جاتے ہیں۔ یوں نفسانی موت' روحانی زندگی میں بدل جاتی ہے اور اسی فنا سے حقیقی بقا میسر آتی ہے۔

۳۔ اسی میں ایک عارفانہ تربیت کا نکتہ ہے۔ یہ استعارہ چار باطنی اور غیبی پرندوں سے ہے۔ عقل' قلب' نفس اور روح اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ

عقل کے پرندے کو بابِ ملکوت پر طاعت کی چھری سے ذبح کیا جائے۔

نفس کے پرندے کو بابِ جبروت پر شوق کی چھری سے ذبح کیا جائے۔

قلب کے پرندے کو بابِ لاہوت پر عشق کی چھری سے ذبح کیا جائے۔

اور روح کے پرندے کو بابِ احدیت پر عبدیت کی چھری سے ذبح کیا جائے۔

جب یہ چاروں غیبی طیور (پرندے) ذبح ہو جائیں اور انہیں اپنے اپنے باطنی محل پر رکھ دیا جائے' تب انہیں دوبارہ بارگاہِ الوہیت کی طرف بلایا جائے۔

عقل کو صوتِ طاعت سے بلایا جائے۔

نفس کو زمزمۂ شوق سے بلایا جائے۔

قلب کو جرسِ عشق سے بلایا جائے۔

اور روح کو سِرِّ عبدیت سے بلایا جائے۔

پھر یہ سب دوسری زندگی پالیں گے۔ انہیں بابِ معرفت پر کھڑا کیا جائے گا اور وصال و

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال (اس) دانے کی سی ہے جس سے

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ

سات بالیاں اُگیں (اور پھر) ہر بالی میں سَو دانے ہوں (یعنی سات سَو گنا

مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

اجر پاتے ہیں)، اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے (اس سے بھی) اضافہ فرما دیتا ہے، اور اللہ بڑی

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ

وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر اپنے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ

خرچ کئے ہوئے کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ اذیت دیتے

اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، اور (روزِ قیامت) ان پر نہ کوئی خوف

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سائل سے) نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا اور درگزر کرنا اس

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ

صدقہ سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد (اس کی) دل آزاری ہو، اور اللہ بے نیاز بڑا

حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ

حلم والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنے صدقات (بعد ازاں) احسان جتا کر اور دُکھ دے کر

بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ

اُس شخص کی طرح برباد نہ کر لیا کرو جو مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے

جمالِ صمدیت سے نوازا جائے گا۔

آیت	مضمون	
۲۶۱	۷۴۴	اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال۔

۷۴۵ راہ حق میں خرچ کرنے والوں کو دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک اجر ملتا ہے۔

۷۴۶ جس کے لئے اللہ چاہے' اجر کو ہزار ہا گنا تک بڑھا دیتا ہے۔

۷۴۷ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا کھیتی میں بیج ڈالنے کی طرح ہے۔ اس تمثیل سے دو بنیادی نکات سمجھائے گئے ہیں:

ایک یہ کہ راہِ حق میں مال و اسباب خرچ کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ شاید میری کمائی ختم یا کم ہو رہی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ بیج کو بھی جب زمین میں بوتے ہیں تو وہ ظاہراً مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ ظاہر بین نگاہ جو انجام کو نہیں دیکھ سکتی' یہی سمجھتی ہے کہ دانہ مٹی میں ضائع ہو گیا مگر فی الحقیقت اسی سے کھیتی جنم لیتی ہے اور خشک و غیر آباد زمین پر حیات نو کا آغاز ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ کسان کو ہی یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اس ایک دانے سے خوشے اگیں گے اور ایک ایک خوشے میں پھر کتنے دانے ہوں گے یوں ایک دانہ جب تک آبادکاری کے عمل میں خرچ نہ ہوا تھا وہ ایک ہی دانہ تھا اور جب زمین کے سینے کو چیر اگیا۔ انقلابِ حیات کی محنت و مشقت میں اس دانے کو خرچ کیا گیا تو ایک ہی دانہ نتائج و ثمرات کے لحاظ سے بڑھ کر سینکڑوں دانوں میں بدل گیا۔ راہِ حق میں خرچ کرنے والوں اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں اپنے وسائل بروئے کار لانے والوں کو یہی "فلسفۂ نشوونما" سمجھایا گیا ہے۔ کہ دین کی راہ میں خرچ کئے بغیر ماحولِ حیات میں تبدیلی اور نتائج و ثمرات کا حصول ناممکن ہے۔

ف۔

معلوم ہوا کہ اجر اور جزا کا انحصار اعمال کی مقدار پر نہیں' اعمال کے معیار پر ہوتا ہے' معیار کا انحصار حسن نیت اور حسن اخلاص سے متعین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو آدمی مقداراً اور کمیتاً ایک جیسا اور ایک جتنا ہی عمل کرتے ہیں مگر بارگاہ الٰہی میں ان کی قبولیت اور اجر کا ہزار ہا گنا فرق ہوتا ہے۔ اسی فرق کے باعث ان کے مراتب اور درجات بھی متفاوت ہوتے ہیں۔ اہل اللہ اور اہل دنیا کے اعمال میں اسی طرح کا فرق پایا جاتا ہے وجہ یہ ہوتی ہے کہ دونوں کا عمل ممکن ہے مقدار میں برابر ہو مگر معیار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک اسے خالصتاً لوجہ اللہ انجام دے

رہا ہے دوسرا جنت کی خاطر' اخروی ثواب کی خاطر یا دنیوی برکات کی خاطر۔

آیت	مضمون
۲۶۲	۷۴۸

راہ حق میں کسی کو احسان جتلائے اور ذہنی اذیت دیئے بغیر خرچ کرنا ہی مقبول انفاق ہے۔

اُخروی اجر اور دنیوی نتائج اسی انفاق سے برآمد ہوتے ہیں جو اقامتِ دین اور انسانی بحالی وفلاح کے لئے اس طرح کیا جائے کہ مال خرچ کرنے کے بعد یاد بھی نہ رہے کہ کس پر کتنا خرچ کیا تھا۔ نہ ہی کسی کو احساس دلایا جائے' نہ کسی سے احسان مندی اور شکر مندی کی توقع رکھی جائے اور نہ کسی اور صورت میں اس کے اعتراف اور معاوضہ کی امید دل میں رہے۔ اس سے انسان خود بھی ذہنی کوفت سے محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اذیت سے محفوظ رکھتا ہے۔ **یقیناً** ایسی قربانیوں کا اجر دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں یوں میسر آتا ہے کہ زندگی خوف وغم سے نجات پاتی ہے اور معاشرے میں ایک مستحکم دینی اور فلاحی نظام کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہی اسلامی انقلاب کا مقصود ہے۔

آیت	مضمون
۲۶۳	۷۴۹

سائل سے خوش گفتاری اور اخلاق سے پیش آنے کی ترغیب۔

۷۵۰ **اپنی بھلائی اور خیرات کا احساس دلانے اور احسان جتاتے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے کہ خوش اسلوبی سے امرِ خیر سے ہی معذرت کرلی جائے۔**

گویا نیکی کرکے برباد کرنے سے اس کا نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ جو لوگ اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد یا فلاحی ورفاہی امور میں اپنا مال ودولت' توانائیاں اور وسائل خرچ کریں گے صاف ظاہر ہے کہ اس اقدام سے نیکی اور خیر کی کچھ نہ کچھ عمارت تو کھڑی ہوگی۔ مگر جس صدقہ' انفاق اور امرِ خیر کے پیچھے "من واذی" --- احسان جتلانا اور دوسروں کو اپنی بھلائیوں کا احساس دلا دلا کر ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنے کا عمل موجود ہوگا۔ تو اس عمارت کی بنیاد نہایت کمزور بلکہ کھوکھلی ہوگی۔ تھوڑا سا بوجھ پڑنے پر دھڑام سے نیچے آن گرے گی۔ سو اتنے بڑے نقصان کے مقابلے میں ایسی کمزور عمارت کا نہ اٹھایا جانا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ اس سے اپنی توانائیاں اور وسائل بھی ضائع ہوں گے اور اس عمل پر دوسروں کا اعتماد بھی متزلزل ہوگا یہ جدوجہد مسلسل قربانی کے ساتھ ساتھ بلند حوصلگی' وسیع القلبی اور صبر واستقامت بھی چاہتی ہے ورنہ یہی عمل خیر تعمیر کے بجائے تخریب کا باعث بن

سکتا ہے۔

آیت	مضمون
۲۶۴	۷۵۱

صدقات اور امورِ خیر پر احسان جتانے اور ستانے کی مکرر (دوبارہ) ممانعت۔

۷۵۲ احسان جتانے سے تمام اعمالِ خیر کا باطل ہو جانا۔

۷۵۳ احسان جتانے سے، حسنِ نیت کے ساتھ کیا ہوا عمل بھی ریاکاری بن جاتا ہے۔

۷۵۴ احسان جتانے کا عمل خلاف ایمان بھی ہے۔

گویا احسان جتلانے والا شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ ورنہ وہ اپنا اجر دنیا میں طلب کرنے کے بجائے آخرت کے لئے چھوڑ دیتا۔ اور لوگوں سے توقع رکھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا۔

۷۵۵ ریاکاری بھی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے منافی ہے۔

۷۵۶ احسان جتانے والے شخص کے عمل کے ضائع ہونے کی تمثیل۔

نیکی کرکے احسان جتانا ایسے ہے جیسے ایک چٹان پر تھوڑی سی مٹی جم جائے اور دیکھنے والا یہ سمجھنے لگے کہ اچھی زمین ہے یہاں پر خوب فصل اگے گی مگر جوں ہی زور کی بارش برسی تو ساری مٹی بہہ گئی اور پھر وہی چکنا پتھر رہ گیا۔ گویا "من و اذی" احسان جتلانے اور ذہنی اذیت دینے والوں نے پتھر پر جمی ہوئی ریت میں خیرات اور بھلائی کا دانہ بویا اور بجائے فصل اگنے اور کئی خوشوں کے برآمد ہونے کے، اپنی محنت بھی اکارت چلی گئی اور اصل صلہ بھی برقرار نہ رہا۔ لہٰذا کوششوں کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے حسنِ نیت اور صحتِ عمل کا تسلسل نہایت ضروری ہے۔ اخلاص کے بغیر ایمان کی دولت بھی ضائع ہو جاتی ہے۔

آیت	مضمون
۲۶۵	۷۵۷

اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کی تین شرائط:۔

۱۔ ہر عمل صرف رضائے الٰہی کے لئے انجام دیا جائے۔

۲۔ ہر عمل کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح اور پختگی حاصل کی جائے۔

۳۔ ہر عمل دوام و ثبات کے ساتھ جاری رکھا جائے۔

۷۵۸ رضائے الٰہی اور ثابت قدمی کے ساتھ کئے گئے اعمال و

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ

اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ روزِ قیامت پر، اس کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ

ایک ایسے چکنے پتھر کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو پھر اس پر زوردار بارش ہو تو وہ اسے

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ

(پھر وہی) سخت اور صاف (پتھر) کر کے ہی چھوڑ دے، سو اپنی کمائی میں سے ان (ریاکاروں) کے ہاتھ کچھ بھی نہیں

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ

آئے گا، اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں فرماتا۔ اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا

رضا حاصل کرنے اور اپنے آپ کو (ایمان و طاعت پر) مضبوط کرنے کیلئے

مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک ایسے باغ کی سی ہے جو اونچی سطح پر ہو اس پر

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

زوردار بارش ہو تو وہ دوگنا پھل لائے، اور اگر اسے زوردار بارش نہ ملے تو (اسے) شبنم (یا ہلکی سی پھوار) بھی

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ

کافی ہو، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند

تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ

کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس کیلئے اس میں (کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ) بھی ہر قسم کے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ

پھل ہوں اور اس حالت میں اسے بڑھاپا آ پہنچے اور (ابھی) اس کی اولاد بھی ناتواں ہو اور (ایسے وقت میں) اس باغ پر ایک بگولا آ جائے

صدقات کی تمثیل:

ان اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ہموار اونچی زمین پر باغ لگائے اگر اس پر زور دار بارش ہو جائے تو دوگنا پھل آتا ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو صرف شبنم یا ہلکی سی پھوار پڑ جائے تب بھی شادابی اور روئیدگی آ جاتی ہے۔ گویا حسنِ نیت اور ثبات و استقامت کے ذریعے اعمال و صدقات کے نتائج میں غیر معمولی برکت پڑ جاتی ہے۔

ف۔

۱۔ مذکورہ بالا آیات میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیخ اور مربی بلا مصلحت اپنے مرید اور زیرِ تربیت سالک کو بھی احسان نہ جتلائے۔ اس سے فیض اور فوائد کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

۲۔ ریاکاری ایمان کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ چہ جائیکہ اسے سلوک و تصوف اور لطائف و معارف کے باب میں اپنایا جائے۔ آج کل جو مدعیانِ روحانیت اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں پر رعب ڈالنے کے لئے بعض امور میں ریا اور دکھلاوے سے کام لیتے ہیں یہ سراسر دنیا پرستی اور نفیِ ایمان ہے۔

۳۔ جن اعمال اور ریاضات میں ریا داخل ہو جائے ان کے اثرات و برکات پتھر پر جمی ہوئی مٹی کی طرح بہہ جاتی ہیں اور روحانی مجاہدات نفع کی بجائے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

۴۔ اہل اللہ چونکہ خالصتاً رضائے الٰہی میں اعمال و ریاضات انجام دیتے ہیں اس لئے ان کے اثرات و برکات دوسرے لوگوں کے اعمال و ریاضات سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے اعمال پر رحمت و قبولیت الٰہیہ کی ہلکی سی پھوار بھی بڑی روحانی شادابی لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے روزمرہ کے نیکی اور عبادت کے معمولات بھی زیادہ تاثیر کا باعث ہوتے ہیں۔

۵۔ اعمالِ صالحہ سے فقط اخروی اجر و ثواب ہی کا طالب ہونا کافی نہیں بلکہ ان کے ذریعے "تثبیتِ نفس" یعنی نفس کی اصلاح اور پختگی بھی حاصل کرنا چاہیے۔ جو اعمال نفس پر شاق ہوتے ہیں۔ ان کی مسلسل انجام دہی سے نفس کو دیگر اعمال پر بآسانی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

آیت	مضمون
۲۶۶	۷۵۹

ریاکار اور احسان جتلانے والے کی حسرت و ندامت کی مثال:

اس تمثیل کا مقصد ریاکارانہ اعمال و ریاضات اور صدقات کا انجام سمجھانا ہے کہ جیسے ایک شخص نے نیک اعمال اور خیرات و صدقات کی شکل میں کھجوروں اور انگوروں کا ایک شاندار باغ تیار کیا۔ جس کی سرسبزی و شادابی کے لئے خوب نہریں رواں تھیں۔ اس میں ہر طرح کے

الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ

جسمیں (نری) آگ ہو اور وہ باغ جل جائے (تو اسکی محرومی اور پریشانی کا عالم کیا ہوگا) اسی طرح اللہ تمہارے لیے نشانیاں واضح طور پر بیان فرماتا ہے تاکہ

نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

تم غور کرو (سو کیا تم چاہتے ہو کہ آخرت میں تمہارے اعمال کا باغ بھی ریاکاری کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے اور تمہیں سنبھالا دینے

تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ ع ٣٧ ٣

والا بھی کوئی نہ ہو۔ اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے

مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا

تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو، اور اس میں سے

تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ

گندے مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود لے

اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ

ہرگز نہ لو سوائے اس کے تم اس میں چشم پوشی کرلو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بے نیاز لائق

حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ

ہر حمد ہے۔ شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکنے کیلئے) تنگدستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی

بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ

کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے،

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ ۖ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ

اور اللہ بہت وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔ جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے، اور

مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ

جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی، اور صرف

پھل اور میوے کثرت سے لگے۔ جب باغ عین شباب پر پہنچا تو وہ شخص بوڑھا ہو چکا تھا مگر ابھی اس کی اولاد ناتواں تھی۔ اس وقت اس بوڑھے میں نہ تو نیا باغ لگانے کی سکت رہ گئی تھی اور نہ اس کے بچے ابھی اس کی نگہداشت کے قابل ہوئے تھے۔ عین اس حالت میں آگ کی طرح جھلسا دینے والی آندھی کا ایک بگولا آیا اور اس نے سارے باغ کو جلا کر تباہ کر دیا۔

ارشاد فرمایا گیا ہے کہ غور کرو! اس وقت اس بوڑھے کی بدنصیبی اور مایوسی کا عالم کیا ہوگا؟ لوگو! اس تمثیل سے تم بھی اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ تم اپنے اعمال و صدقات اور خیرات و حسنات کے ذریعے پھلدار باغ تیار کر رہے ہو قیامت کے دن جب یہ باغ خوب تیار ہوگا۔ تو ریاکاری کی آگ آندھی بن کر آئیگی اور تمہارے اعمال کے باغ کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ اسوقت تم اس بوڑھے کی مانند نہ تو نیا باغ لگا سکو گے اور نہ ہی تمہاری اولاد اور متعلقین جنھوں نے اس سے فائدہ اٹھانا تھا اسے بچا سکیں گے۔

یاد رکھو! جن اعمال میں خالص ایمان اور اخلاص ہوتا ہے ہمیشہ شاداب رہتے ہیں اور جن میں ریاکاری بڑائی اور بالواسطہ یا بلاواسطہ احسان جتلانے کا عمل آجاتا ہے وہ اسطرح جل کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

ف۔

طاعات و عبادات کا نور اخلاص کے ذریعے پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس سے سالک کو عبادات میں حلاوت اور کیف نصیب ہوتا ہے نتیجۃً اس میں عبادت و طاعت کا شوق ہے اور اس پر مزید ریاضات بھی طبعاً آسان ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ریا سے یا دیگر معاصی اور سیئات سے طاعات و عبادات کا نور زائل ہونے لگتا ہے۔ اس سے روحانی کیفیات و حلاوات سلب ہونے لگتی ہیں۔ نتیجۃً عبادت کا ذوق کم ہونے لگتا ہے بلکہ معمول کی عبادات میں بھی غفلت اور ناغہ ہونے لگتا ہے اس کو "توفیق کا سلب" ہونا کہتے ہیں۔ اس لئے توفیقِ الٰہی کے حصول کی خاطر چار چیزوں کا ترک ضروری ہے:

۱۔ ترک من ۲۔ ترک اذی ۳۔ ترک ریا ۴۔ ترک عصیان

یعنی ۔۔ احسان جتلانے کا عمل کلیتاً ترک کر دینا، کسی کو ذہنی کوفت اور اذیت پہنچانے کا عمل کلیتاً ترک کر دینا، جلی اور خفی ہر قسم کی ریاکاری ترک کر دینا گناہ اور نافرمانی کا عمل کلیتاً ترک کر دینا۔

۷۶۰ توضیحِ آیات کا مقصد غور و فکر کی ترغیب ہے۔

مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحبِ عقل و دانش ہیں ۔ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو

نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ

یا تم جو منّت بھی مانو تو اللہ اسے یقیناً جانتا ہے ، اور

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ

ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ۔ اگر تم خیرات ظاہر کرکے دو

فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ

تو یہ بھی اچھا ہے (اس سے دوسروں کو ترغیب ہوگی) ، اور اگر تم انہیں مخفی رکھو اور وہ محتاجوں کو

خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

پہنچادو تو یہ تمہارے لئے (اور) بہتر ہے ، اور اللہ (اس خیرات کی وجہ سے) تمہارے کچھ گناہوں کو تم سے دُور

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ

فرمادیگا ، اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے ۔ ان کو ہدایت دینا آپ کے ذمہ نہیں بلکہ اللہ

اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

ہی جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے ، اور تم جو مال بھی خرچ کرو سو وہ

فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ

تمہارے اپنے فائدے میں ہے ، اور اللہ کی رضا جوئی کے سوا تمہارا خرچ کرنا مناسب ہی نہیں ہے ،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا

اور تم جو مال بھی خرچ کرو گے (اس کا اجر) تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر

تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٢﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ

کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا ۔ (خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں (کسب

آیت	مضمون	
۲۶۷	۷۶۱	راہِ حق میں عمدہ مال دینے کا حکم۔
	۷۶۲	خراب اور گھٹیا مال صدقہ میں دینے کی ممانعت۔
	۷۶۳	انفاق فی سبیل اللہ کے لئے اموال کے چناؤ کا معیار کیا ہو؟

یہاں صراحت کردی گئی ہے کہ جو مال آپ کو دیا جائے اور اس کا لینا آپ کو ناگوار ہو تو اسے راہِ حق میں دینا کیسے گوارا کیا جاسکتا ہے؟ یہاں ہمارے اس روایتی خیرات کے تصور کو رد کیا گیا ہے جس کے تحت ہم نے دو واضح معیار بنا رکھے ہیں۔ اپنے لئے اعلیٰ معیار اور راہِ حق میں دین کے مصارف کے لئے یا معاشرے کے غرباء و محرومین کے لئے ادنیٰ معیار۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کے روایتی تصور نے غرباء کے "تصورِ استحقاق" کو ہماری نظروں سے اوجھل کردیا ہے۔ ہم غرباء کی معاشی بحالی اور اقامتِ دین کو اپنا فرض سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ بچے کھچے مال کی خیرات دین اور افلاس زدہ انسانوں پر احسان سمجھ کر کرتے ہیں۔ صدقہ وخیرات کا خیال آتے ہی ہمارا تصور بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ اس میں عمدگی، تقدس اور ادائیگی فرض کا خیال برقرار نہیں رہتا۔ قرآن مجید یہی نکتہ سمجھا رہا ہے کہ راہِ حق میں خرچ ہونے والے تمہارے مال کے اندر دین اور معاشرے کا حصہ ہے۔ وہ حصہ کسی طرح بھی تمہارے حصے سے کمتر نہیں ہے۔ جیسے تم اپنے لئے کمتر مال کو پسند نہیں کرتے ایسے ہی اللہ کے دین کی اقامت اور مستحق لوگوں کے معاشی تعطل کو رفع کرنے کے لئے کمتر مال پسند نہ کیا کرو ایک اور مقام پر ارشاد قرآنی ہے کہ "یہ مال اللہ تعالیٰ خود اپنے دستِ قدرت سے وصول فرماتا ہے" سوچیں، اگر قرآنی حقیقتوں پر کامل ایمان ہو تو کیا دستِ قدرت کے سپرد کیا جانے والا مال، بخل، تنگ دلی اور کم نگاہی کے ساتھ ہوسکتا ہے؟ اور اگر وہ مال کمتر ہو گا تو بارگاہِ الٰہی میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟

۷۶۴ اس میں یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ عملِ انفاق کے ذریعے معاشرے سے استحصالی نظام کا خاتمہ اور اسلامی انقلاب کی تاسیس مقصود ہے۔

جس عمل کی بنیاد ہی گھٹیا مال کے چناؤ، بخل اور تنگ دلی پر رکھی جائے گی اس سے مثبت اور خوشگوار انقلاب کی توقع کیسے ہوسکتی ہے؟ اس لئے انفاق جتنی عمدگی سے ہوگا انقلاب بھی اسی عمدگی سے بپا ہوگا اور انفاق کے عمل میں جس قدر پست فکری اور تنگ نظری کار فرما ہوگی انقلاب کا عمل بھی اسی قدر سبوتاژ ہو جائے گا۔

۷۶۵ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور بہت لائقِ حمد ہونے کا بیان۔

آیت	مضمون	
۲۶۸	۷۶۶	شیطان کا ناداری و تنگ دستی سے ڈرانا اور بے حیائی کا حکم کرنا۔

ان شیطانی وسوسوں کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو راہِ حق میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں۔ شیطان انسانی ذہنوں میں یہ وہم ڈالتا ہے کہ اگر مال یونہی اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا رہا تو ختم ہو جائے گا' کاروبار میں سرمائے کی کمی واقع ہو جائے گی' یہ کمی مالی تنگ دستی کا باعث بن سکتی ہے۔ کل کو مشکل وقت آیا تو سرمایہ کہاں سے لوگے؟ اور اگر اپنی کمائی ہوئی دولت خرچ کرنی بھی ہے تو تھوڑی سی چند ایک غریبوں' یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کردو باقی یا تو اپنے کاروبار ہی کو مزید وسیع کرنے پر خرچ کرو' یا اپنی زندگی اور نفس کو لذت و آسائش فراہم کرنے پر شیطان اس "لذتِ نفس" کے خیال کو بڑھاتے بڑھاتے "بے حیائی" تک بھی لے جاتا ہے۔ کہ چند روزہ زندگی اور ہے' اللہ نے مال و دولت دی ہے کچھ عیش کرلو۔ پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ بعد میں کچھ پیسے خرچ کرکے نیکی اور توبہ خرید لینا یہ نیکی کا وہ مذموم رسمی تصور ہے جو کئی اہلِ دولت میں پایا جاتا ہے۔

۷۶۷ اللہ کی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ۔

شیطانی وسوسوں کے برعکس اللہ تعالیٰ کی یقین دہانی' راہ حق میں مال خرچ کرنے پر مزید فراخی و برکت کی ہے۔ اس عمل سے تنگ دستی نہیں بلکہ رزق میں فضل و وسعت اور آخرت میں بخشش و مغفرت نصیب ہوتی ہے۔

ف۔

اگر دل میں بارگاہِ الٰہی کی نسبت ناامیدی' عدمِ اطمینان اور تشکیک کی کیفیت غالب ہو تو سمجھ لیا جائے کہ شیطانی وساوس کا اثر ہے۔

آیت	مضمون	
۲۶۹	۷۶۸	نعمتِ حکمت ہر ایک کو نہیں ملتی یہ خاص عطیہ الٰہی ہے۔

۷۶۹ حکمت خیرِ کثیر ہے' جسے نصیب ہوتی ہے وہ القاءِ رحمانی اور وسوسۂ شیطانی میں امتیاز کر سکتا ہے۔

۷۷۰ حکمت سے خالی عقل و دانش بھی نصیحت کے فیض سے محروم رہتی ہے حکمت کا چراغ نورِ باطن سے روشن ہوتا ہے۔

اس سے احکامِ الٰہیہ کے اسرار کا ادراک ہوتا ہے معارفِ دین کا باب کھلتا ہے اور

غوامضِ شریعت تک رسائی میسر آتی ہے۔ حکمت ہر صاحبِ علم کے حصہ میں نہیں آتی یہ میراثِ انبیاء ہے جو صرف علماء ربانیین کو نصیب ہوتی ہے۔ اصلاح و تجدید کا کام خالی علم سے نہیں حکمت سے انجام پاتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے "دعوت الی الحق" کے کام کے لئے حکمت و موعظت کی شرط عائد کی ہے جو تبلیغ حکمت کے بغیر ہوگی اس کے مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

آیت	مضمون	
۲۷۰	۷۷۱	خیرات اور نذر میں اخلاص کی ترغیب۔
	۷۷۲	اللہ تعالیٰ ہر ایک کے عملِ خیر سے خوب واقف ہے۔
	۷۷۳	انفاق اور نذر و خیرات جیسے نیک اعمال کو حکم کے مطابق ادا نہ کرنا بھی ظلم ہے۔
	۷۷۴	ظالم لوگ ہمیشہ مدد و نصرت الٰہی سے محروم رہتے ہیں۔

آیت	مضمون	
۲۷۱	۷۷۵	زکوٰۃ اور صدقات ظاہر کر کے دینا بھی نیکی ہے۔

صدقات کو ظاہر کرنے کا بنیادی مقصد دوسروں کو بھی انفاق کی رغبت دلانا ہے۔ اور یہ امر مبنی بر خیر ہے۔ اس لئے ریاکاری تصور نہیں کیا جائے گا۔

اس آیت کریمہ کے ذریعے بعض امورِ خیر اور اعمالِ صالحہ کے اظہار اور اخفاء دونوں کا جواز اور حکمت واضح کی گئی ہے۔ اصلاً انفاق و صدقات کو مخفی رکھنا ہی بہتر ہے۔ مگر بعض اوقات دوسرے لوگوں کو اس نیک کام کی طرف راغب کرنے یا کسی دینی امر کو تقویت پہنچانے کی خاطر کسی امرِ خیر کو افشاء بھی کیا جاتا ہے۔ یہ صورت بھی دینی مصلحت کے باعث قرآن مجید کی رو سے جائز ہے۔ اسی بناء پر قیاس کرتے ہوئے بہت سے آئمہ دین اور اکابرین امت اپنی بعض روحانی بشارات کو اپنے متعلقین سے بیان کرتے اور اپنی تصانیف میں رقم کرتے رہے ہیں۔ اسی ذریعے سے ان کے احوال و بشارات اور کئی روحانی معارف و نکات ہم تک پہنچے ہیں۔ اگر وہ اکابر خود ایسے احوال و بشارات بیان نہ کرتے تو ہم تک ان کے پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ہر عمل کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اور اجر ہے۔ اس کا انحصار صاحبِ عمل کی نیت پر ہے۔ حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جو شخص مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے تنہا یاد کرتا ہوں اور جو شخص مجھے اجتماع میں (سب کے سامنے) یاد کرتا ہے میں بھی اسے ملاءِ اعلیٰ کے اجتماع میں یاد کرتا ہوں"

(بخاری و مسلم)

گویا اخفاء و افشاء، دونوں کا اجر ہے۔ کبھی اِس کا زیادہ اور کبھی اُس کا۔

آیت	مضمون	
۲۷۲	۷۷۶	حضور نبی اکرم ﷺ کی ذمہ داری فقط لوگوں تک ہدایت پہنچانا ہے۔
	۷۷۷	لوگوں کا نظام ہدایت قبول کرلینا منصب رسالت کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں۔
	۷۷۸	لوگوں کا ہدایت سے بہرہ یاب ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ وہ پیغمبرانہ ہدایت کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اس کی جواب طلبی انبیاء و رسل سے نہیں ہوگی۔
	۷۷۹	پیغمبرانہ دعوت کا فریضہ انجام دینے والوں کی ذمہ داری بھی قوم کو راہ ہدایت دکھا دینا ہے۔

اس کا قبول یا عدم قبول لوگوں کے اختیار اور صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے اختیاری عمل پر جوابدہ اور جزا و سزا کے حقدار ٹھہریں۔

	۷۸۰	مشیت الٰہی اسی نظام عدل کا نام ہے جس میں باری تعالیٰ نے اپنے الوہی ارادے سے انسانوں کو دنیا میں حق و باطل' خیر و شر اور ہدایت و گمراہی میں سے کسی بھی ایک لائحہ عمل کو اختیار کرنے کی آزادی دے رکھی ہے۔

تاکہ وہ اپنے کئے کے ذمہ دار قرار پائیں۔ اگر لوگ امر الٰہی کے ذریعے مجبور اور بے اختیار بنادیئے گئے ہوں (جیسا کہ تقدیر کا غلط مفہوم سمجھا جاتا ہے) تو روز محشر ان سے جواب طلبی' مواخذے اور جزا و سزا کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا' اور یوں جنت و دوزخ سمیت پورا نظام آخرت بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

	۷۸۱	سو واضح رہے کہ "مشیت الٰہی" لوگوں کے اعمال کی نسبت جزوی فیصلوں کا نام نہیں۔

بلکہ خالق کائنات اور مالک جزا و سزا کے الوہی ارادہ اور قدرت پر مبنی ایک ایسے "ہمہ جہت کلی نظام" کا نام ہے جو یوم تخلیق کی ابتداء سے لے کر یوم قیامت کی انتہاء تک تمام معاملات پر عدل کے ساتھ حاوی ہے۔ اس میں کسی قسم کے ظلم اور ناانصافی کا شائبہ نہیں۔ اس نظام میں انسانی تقدیرات کا لکھا ہوا ہونا یا نہ ہونا' لوگوں کے وہبی (خیر و شر میں سے ایک کو منتخب کرلینے کے)

اختیار اور صوابدید کو سلب کرتا ہے نہ انھیں ذمہ داری اور جوابدہی سے مستثنٰی کرتا ہے۔

۷۸۲ راہِ حق میں خرچ کرنے کا حقیقی فائدہ خرچ کرنے والے کو ہی پہنچتا ہے۔

۷۸۳ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مقصد فقط اللہ کی رضا ہونا چاہیے۔

۷۸۴ اگر رضائے الٰہی کے جذبہ سے راہِ حق میں مال خرچ کیا جائے گا تو حسبِ وعدہ پورا اجر مل کر رہے گا۔

۷۸۵ اسلام مذہب کے دائرے سے بھی وسیع عالمگیر انسانی فلاح کا دین ہے۔

ابن ابی شیبہؒ، ابن ابی حاتمؒ اور امام بغویؒ نے سعید بن جبیرؓ اور محمد بن حنفیہ سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ صرف مسلمان غرباء و مساکین کو صدقہ و خیرات دیتے تھے غیر مسلموں کو نہیں۔ اس نیت سے کہ شاید غیر مسلم مساکین بھی اس خیال سے اسلام قبول کرلیں کہ حالت کفر میں جن صدقات سے محرومی ہے دین اسلام میں داخل ہونے سے وہ صدقات و خیرات ملتے ہیں اور معاشی کفالت میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے ان کی حاجتمندی ان کے لئے نعتِ عظمیٰ کا باعث بن جائے۔ یہ معمول اور اقدام تحریص علی الاسلام پر مبنی تھا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے اس ضمن میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا منشاء یہ تھا کہ غریب محتاج اور ضرورتمند لوگ مسلم ہوں یا غیر مسلم، صدقات و خیرات بلاامتیازِ دین و مذہب دیئے جائیں۔ تاکہ معاشی کفالت اور سماجی تحفظ و فلاح کا نظام خالصتاً انسانی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ رہ گیا غیر مسلموں کا قبولِ اسلام اس باب میں ان تک پیغامِ ہدایت پہنچا دینے سے آپ کی ذمہ داری کاملاً ادا ہو جائے گی۔ وہ ہدایت کو اپنائیں یا نہ اپنائیں اس کا بوجھ آپ پر نہیں یہ نظامِ مشیتِ الٰہی کا حصہ ہے۔ اس کا حساب اللہ تعالیٰ خود ان سے لے گا لہٰذا اس کے بعد حضور ﷺ نے حکم فرمایا:

"تَصَدَّقُوا علیٰ اَھلِ الأدیان کلھا" (تمام مذاہب کے لوگوں پر بلاامتیاز صدقہ و خیرات کیا کرو)

واضح رہے اس میں دو استثناء ہیں:

(۱) کافر حربی ---- اس کے لئے صدقات جائز نہیں کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عملاً صف آراء ہے۔ مذکورہ اجازت غیر مسلم ذمیوں اور غیر حربیوں کے لئے ہے۔

(۲) زکوٰۃ ---- یہ صرف مسلمانوں کے لئے خاص ہے۔ بقیہ جملہ صدقاتِ واجبہ و نافلہ غیر

اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ

معاش سے) روک دیئے گئے ہیں وہ (امورِ دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں

الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ

سکتے، ان کے (زُہداً) طمع سے باز رہنے کے باعث نادان (جو ان کے حال سے بے خبر ہے) انہیں مالدار سمجھے ہوئے

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

ہے، تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لوگے، وہ لوگوں سے بالکل سوال ہی نہیں کرتے کہ کہیں (مخلوق کے سامنے) گڑگڑانا پڑے

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

اور تم جو مال بھی خرچ کرو تو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ جو لوگ (اللہ کی راہ میں) شب و روز اپنے مال

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں تو ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ہے اور (روزِ قیامت) ان پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ

جو لوگ سُود کھاتے ہیں وہ (روزِ قیامت) کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا

الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

ہوتا ہے جسے شیطان (آسیب) نے چھو کر بدحواس کر دیا ہو، یہ اس لئے کہ وہ

قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

کہتے تھے کہ تجارت (خرید و فروخت) بھی تو سُود کی مانند ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت (سوداگری) کو

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

حلال فرمایا ہے اور سُود کو حرام کیا ہے، پس جس کے پاس اس کے رب کی جانب سے نصیحت پہنچی

مسلموں کے لئے بھی جائز ہیں۔

آیت	مضمون
۲۷۳	۷۸۶

سوال سے پرہیز کرنے والے حاجتمندوں کی مالی اعانت کی ترغیب۔ یہاں پیشہ ور بھکاری صدقات وخیرات کی ترغیب کے دائرے سے خارج ہوگئے۔

۷۸۷ جو لوگ راہِ حق میں مکمل طور پر وقف ہو چکے ہیں وہ سب سے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی معاشی کفالت کی جائے۔

تا کہ وہ معاشی پریشانیوں سے آزاد ہو کر اپنے دینی فرائض اور روحانی معمولات کی بجا آوری کر سکیں۔

۷۸۸ اسیرانِ راہِ حق کی خصوصیات وعلامات درج ذیل ہیں۔

۱۔ جو لوگ خود کو ہمہ وقت دین کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں وقف کر چکے ہوں۔

۲۔ جو لوگ خود کو ہمہ وقت دین کی خدمت واشاعت میں وقف کر چکے ہوں۔

۳۔ جو لوگ خود کو ہمہ وقت دین کی اقامت اور سربلندی کے لئے جہاد وانقلاب بپا کرنے کی راہ میں وقف کر چکے ہوں۔

۴۔ اس ہمہ وقتی دینی مصروفیت کے پیش نظر ان کے لئے اپنے معاش اور روزگار کے لئے کوئی وقت نہ بچا ہو کیونکہ ایسی معاشی تگ ودو سے ان کا "ہمہ وقتی جہاد" متاثر ہوتا ہے۔ سو انہوں نے کسبِ معاش کی ذاتی فکر کو اقامتِ دین کی ملی فکر پر قربان کر دیا ہو۔

۵۔ وہ غیرتِ دینی، عزتِ نفس اور پختگیِ کردار کو برقرار رکھتے ہوئے کسی سے سوال بھی نہ کرتے ہوں بلکہ وہ حاجت مندی میں بھی مزاجاً تونگر نظر آتے ہوں یعنی ان کا فقر شانِ استغناء لئے ہوئے ہو۔ یہ لوگ اسلام کے "ہمہ وقتی انقلابی اور روحانی کارکن" ہوتے ہیں۔

۷۸۹ ہر خیرات سے اللہ تعالیٰ کاملاً باخبر ہوتا ہے۔

۷۹۰ یہاں ہم نے اردو کے عام مترجمین اور مفسرین کے رجحان سے

ہٹ کر "لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" میں لوگوں سے محض لپٹ کر مانگنے کی نفی کے بجائے مطلقاً سوال کی نفی مراد لی ہے۔

اس معنی کی رو سے الحافا حال نہیں بلکہ منصوب علی المصدر (مفعول مطلق) ہے۔ اب معنی یوں ہو گا: **لا يسئلون الناس شيئا فيلحفون الحافا اى لا سوال لهم اصلا فلا يقع منهم الحاف وهو الالحاح** (الجلالين) اسی معنی کی مزید تصریح امام صاویؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: "**فالالحاف منفي قطعا لانتفاء اصل السوال**" کئی دیگر تفاسیر کے علاوہ المدارک اور المظہری نے بھی اس مفہوم کو بیان کیا ہے۔

ف۔

(۱) یہ آیتِ کریمہ بنیادی طور پر "اصحابِ صفہ" کی شان میں نازل ہوئی۔ جن کی تعداد چار سو (۴۰۰) تک تھی۔ یہ صحابہِ کرامؓ میں باقاعدہ صوفیہ کی جماعت تھی۔ جو ہمہ وقت تزکیہ واحسان' عبادت وریاضت' تربیت اور جہاد کے عمل میں مصروف رہتی تھی۔

(۲) یہی آیتِ کریمہ درج ذیل مسائل تصوف اور صوفیائے کرام کے بعض خواص وعلامات اور احوال وکیفیات کی نشاندہی کرتی ہے:۔

(ا) **اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** ---- الآیۃ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اگر چند لوگ کچھ عرصہ کے لئے دنیوی اسباب اور معاشی مشاغل کو ترک کرکے روحانی تزکیہ وتصفیہ اور عبادات وریاضات کے عمل میں مصروف ہو جائیں جیساکہ صوفیاء کرام حالتِ عروج میں ایسا کرتے ہیں تو یہ رہبانیت نہیں بلکہ اس کا جواز سنتِ صحابہ اور حکم قرآنی سے ثابت ہے۔

(ب) **یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَاءَ** سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہل اللہ اور فقراء وصوفیاء کوئی ایسی خاص وضع نہ اپنائیں جس سے وہ باقی اہلِ دنیا سے ممتاز طبقہ یا گروہ نظر آئیں۔ جیسے تصوف وطریقت کے نام پر ملنگ قسم کے لوگ وجود میں آگئے ہیں۔

(ج) اہل اللہ کا بنیادی وصف مخلوق سے مستغنی ہونا ہے۔ تاکہ ان کا فقر' محتاجی تصور نہ کیا جائے۔ اس لئے فقراء اگر حاجت مند بھی ہوں تب بھی حالتِ استغناء میں رہیں۔

(د) **تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمَاهُمْ** سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہل اللہ کا تقویٰ' تعفف' توکل اور استغناء ان کی صورت اور چہرے سے آشکار ہو جاتا ہے اور یہی ان کی پہچان ہوتی ہے۔

(ہ) اہل اللہ لینے والے نہیں بالعموم دینے والے ہوتے ہیں کیونکہ شاغل باللہ محتاج الی الخلق نہیں

ہوتے محتاج الی الخالق ہوتے ہیں۔

(ی) ہر چند ان کا منصب سائل اور محتاج بن کے رہنا نہیں مگر اہلِ اسلام اگر ان کے لئے ہدیۃً ' تحفۃً 'اور تکریماً خرچ کریں تو ان کے لئے نیکی اور برکت کا باعث ہے۔

(۳) یہاں چند ایک عارفانہ اشارات بھی مذکور ہیں۔

(ا) اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جنھوں نے اپنے قلب کو غیر اللہ کی طرف میلان سے روک لیا ہے۔

(ب) لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ وہ محبوبِ حقیقی کے قریب ووصال کی خاطر

- تزکیۂ نفس میں مجاہدہ کرتے ہیں۔
- اشتغالِ ذکر میں مجالسہ کرتے ہیں۔
- غلبۂ حال میں مراقبہ کرتے ہیں۔
- اور کشفِ انوار میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

سو روحانی مشاغل سے انھیں شدّتِ محبت' لذّتِ قربت اور حقیقتِ یقین جیسی کیفیات نصیب ہوتی ہیں۔ جو ان کے اوقات کی حفاظت کرتی ہیں اور انھیں دنیوی معائش و حوائج کی طرف راغب نہیں ہونے دیتیں۔

(ج) یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔۔ وہ صحت توکل' حقیقتِ تسلیم اور حسنِ رضا کے باعث اپنے تمام امور کاملاً بارگاہِ الوہیت میں تفویض کردیتے ہیں اور خود سراپا استغناء بن جاتے ہیں۔

(د) تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمَاهُمْ ۔۔۔ باری تعالیٰ ان کی روحوں کو معرفتِ ذات کے نور سے روشن کرتا ہے' ان کے دلوں کو جمالِ صفات کی بہجت (سرور) سے مزین کرتا ہے اور ان کے چہروں کو مشاہدہ حق کی بشارت سے پر رونق کرتا ہے۔ سو وہ انھی علامات سے پہچانے جاتے ہیں۔

(ہ) لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۔۔۔ پس ان کے نفوس دنیا سے حظ و سرور نہیں لیتے' ان کے قلوب اہلِ دنیا سے لطف وانبساط نہیں لیتے اور ان کی ارواح اموالِ دنیا سے راحت واطمینان نہیں لیتیں۔

(ی) چنانچہ شانِ فقر نے انھیں محصور کردیا ہے۔

حلاوتِ محبت نے انھیں شاغل کردیا ہے۔

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ

سو وہ (سُود سے) باز آگیا تو جو پہلے گزر چکا وہ اسی کا ہے ، اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ، اور جس نے

عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾

پھر بھی لیا سو ایسے لوگ جہنمی ہیں ، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

اور اللہ سُود کو مٹاتا ہے (یعنی سودی مال سے برکت کو ختم کرتا ہے) اور صدقات کو بڑھاتا ہے (یعنی صدقہ کے ذریعے مال کی برکت کو

كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

زیادہ کرتا ہے)، اور اللہ کسی بھی ناسپاس نافرمان کو پسند نہیں کرتا۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

کیئے اور نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا

رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓاَيُّهَا

اجر ہے ، اور اُن پر (آخرت میں) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہونگے ۔ اے ایمان والو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا

اللہ سے ڈرو اور جو کچھ بھی سُود میں سے باقی رہ گیا ہے چھوڑ دو اگر تم

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا

(صدقِ دل سے) ایمان رکھتے ہو ۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

طرف سے اعلانِ جنگ پر خبردار ہو جاؤ ، اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾ وَ

تمہارے اصل مال (جائز) ہیں ، نہ تم خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے ۔ اور

مستی حال نے انہیں غنی کر دیا ہے۔

چشمۂ معرفت نے انہیں نفسِ مطمئنہ دے دیا ہے۔

اور نورِ حقیقت نے انہیں نفسِ راضیہ دے دیا ہے۔

آیت	مضمون
۲۷۴	۷۹۱

راہِ حق میں دن رات (ہمہ وقت) مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی مقربیت کا باعث ہے۔

۷۹۲ راہِ حق میں خرچ کرنے کے خفیہ اور علانیہ دونوں طریقے پسندیدہ ہیں۔

۷۹۳ پوشیدہ خیرات کی اپنی برکات ہیں اور ظاہری صدقات کے اپنے ثمرات، کسی طریق سے بھی اجر میں کمی نہیں ہوتی۔ (بشرطیکہ مقصود رضائے الٰہی ہو)۔

۷۹۴ انفاق فی سبیل اللہ میں ایسے نظام کی حقیقت پوشیدہ ہے جو انسانوں کو ہر خوف و غم سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ف۔ "لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ" خوف و غم کا اٹھ جانا انفاق فی سبیل اللہ کی کثرت کا اجر بتایا گیا ہے جبکہ یہ اجر باری تعالیٰ کے دوستوں یعنی اولیاء اللہ کے خواص و علامات میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ انفاق و سخاوت کی کثرت سے حقیقتِ ولایت نصیب ہوتی ہے۔ اسی لئے صوفیاء و اولیاء ہمیشہ انفاق و سخاوت کو اپنا معمول رکھتے تھے۔

آیت	مضمون
۲۷۵	۷۹۵

سود کی حرمت، اس کی شدید مذمت، اخروی وعید اور انجامِ بد کا بیان۔

۷۹۶ آیت: ۲۷۴ میں ایک طرف ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی دولت کو بغیر کسی معاوضہ کے، لوگوں کے معاشی تعطل کو دور کرنے اور معاشرے میں نظامِ حق کو بپا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اس کا صلہ صرف رضائے الٰہی کی صورت میں چاہتے ہیں۔

یہ ایمانی اور انقلابی سوچ ہے۔ اب دوسری طرف اس آیت میں استحصالی سوچ اور ظالمانہ نظام کے ان علمبرداروں کا ذکر ہو رہا ہے جو غریب اور ضرورتمند طبقات کی حاجات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا معاشی استحصال کرتے ہیں۔ اور اپنے سرمایہ و دولت کے زور سے

معاشرے میں اقتصادی ناہمواری کا باعث بنتے ہیں۔

۷۹۷ قیامت کے دن سود خور، آسیب زدہ شخص کی طرح حواس باختہ اٹھے گا۔

۷۹۸ سود خور، سود کو تجارت کی مثل سمجھتے ہوئے، مال پر سودی اضافے کو بھی تجارتی نفع کی مانند جائز سمجھتا ہے۔

۷۹۹ اللہ تعالیٰ نے بیع و شراء (تجارت) کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔

۸۰۰ حرمتِ ربوٰ کے فرمان کے آنے کے بعد سودی لین دین کے فوری ترک کردینے کا حکم۔

۸۰۱ سودی نظام اور لین دین ترک کردینے سے پچھلے گناہوں کی معافی کردی گئی ہے۔

۸۰۲ حرمتِ ربوٰ کے حکم کے باوجود سودی نظام پر اصرار اور کاروبار کرنے والے جہنمی ہوں گے۔

۸۰۳ سود خور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

آیت	مضمون
۲۷۶	۸۰۴

سودی نظام میں معاشرے سے برکات اٹھ جاتی ہیں معاشی ناہمواری جنم لیتی ہے اور دین واخلاق کی قدریں رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں۔

۸۰۵ صدقات و خیرات کے نظام سے برکات میں اضافہ ہوتا ہے۔ معاشی عدل وانصاف کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اور دین واخلاق کی قدروں کو استحکام ملتا ہے۔

آیت	مضمون
۲۷۷	۸۰۶

اسلامی معاشرے کی بنیاد چار ستونوں پر ہے۔ ایمان، اعمالِ صالحہ، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ
چاروں احکام کے نظم و ترتیب کا منشاء یہ ہے کہ:۔

(ا) ایمان سے معاشرے میں اعمال صالحہ پیدا ہونے چاہیں جو اجتماعی نیک کرداری کی علامت ہیں۔

(ب) اعمال صالحہ سے معاشرے میں نظامِ عبادت و صلوٰۃ بپا ہونا چاہیے جو اجتماعی تقویٰ و روحانیت

کا آئینہ دار ہے۔

(ج) اور نظامِ صلوٰۃ سے معاشرے میں نظامِ زکوٰۃ و صدقات کا قیام عمل میں آجانا چاہیے جو اجتماعی معاشی عدل کی بنیاد ہے۔ اس نظام کے قیام سے ہر قسم کے سودی اور استحصالی نظام کی جڑ کٹ جائے گی۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ معاشی و سماجی خوف اور سیاسی ظلم و جبر کے زخموں سے محفوظ ہو سکے گا۔

۸۰۷ جو معاشرتی سفر ایمان سے شروع ہوتا ہے اس کی منزل غیر سودی اور غیر استحصالی بنیادوں پر ایسا فلاحی اور عادلانہ نظامِ معیشت قائم کرنا ہے۔

جس میں نہ تو انسان' انسان کا محتاج و محکوم رہے اور نہ انسان' انسان کا استحصال کر سکے اسی طرح انسان سماجی سطح پر اللہ تعالیٰ کے حضور خالص بندگی کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ ورنہ نمرودی' فرعونی اور قارونی نظامِ جبر و استحصال کے ذریعے انسانوں کو ہمیشہ حقیقتِ توحید سے محروم رکھتا ہے اور معاشرے کو اجتماعی شرک کا خوگر بنا دیتا ہے۔

آیت	مضمون	
۲۷۸	۸۰۸	اہلِ ایمان کو اللہ سے ڈرنے کا حکم۔
	۸۰۹	سودی لین دین فی الفور چھوڑ دینے کا حکم۔
	۸۱۰	سودی نظام چھوڑے بغیر تقویٰ ممکن نہیں۔
	۸۱۱	سودی نظام چھوڑے بغیر ایمان کی بقا بھی ممکن نہیں۔
۲۷۹	۸۱۲	سود سے باز نہ آنے والے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔
	۸۱۳	سودی نظام' خدا اور رسول ﷺ کے خلاف کھلی بغاوت اور اعلانِ جنگ ہے۔
	۸۱۴	سودی نظام اور لین دین ترک کئے بغیر توبہ قبول نہیں۔
	۸۱۵	سود چھوڑ کر قرض داروں سے صرف اصل مال واپس لینے کا حکم۔
	۸۱۶	سود اللہ کی نگاہ میں ظلم ہے' سود خور ظالم ہیں اور ظالموں کے لئے فلاح و نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ

اگر قرضدار تنگدست ہو تو خوشحالی تک مہلت دی جانی چاہیئے ، اور تمہارا

تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوْا

(قرض کو) معاف کردینا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں معلوم ہو (کہ غریب کی دلجوئی اللہ کی نگاہ میں کیا مقام رکھتی

يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ قف ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ

ہے) - اور اس دن سے ڈرو جسمیں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤگے ، پھر ہر شخص کو جو کچھ عمل اس نے

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

کیا ہے اس کی پوری پوری جزا دی جائیگی اور ان پر ظلم نہیں ہوگا - اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

مدت تک کیلئے آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو ، اور تمہارے درمیان

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ

جو لکھنے والا ہو اسے چاہیئے کہ انصاف کے ساتھ لکھے ، اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ

اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ

اسے اللہ نے لکھنا سکھایا ہے پس وہ لکھ دے (یعنی شرع اور ملکی دستور کے مطابق وثیقہ نویسی کا حق پوری دیانت سے ادا کرے) ، اور مضمون

عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ

وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق (یعنی قرض) ہو اور اسے چاہیے کہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور اس

شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ

(زرِ قرض) میں سے (لکھواتے وقت) کچھ بھی کمی نہ کرے ، پھر اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق واجب ہوا ہے ناسمجھ

ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ

یا ناتواں ہو یا خود مضمون لکھوانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کے کارندے کو چاہیے کہ وہ

۸۱۷ سود خور کبھی نہ کبھی خود بھی ظلم کی چکی میں پستا ہے۔

۸۱۸ جو قوم سود چھوڑ دے گی وہ ظلم سے نجات پائے گی اور اسے امان نصیب ہوگی۔

آیت ۲۸۰ — مضمون ۸۱۹ تنگ دست قرضداروں سے ہمدردی کا حکم۔

۸۲۰ تنگ دستوں کو فراخ دستی آجانے تک بلاسود قرض دینے کا حکم قرض کا مقصد معاشی خوشحالی ہے سود کے بوجھ تلے دب جانا نہیں۔

۸۲۱ پریشان حالوں کے قرض معاف کردینا نیکی ہے۔

آیت ۲۸۱ — مضمون ۸۲۲ سودی لین دین کا ترک خوفِ آخرت کے ایمانی جذبہ سے ہونا چاہیے۔

۸۲۳ اہلِ ایمان کو سودی نظام اس لئے بھی ترک کردینا چاہیے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ کرکے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور کس طرح پیش ہوں گے اور کیا منہ دکھائیں گے۔

۸۲۴ اگر آج سود کا ظالمانہ نظام نہ چھوڑا گیا تو روز قیامت اس کا پورا پورا بدلہ دینا ہوگا۔

۸۲۵ آخرت کی انتہائی سنگین سزا بھی ظلم نہیں ہوگی کیونکہ وہ ہر شخص کی اپنی کمائی ہوگی۔

۸۲۶ روز قیامت کوئی عمل جزا کے بغیر رہے گا نہ کسی کی جزا میں کمی کی جائیگی' اور نہ ہی کسی کے ساتھ ناانصافی وحق تلفی ہوگی۔

آیت ۲۸۲ — مضمون ۸۲۷ معیّنہ مدت کے لئے قرض کی اجازت۔

۸۲۸ قرض کی دستاویزات تیار کرنے کا حکم۔

۸۲۹ کاتب (محرر) کے لئے تحریر میں دیانت اور عدل کا حکم۔

۸۳۰ دستاویز نویسی سے انکار نہ کیا جائے۔

۸۳۱ دستاویز ملکی قانونِ شریعت اور رواج و دستور کے مطابق رکھی جائے۔

وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۗ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ

انصاف کے ساتھ لکھوا دے ، اور اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو ،

رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ

پھر اگر دونوں مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں (یہ) ان لوگوں میں سے

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

ہوں جنہیں تم گواہی کیلئے پسند کرتے ہو (یعنی قابل اعتماد سمجھتے ہو) تاکہ ان دو میں سے ایک

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۗ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ

عورت بھول جائے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے ، اور گواہوں کو جب بھی (گواہی کیلئے) بلایا جائے

اِذَا مَا دُعُوْا ۗ وَلَا تَسْـَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ

وہ انکار نہ کریں ، اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے اپنی میعاد تک لکھ رکھنے میں اکتایا

كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۗ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ

نہ کرو ، یہ تمہارا دستاویز تیار کر لینا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے اور

لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً

گواہی کے لئے مضبوط تر اور یہ اس کے بھی قریب تر ہے کہ تم شک میں مبتلا نہ ہو سوائے اس کے کہ

حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

دست بدست ایسی تجارت ہو جس کا لین دین تم آپس میں کرتے رہتے ہو تو تم پر اس کے نہ لکھنے کا

اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۗ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ

کوئی گناہ نہیں ، اور جب بھی آپس میں خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو ، اور نہ لکھنے والے

كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ ۗ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ

کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو ، اور اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہاری حکم شکنی ہوگی

۸۳۲ قرض کی دستاویز، قرض لینے والے کی طرف سے تیار کی جائے۔ یعنی اقرار نامہ کا مضمون مدیون کی جانب سے ہو۔

۸۳۳ دستاویز کے مضمون میں خدا خوفی کو خوب ملحوظ رکھا جائے۔

۸۳۴ شرائطِ معاہدہ میں کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو اور نہ ان کے لکھنے میں کوئی کمی بیشی کی جائے۔

۸۳۵ قرض خواہ کم سن، کم سمجھ، ضعیف اوران پڑھ ہونے کی صورت میں ولی کا تقرر کرسکتا ہے۔

۸۳۶ ولی بھی دستاویز قرض پوری دیکھ بھال اور عدالت ودیانت سے لکھوائے۔ تاکہ اس کی غلطی یا زیادتی اصل قرض خواہ (معذور) کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

۸۳۷ دستاویز پر گواہی ضرور ڈلوائی جائے۔

۸۳۸ دستاویز کے گواہ اپنے لوگوں میں سے دو مرد ہونے چاہیں۔

۸۳۹ اگر دو مرد نہ ہوں تو دیگر قابلِ اعتماد لوگوں میں سے ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیا جائے تاکہ گواہی دینے کی صورت میں اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا سکے۔

نوٹ:۔ دو عورتوں کی گواہی کا مسئلہ ---------- (حاشیہ نمبر ۸۴ صفحہ نمبر ۲۱۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

۸۴۰ گواہوں کو طلب کئے جانے پر گواہی سے انکار کی اجازت نہیں۔ شریعت نے گواہی کو حق نہیں بلکہ فرض قرار دیا ہے۔

۸۴۱ چھوٹے بڑے ہر معاملے میں دستاویز نویسی کی تاکید۔

۸۴۲ انعقادِ معاملہ کے ساتھ قابلِ قبول دستاویز کے لئے بھی ایک خاص مدت کا اشارہ دیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ بعد میں جعلی دستاویزات نہ تیار کریں۔

۸۴۳ دستاویز کی عدالتی وشہادتی اہمیت کا بیان۔

۸۴۴ دستاویزی شہادت زبانی گواہی سے مضبوط تر ہے۔

بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

اور اللہ سے ڈرتے رہو ، اور اللہ تمہیں (معاملات کی) تعلیم دیتا ہے ، اور اللہ ہر چیز کا

عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا

خوب جاننے والا ہے ۔ اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو باقبضہ رہن

فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۗ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

رکھ لیا کرو ، پھر اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتماد ہو تو جس کی دیانت

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۗ

پر اعتماد کیا گیا اسے چاہیے کہ اپنی امانت ادا کردے اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۗ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ

اس کا پالنے والا ہے ، اور تم گواہی کو چھپایا نہ کرو ، اور جو شخص گواہی چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا

قَلْبُهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾ لِلّٰهِ مَا فِى

دل گنہگار ہے ، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جاننے والا ہے ۔ جو کچھ آسمانوں میں

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ

اور زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے ، وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں خواہ

اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ فَيَغْفِرُ لِمَنْ

انہیں ظاہر کرو یا انہیں چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا ، پھر جسے وہ

يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

چاہے گا بخش دیگا اور جسے چاہے گا عذاب دیگا ، اور اللہ ہر چیز پر کامل قدرت

قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ

رکھتا ہے ۔ (اس) رسول نے جو کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل

۸۴۵ دست بدست لین دین میں ایسی تحریر کی ضرورت نہیں۔

۸۴۶ دست بدست خرید و فروخت میں گواہوں کے تقرر کی اہمیت۔

۸۴۷ دستاویز نویس اور گواہان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔

۸۴۸ دستاویز نویس اور گواہان پر ناجائز دباؤ فسق اور جرم ہے انہیں دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لئے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔
تقویٰ کی تاکید۔

۸۴۹ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تعلیم احکام فرماتا ہے۔ تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق قانون سازی ہو۔

۸۵۰ اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

آیت	مضمون
۲۸۳	۸۵۱

دوران سفر رھن باقبضہ کا حکم --- دستاویزی شہادت ممکن نہ ہو تو کوئی چیز گروی رکھ کر بھی قرض لیا جاسکتا ہے۔

۸۵۲ لین دین میں باہمی اعتماد کی ضرورت و اہمیت۔

ادائیگی امانت تقویٰ کا حصہ ہے۔ معاملات میں امانت کے بغیر تقویٰ اور خدا خوفی کا کوئی تصور نہیں۔

۸۵۳ گواہی کو چھپانے کی ممانعت۔

کسی معاملے کا گواہ اگر وقت آنے پر گواہی کو چھپائے یا اسکی ادائیگی سے گریز کرے تو وہ گناہ گار ہوگا۔ اس کا ایمان کمزور اور دل ناپاک قرار پائے گا۔

۸۵۴ صفتِ علم الٰہی کے بیان کے ذریعے گواہی دینے سے گریز کرنے والے کو تنبیہ۔

ف۔

وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔۔۔ سے معلوم ہوا کہ معاملات کی خرابی کے باطنی اثرات قلب و روح پر مترتب ہوتے ہیں۔ اس لئے حسنِ عبادات کے ساتھ حسنِ معاملات کا ہونا اشد ضروری ہے۔ ورنہ باطنی نور اور قلبی ہدایت میسر نہیں آسکتی۔

آیت	مضمون
۲۸۴	۸۵۵

زمین و آسمان سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

۸۵۶ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و مخفی چیز کا حساب لے گا حتیٰ کہ ہمارے دلوں

وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

کیا گیا اس کی تصدیق کی اور (ان کی پیروی کرتے ہوئے) اہلِ ایمان نے بھی ، سب (دل سے) اللہ پر اور

وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا

اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں ' (نیز کہتے ہیں) ہم اس کے پیغمبروں میں سے

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

کسی کے درمیان بھی (ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے ، اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے ہیں ہم نے (تیرا حکم) سُنا اور اطاعت (قبول)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ

کی اے ہمارے رب : ہم تیری بخشش کے طلبگار ہیں اور (ہم سب کو) تیری ہی طرف لوٹنا ہے ۔ اللہ کسی جان کو اسکی طاقت سے

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ

بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا ، اس نے جو نیکی کمائی اس کیلئے اس کا اجر ہے اور اس نے جو گناہ کمایا اس پر اس کا عذاب ہے ، اے

اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا

ہمارے رب : اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرما ، اے ہمارے پروردگار ! اور ہم پر اتنا (بھی) بوجھ نہ ڈال جیسا

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا

تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا ، اے ہمارے پروردگار ! اور ہم پر اتنا بوجھ (بھی) نہ

لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟

ڈال جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ، اور ہمارے (گناہوں) سے درگزر فرما ، اور ہمیں بخش دے ، اور ہم پر

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

رحم فرما ، تو ہی ہمارا کارساز ہے پس ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما ۔

میں چھپے ہوئے برے خیالات کا بھی حساب لیا جائے گا۔

۸۵۷ مغفرت اور عذاب دونوں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہیں۔

۸۵۸ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

آیت	مضمون
۲۸۵	۸۵۹

وحی الٰہی پر اصل ایمان تو رسول خدا ﷺ کا ہے اور وہی ایمان کامل ہے۔

۸۶۰ وحیٔ الٰہی پر جو ایمان مومنین کو حاصل ہوا ہے وہ ایمان محمدی ﷺ کا توسل اور (ثمرہ) ہے۔

ورنہ اس تصدیق کے بغیر کسی کو ایمان کی کیا خبر تھی۔ سب حضور ﷺ کے بتانے پر مان گئے اور آپ کے جھکنے پر جھک گئے۔

۸۶۱ تفصیلات ایمان کا بیان۔

۱۔ ایمان باللہ ۲۔ ایمان بالکتب ۳۔ ایمان بالملائکہ ۴۔ ایمان بالرسل

۸۶۲ ایمانیات میں مذکورہ ترتیب کی حکمت۔

ایمان باللہ تو مقصودِ اصلی ہے اس لئے سب پر مقدم ہے ترتیب لحاظِ مراتب سے نہیں' لحاظِ نزولی سے ہے' ترتیبِ نزولی میں رسول پر ایمان سب سے آخر اور ترتیبِ عروجی میں سب سے اول ہے سو رسول پر ایمان ایک جہت میں اول اور ایک جہت میں آخر ہے۔ آپ ﷺ کو اول و آخر کی دونوں شانیں عطا کی گئی ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسولوں کی طرف توحید کا پیغام بھیجا۔

(۲) پیغام لانے کے لئے ملائکہ مقرر ہوئے۔ اس لئے یہاں پہلے ان پر ایمان کی بات ہوئی تاکہ پیغام لانے والوں پر اعتماد قائم ہو جائے کہ پیغام صحیح لایا گیا اس میں لانے والوں نے کوئی ردوبدل نہیں کیا۔

(۳) پیغامِ وحی کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں آیا۔ اس لئے اب ان پر ایمان کی بات ہوئی تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ خط اور پیغام یہی ہیں جو محبوبِ حقیقی کی طرف سے موصول ہوئے۔

(۴) پیغامِ الٰہی وصول کرنے والے برگزیدہ رسول ہیں۔

وہی مکتوب الیہ ہیں جن کی طرف خالق کائنات نے اپنے راز' پیغام اور احکام بھیجے تاکہ

وہ اس کے بندوں تک پہنچا دیں، سمجھا دیں اور عمل کرکے دکھا دیں اس لئے سب سے آخر ایمان اُن پر ہوا۔

۸۶۳ پیغمبروں پر ایمان لانے میں کوئی تفریق نہیں۔

۸۶۴ مومن سرتاپا احکامِ الٰہی کے سامنے سماعت و اطاعت کا پیکر ہوتے ہیں۔

۸۶۵ مومن ہمہ تن طالبانِ مغفرت ہوتے ہیں۔

۸۶۶ مومن ہمہ وقت رجوع الی اللہ کے دھیان میں رہتے ہیں۔

آیت	مضمون
۲۸۶	۸۶۷

اللہ تعالیٰ صرف بقدرِ طاقت ذمہ داری دیتا ہے۔

شریعت نے کسی پر اس کی ہمت و استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا۔ یہی اسلام کا "اصولِ یُسر" ہے جس سے دین پر عمل کرنا ہر ایک کے لئے آسان بنایا گیا ہے، مشکل نہیں۔

۸۶۸ ہر ایک کے عمل کی جزا اسی کو ملتی ہے۔

۸۶۹ ہر ایک کے عمل کی سزا بھی اسی کو ملتی ہے۔ اس کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جاتا۔ یہی اسلام کا نظامِ عدل ہے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ قائم کیا گیا ہے۔

۸۷۰ بھول چوک اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست۔

۸۷۱ پیشتر امتوں کی طرح سخت احکام کا بوجھ نہ ڈالنے کی درخواست۔

۸۷۲ طاقت و استعداد سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالنے کی درخواست۔

۸۷۳ بارگاہِ الوہیت سے درگزر کی درخواست۔

۸۷۴ بارگاہِ الوہیت سے بخشش و مغفرت کی درخواست۔

۸۷۵ بارگاہِ الوہیت سے رحم کی درخواست۔

۸۷۶ اللہ تعالیٰ ہی کارساز و کار آفرین ہے اس مولیٰ سے طلبِ ولایت، اس دوست سے طلبِ دوستی اور اس مددگار سے طلبِ مدد کرنی چاہیے۔

۸۷۷ کفار کی شکست اور ان پر اپنے غلبہ و کامرانی کی دعا۔

۸۷۸ ۔ مذکورہ بالا تین آیات (۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶) کا تعلیماتی و تربیتی پہلو

بخاری، مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں ابوھریرہؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ پہلی آیت: ۲۸۴ کے نزول پر صحابہ کرام بھی لرز اٹھے کہ اگر دل کے وساوس و خطرات اور ذہنوں کے خیالات پر بھی محاسبہ اور حساب ہوگا تو بخشش بڑی مشکل ہو جائیگی حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ رحمت پناہ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ آیت کریمہ کے اس حکم پر عمل کر کے بخشش تک پہنچنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم پر کچھ رحم و کرم ہونا چاہیے۔

حضور ﷺ نے صحابہ کرام کی یہ روحانی مشکل یوں حل فرمائی کہ ان کی توجہ راہ توکل اور شیوۂ تسلیم و رضا کی طرف پھیر دی۔ اور اشارہ فرمایا کہ مشیت الٰہیہ مائل بہ حساب ہے اور قدرت الٰہیہ مائل بہ جلال اس وقت براہ راست درخواست نہ کرو بلکہ سراپا تسلیم بن کر اس کی دہلیز پر گر پڑو۔ اور بجائے رعایت و سہولت طلب کرنے کے "**سمعنا و اطعنا**" (ہم نے سنا اور قبول کیا) کا ورد کرو، اس کی بندگی و اطاعت کا دم بھرو اور پیکران رضا بن کر اس کی بارگاہ میں پڑے رہو۔ جب اس کے جلال پر جمال کی مسکراہٹ آنے لگے اور اس کی مشیت میں رحمت کی ٹھنڈک آنے لگے تو "**غفرانک**" (ہم تیری بخشش چاہتے ہیں) پکار اٹھنا۔ اور بار بار کہنا کہ مولا ہمیں اپنے اعمال پر اعتماد نہیں صرف تیری بخشش پر اعتماد ہے۔ ہمارا اپنی عبادات پر تکیہ اور بھروسہ نہیں صرف تیری مغفرت پہ بھروسہ ہے۔ اور ساتھ یہ بھی عرض کرتے چلے جانا "**ربنا والیک المصیر**" (ہمارے مالک ہم نے تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے) جیسے تیری مرضی معاملہ فرمانا ہم نے تیرے رسول ﷺ سے تیری آیتیں سنیں، ہم نے سنتے ہی انھیں مان لیا اور جیسے تیرا فرمان تھا اپنی بساط بھر ان پر عمل کیا۔ مگر ہم اپنے اعمال کو نگاہ میں نہیں رکھتے فقط تیری بخشش پہ نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ صحابہ کرامؓ تربیت مصطفوی ﷺ سے اشارے پاگئے اور شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر کے گڑگڑانے لگے رحمت الٰہی جوش میں آگئی۔۔۔ آواز آئی عاجزی کرنے والو گھبراؤ نہیں، طاقت سے بڑھ کر کسی پر بوجھ نہیں ڈالا جائے گا نہ ہی کسی کو استطاعت سے زیادہ تکلیف دی جائے گی۔ شان الٰہی کو مزید مائل بہ جمال دیکھ کر نگاہ **مصطفیٰ** ﷺ نے مزید تربیت کی اور فرمایا اب یوں بھی کہو رب کریم اگر کام بھول کر بھی کر بیٹھتے ہیں اور کئی خطائیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں اگر ان پر بھی مواخذہ ہو گیا تو ہم کمزور لوگ مارے جائیں گے، ہمارے بوجھ اور بھی ہلکے فرما، پھر نگاہ **مصطفیٰ** ﷺ نے تربیت کی مزید ادب سکھایا اور فرمایا بار بار "**ربنا**" (ہمارے پروردگار) پکارو پھر عفو "**واعف عنا**" طلب

کرو۔۔ گناہ اور غلطی کی معافی ہو جانا بھی بڑی بات ہے' جب معافی کی بات ہو جائے پھر مغفرت "واغفرلنا" مانگو۔۔۔ یہاں سے عنایات و نوازشات کا آغاز ہوگا۔ جب بخشش و عنایت کا دروازہ کھل جائے تو پھر رحمت "وارحمنا" مانگو۔۔۔ جب رحمت کی خیرات ملنے لگے تو پھر اس سے اس کی دوستی وولایت "انت مولٰنا" مانگو۔۔۔ وہ اپنی دوستی اور ولایت عطا کر دے تو پھر فانصرنا نصرت مانگو۔۔۔ وہ کافروں پر مدد و نصرت عطا فرمائے گا۔ تربیت محمدی ﷺ نے اپنے غلاموں کو سات مرحلوں میں سارا سفر طے کرادیا۔

۱۔ ایمان ۲۔ سمع وطاعت ۳۔ عفو ۴۔ مغفرت ۵۔ رحمت ۶۔ ولایت ۷۔ نصرت

ہمیں چاہیے کہ ہم ان تعلیماتی لطائف اور تربیتی معارف میں غور کریں اور اپنے احوال کو اسی طرح درست کریں۔ جنھوں نے اپنے احوال درست کر لئے ہیں وہ اسی دعا کے ثمرات سے خوب بہرہ یاب ہو رہے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا:۔

"وعدنی ربی ان یدخل الجنۃ من امتی سبعین الفا لاحساب علیھم ولا عذاب مع کل الف سبعون الفا۔۔ الحدیث" (ترمذی' ابن ماجہ' مسند احمد رواہ ابوامامہ)

(میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمالیا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب و عذاب کے جنت میں داخل فرمادیگا اور ان میں سے ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ستر ہزار مزید ہونگے)۔

حواشی

آیت : ۱ الٓمّٓ

۱۔ الٓمّٓ کی معنوی وضاحت اور اعجازِ شانِ محمدی ﷺ

یہ حروف اصطلاح میں مقطعات کہلاتے ہیں اور قرآنِ مجید کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ یہ الفاظ کے قائم مقام ہیں۔ بعض حروف بول کر الفاظ مراد لینا دنیا کی تمام زبانوں میں مروج ہے۔ انگریزی زبان میں یہ تصور خاصا رواج پا چکا ہے انہیں انگریزی ادب میں (ABREVIATION) کہتے ہیں۔ یہی مخففات مختلف علوم اور فنون میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ علم ریاضی میں (Mathematical Symbols)' علم کیمیا میں فارمولا (Formula)' علم موسیقی میں (Musical Signs) اور قدیم وجدید زبانوں میں (Alphabet) وغیرہ کا تصور خاصا معروف ہے۔ بہت سا علمی سرمایہ ان حروف اور علامات واشارات کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ اہلِ عرب کے قدیم شعری اور نثری نمونوں سے یہ تاریخی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ عہدِ رسالت میں بھی یہ ادبی اسلوب موجود تھا اور وہ مختلف حروف کے ذریعے خاص الفاظ اور معانی و مطالب کا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ دورِ جاہلیت کے عربوں کے اس اسلوب سے شناسا اور مانوس ہونے کی بناء پر ہی قرآنِ مجید نے حروفِ مقطعات کے انداز کو اپنایا اور یہ انداز علمی وادبی لحاظ سے مخالفین کا ہدفِ تنقید نہ بن سکا۔

قرآنِ حکیم میں حروفِ مقطعات کا فلسفہ اور ان کی معنوی اہمیت وافادیت پر تفصیلی روشنی ہم نے "تفسیر منہاج القرآن" کے مقدمے میں ڈالی ہے۔ اس موضوع کے جملہ پہلوؤں سے آگہی کے لئے مقدمے کا مطالعہ فرمائیں۔ یہاں صرف الف' لام' میم کے حوالے سے مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔ یہ تین حروف اسی ترتیب کے ساتھ سورۂ بقرہ کے علاوہ ان پانچ سورتوں (آلِ عمران' العنکبوت' الروم' لقمان اور السجدہ) کی ابتداء میں بھی آئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ الٓمّٓ اور دیگر حروفِ مقطعات کا حقیقی معنیٰ و مراد صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی معلوم ہے کیونکہ یہ ان کے درمیان راز ہیں

میانِ طالب و مطلوب رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

دوستوں کے درمیان محبت اور افشائے مقصد کے لیے کئی اشارات' علامات اور حروف والفاظ استعمال ہوا کرتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ دو دوستوں کے درمیان مخصوص رازدارانہ اشارات کو ازخود کوئی تیسرا شخص نہیں جان سکتا۔ جب تک اسے بطور خاص بتا نہ دیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا **للّٰہ فی کل کتاب سر و سرہ فی القران اوائل السور** (تفسیر کبیر) (اللہ تعالیٰ کے ہر کتاب میں کچھ راز ہوتے ہیں اور قرآن کے راز سورتوں کے ابتدائی حروف ہیں)۔ اسی طرح کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ شعبیؒ اور ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ انھیں عام لوگ نہیں جانتے۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں۔ حروفِ مقطعات کا صحیح معنی سوائے نبی اکرم ﷺ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ مگر اولیاءِ کاملین کو ان کا علم بارگاہِ نبوت سے نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ فیضانِ نبوی سے یہ حروف ان کے ساتھ اس طرح ہمکلام ہوتے ہیں جیسے اس ذاتِ ستودہ صفات سے ہمکلام ہوتے تھے۔ جس کی ہتھیلی میں کنکریوں نے باری تعالیٰ کی تسبیح کی تھی۔ بطریقِ تاویل 'الٓمٓ کی نسبت چند آراء بیان کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ قرآنِ مجید کا نام ہے۔ اس لحاظ سے **"ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ"** کا اشارہ **الٓمٓ** ہی کی طرف ہے اور یہی اس کلام کا مرجع ہے۔ کلبی' سدی اور قتادہ رحمھم اللہ سے اسی طرح ثابت ہے۔

۲۔ سورۂ بقرہ کا نام ہے۔ جن سورتوں سے پہلے ایسے حروف آئے ہیں وہ ان سورتوں کے نام ہیں مثلاً حٰمٓ وغیرہ۔ خلیل' سیبویہ اور اکثر متکلمین کی یہی رائے ہے۔

۳۔ **الٓمٓ** سے مراد **"انا اللہ اعلم"** ہے۔ الف "انا" پر' لام "اللہ" پر اور میم "اعلم" پر دلالت کرتی ہے۔ جس کا معنی ہے "میں اللہ ہی جانتا ہوں" کہ یہ عظیم کتاب شک و شبہ سے بالاتر ہے یا اس کے میری نازل کردہ کتاب ہونے میں کچھ شک نہیں۔ یہ معنی حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے۔

۴۔ **الٓمٓ** میں الف سے مراد اللہ' لام سے مراد جبرائیل اور میم سے مراد محمد ﷺ ہے۔ جس کا معنی یہ ہے۔ (یہی وہ کتاب عظیم ہے) جسے اللہ نے جبرائیل کے ذریعے حضرت محمد

ﷺ کی طرف بھیجا ہے اور یہ حقیقت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ قول بھی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

۵۔ الٓمٓ سے مراد باری تعالیٰ ہی کی مختلف صفات ہیں۔ اس لحاظ سے یہ حروف اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء قرار پاگئے۔ سعید بن جبیرؒ اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح ثابت ہے۔ بعض علماء نے الف سے باری تعالیٰ کی الوہیت' لام سے اس کا لطف و کرم اور میم سے اس کا مجد و بزرگی مراد لی ہے۔ اس توجیہہ کی بھی روایت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ملتی ہے۔

۶۔ بعض علماء نے انہیں اور دیگر مقطعات کو "متشابہات" میں شمار کیا ہے۔ یہ قول حسین بن فضل کا ہے۔ لہٰذا عوام کا یہ مسئلہ نہیں کہ وہ ان کے معانی و مطالب کی جستجو میں سرگرداں ہوں۔ کیونکہ ان کیلئے فہمِ قرآن کا مدار مقطعات کی معرفت پر نہیں۔ ہر شخص اپنی استعداد و وسعت کے مطابق مکلف ہے۔

۷۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ حروفِ مقطعات بعض سورتوں کے شروع میں لوگوں کو تنبیہہ کرنے کیلئے آئے ہیں کہ لوگ خاص طور پر اگلی گفتگو بڑے انہماک سے سنیں۔ قدیم عرب بھی اپنے خطبات میں ایسا کرتے تھے۔ یہ قطرب کا قول ہے۔

۸۔ ایک رائے کے مطابق الٓمٓ اور دیگر حروفِ مقطعات محض حروف پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ الفاظ پر نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جو کتابِ الٰہی ہے حروف سے عبارت ہے اور تمہاری زبان بھی ان ہی حروف سے عبارت ہوتی ہے۔ جب الفاظ و عبارت کا مادہ یہی حروف ہیں تو تم ایسی کتاب یا عبارت پیش کرو۔ اگر اس قدرِ مشترک کے باوجود تم اس جیسی کتاب وجود میں نہیں لا سکتے تو مان لو کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے' انسانی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ ورنہ تم بھی ان حروف کو ترتیب دے کر ایسی عبارت پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ گویا حروفِ مقطعات جہاں بھی آئے ہیں قرآن کی حقانیت کی دلیل بن کر آئے ہیں اور الٓمٓ کے فوراً بعد تو بالخصوص چیلنج بھی یہی کیا جا رہا ہے کہ "یہ وہ کتاب ہے جس میں انسانی کسب و کاوش کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سراسر وحی الٰہی ہے"

الغرض الٓمٓ یا دیگر حروفِ مقطعات کا جو بھی مفہوم ہو ایک بات بڑی واضح ہے کہ یہ حروف وحیٔ قرآنی اور شانِ محمدی ﷺ کا عظیم اعجاز ہیں جس کی مثال کسی اور کلام میں

نہیں مل سکتی۔
یہ اعجازِ وحی بھی حضور ﷺ کے خصائص و امتیازات میں سے ہے کیونکہ آپ کی شانِ اقدس میں صراحۃً آیا ہے **اوتیت بجوامع الکلم** (مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے) یہ آپ ﷺ کی اعجازی اور امتیازی شانوں میں سے ایک شان ہے۔ مزید یہ کہ انہی حروفِ مقطعات میں سے بعض آپکے خطاباتِ گرامی بھی ہیں۔ مثلاً یٰسین، طٰہٰ، وغیرھا۔

آیت ۲: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ

۲۔ عظمت و حقانیت قرآن اور صداقتِ رسالتِ محمدی ﷺ

ذٰلِکَ کا لفظ عام طور پر کسی ایک چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے جو دور ہو اور نزدیک کے لیے **ھذا** کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بجائے اسم اشارہ قریب کے اشارہ بعید کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہ ہیں:۔

۱۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی چیز ظاہرًا قریب ہوتی ہے لیکن اپنی عظمت اور مرتبے کی بلندی کے اعتبار سے دور ہوتی ہے کہ انسانی ذہن اور فکر کو اس تک رسائی اور دسترس نصیب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس چیز کا قرب حسی ہوتا ہے مگر بعد رتبی۔ قرآنِ مجید حسی طور پر تو سب کے قریب ہے کیونکہ ہر سننے والا اسے سن رہا ہے، دیکھنے والا دیکھ رہا ہے اور پڑھنے والا پڑھ رہا ہے۔ لیکن اپنے رتبہ و عظمت اور قدر و منزلت کے لحاظ سے اس قدر بلند ہے کہ انسانی فہم وادراک کی وسعتیں اسے چھو تک نہیں سکتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مخالفینِ اسلام کی متعدد کوششوں کے باوجود ایک آیت کے مثل بھی نہیں بنائی جا سکی۔ یہ اس کا نمایاں اعجاز ہے کہ یہ انسانی دسترس سے بہت دور ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کی عظمت اور بعدِ رتبی کے اظہار کیلئے ذالک اسم اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے بہت سے انبیاءِ کرام علیہم السلام نے اپنی امتوں کو اس دنیا میں خدا کے آخری نبی ﷺ اور آخری پیغام کی آمد کی خوشخبری سنائی تھی۔ سابقہ کتابوں اور صحیفوں میں اس نورِ ہدایت کے نازل ہونے کا تذکرہ کئی مقامات پر موجود تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے

بھی اس آخری کتاب کی اطلاع دی تھی۔ جس کا علم یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی تھا۔ بلکہ عرصہ دراز تک یہ لوگ اس کا انتظار کرتے رہے تھے کہ شاید یہ شرف بھی انہی کی نسل یعنی بنی اسرائیل کو حاصل ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں اپنی امت کو سنایا تھا:۔

"میں ان کیلئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا (یعنی اس پر کتاب نازل کروں گا) اور جو کچھ میں اسے حکم دونگا وہی وہ ان سے کہے گا"۔

(تورات، استثناء باب ۱۸:۱۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کھلے انداز میں یہ اعلان کر دیا تھا:۔

"اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ ہو جائے تو تم یقین کرو اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ سے اس کا کچھ نہیں ○ ۔۔۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگا"۔

(انجیل یوحنا، باب ۱۴: ۲۹، ۳۰۔ باب ۱۶: ۱۳)

لہٰذا یہود اور نصاریٰ کو بالخصوص متوجہ کرنے کیے لیے **ذٰلِکَ** کا اسم استعمال کیا گیا کہ یہی وہ کلام اور یہی وہ سچائی کی راہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ جس کا تم سب کو انتظار تھا اور جس کی خوشخبری تمہارے انبیاء وحیِ الٰہی کی صورت میں دیتے چلے آئے تھے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے سورۂ فاتحہ میں یہ دعا کی گئی ہے **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ** (اے اللہ! ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا (جس پر تیرے انعام یافتہ بندے چلتے رہے ہیں) یہ ایک سوال تھا۔ جس کا جواب سورۂ بقرہ کے آغاز میں دے دیا گیا کہ جس راہِ ہدایت کے تم متلاشی ہو۔ یہی وہ کتاب ہے جو اس راہِ ہدایت کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہاں اشارہ بعید، سورۂ فاتحہ کے سوال کے حوالے سے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی راہِ ہدایت کی نسبت جو سوال ذہنوں میں گردش کر رہا تھا۔ اس کا جواب **ذالک الکتاب** کے الفاظ کے ذریعے فراہم کر دیا گیا۔

نفیٔ ریب کا چیلنج

"لَا رَیْبَ فِیْہِ" کے الفاظ میں عمومیت بھی ہے اور اطلاق بھی۔ گویا تمام دنیائے کفر کو یہ چیلنج کیا جا رہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان الفاظ کے دو بنیادی مفہوم ہیں۔

ایک یہ کہ اسکے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے ثقہ اور معتبر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شک کرنے والے تو عہدِ رسالت میں بھی موجود تھے اور اب بھی ہیں۔ منکرین اپنی کم فہمی کی بناء پر شک پیدا کرنے کی جتنی کوششیں چاہیں کرتے رہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے وارد ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر شخص کوتاہ بینی کی بناء پر اپنی جسارت میں بالآخر خود ہی ناکام و نامراد ہو جائے گا اور یہ کتاب ابد الآباد تک ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر رہے گی۔ یہ ایک ایسا تاریخی چیلنج ہے جس کو آج تک کوئی جھٹلا نہیں سکا۔

شک کی امکانی صورتیں

کسی بھی کتاب میں شک درج ذیل پہلوؤں پر وارد ہو سکتا ہے:۔

ا۔ کتاب کا اصلی، واقعی اور حقیقی ہونا۔

"GENUINENESS" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ بانیٔ مذہب نے کوئی کتاب اپنی امت کو دی بھی تھی یا نہیں؟ اگر دی تھی تو کیا وہ وہی کتاب تھی جو اس پر وحی کی صورت میں نازل ہوئی؟ اور اگر وہ وہی کتاب ہے تو کیا موجودہ کتاب فی الواقع وہی ہے یا کوئی اور؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو "GENUINE" یعنی اصلی، واقعی اور حقیقی کہا جاتا ہے۔

۲۔ کتاب کا قابلِ اعتبار اور قابلِ اعتماد ہونا۔

"AUTHENTICITY" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ بانیٔ مذہب کی وفات کے بعد اس کتاب میں کوئی لفظی ردوبدل تو نہیں ہوا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو کتاب کو "AUTHENTIC" کہا جاتا ہے۔

۳۔ کتاب کا ہر قسم کی کمی سے محفوظ ہونا۔

"INTEGRITY" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ بانیٔ مذہب کی وفات کے بعد اس کتاب میں کسی قسم کی کمی بیشی تو نہیں کی گئی یا بانیٔ مذہب نے خود اس قدر مکمل حالت میں دی تھی کہ اس میں ابدالآباد تک حذف و اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اگر جواب کمی بیشی کی نفی میں ہو تو کتاب کو تمام اور مکمل یعنی "INTEGRET" کہا جاتا ہے۔

۴۔ کتاب کا ہر زمانے میں قابل عمل ہونا۔

"PRACTICABILITY" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ وہ کتاب ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات کے باوجود قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو "PRACTICABLE" کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی کتاب پر مذکورہ بالا پہلوؤں سے اعتراض یا شک وارد کیا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی کتاب ان چاروں معیارات پر پوری اترے اور اس میں کسی لحاظ سے بھی شک ممکن نہ ہو تو صرف اس کی نسبت ہی ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

نفیٔ ریب کے دعوے کا تقابلی جائزہ۔

قرآن کے سوا آج مذاہب کی دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو مذکورہ بالا چار معیارات میں سے کسی ایک پر بھی کماحقہ پوری اتر سکے۔ اکثر کتابیں ایسی ہیں جنہیں تحریری صورت میں بانیانِ مذاہب نے خود اپنی امتوں کو منتقل نہیں کیا بلکہ ان کے بعد ان کے پیروکاران کی بیان کردہ زبانی تعلیمات کو ضابطۂ تحریر میں لے آئے جیسے انجیل۔ اگر کسی بانیٔ مذہب نے کوئی کتاب تحریری صورت میں اپنی امت کو دی بھی تو یہ امر محلِ نظر ہے کہ آج موجود کتاب وہی کتاب ہے جو اس نے اپنی امت کو دی تھی یا یہ کوئی اور ہے۔ مثلاً آج کی تورات (خمسہ موسوی) کو لیجئے۔ اس کی کتاب "استثناء کے باب ۳۴ آیات نمبر ۵، ۶، ۷، ۸" کو ملاحظہ فرمائیے:

"پس خداوند کے بندہ موسیٰؑ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اسے اس نے موآب کی ایک وادی بیت فغور کے مقابل دفن کیا۔ پر آج تک کسی

آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس کا تھا اور نہ اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی اور بنی اسرائیل موسیٰ کے لئے موآب کے میدانوں میں تیس دن تک روتے رہے"۔ (کتاب مقدس یعنی بائبل' مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۰۲' REVISED URDU VERSION 93)

ان آیات کو پڑھنے کے بعد ذرا فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ کتاب وہی ہو سکتی ہے جو حضرت موسیٰ نے خود اپنی امت کو دی یا ان پر ان کی زندگی میں نازل کی گئی۔ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ نہ یہ کتاب سیدنا موسیٰؑ پر نازل ہونے والی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے خود یہ کتاب اپنی امت کو دی ہو۔ یہ تو ان کی وفات کے بعد لکھی گئی کتاب معلوم ہو رہی ہے۔ تورات اور انجیل کے موجودہ تمام نسخے ایسے نمونوں سے لبریز ہیں۔ یہ امر عالم یہودیت اور عالم عیسائیت کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

یہی حال دیگر کتابوں کا ہے۔ لہٰذا جب کوئی کتاب اصلی' واقعی اور حقیقی ہونے کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی' تو ان میں ردوبدل یا کمی بیشی کی بات ہی غیر ضروری ہوجاتی ہے۔ اگر ان معیارات پر بھی کتابوں کا جائزہ لینا چاہیں تو ان کے اندر موجود کھلے تضادات اور عجیب وغریب تصورات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ نہ وہ معتبر ہیں نہ مکمل اور نہ ہی قابل عمل۔ اس لحاظ سے ہر کتاب شک وشبہ کا مورد بن چکی ہے۔

لیکن قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو اصلی' واقعی اور حقیقی ہے کیونکہ یہ نبی اکرم ﷺ نے تحریری صورت میں اپنی امت کو عطا کی۔ یہی وہ کتاب تھی جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور یہی وہ کتاب ہے جو آج امت کے پاس موجود ہے۔ پوری دنیائے کفر ہزاروں تعصبات کے باوجود اس کا کوئی دوسرا نسخہ ثابت نہیں کر سکی۔ جب کہ عیسائیت آج بھی انجیل کے چار مختلف نسخوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عالم عیسائیت میں انجیل کے ایک سو تیس نسخے تیار ہوئے جن میں سے قسطنطین اعظم کے زمانے میں ۱۲۹ کو مسترد کر دیا گیا تاکہ عیسائی مذہب کی ساکھ بحال رہ سکے مگر ایک نسخے پر پھر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔

○ قرآن کا قابل اعتماد ہونا بھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ یہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ہر قسم کے ردوبدل اور تحریف وترمیم سے محفوظ ہے۔ روئے زمین پر

کروڑوں مسلمان مختلف علاقوں، مختلف نسلوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہر جگہ قرآن مجید لکھا، پڑھا اور چھاپا جاتا ہے۔ اس کے کروڑوں قدیم اور جدید، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے دنیا میں موجود ہیں لیکن کسی نسخے میں ایک لفظ یا حرف تو در کنار صرف زیر وزبر کا اختلاف بھی نہیں پایا جاتا۔ اس سے بڑھ کر اس کی AUTHENTICITY کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

○ قرآن کا بتمام و کمال مکمل ہونا بھی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ اس میں آج تک نہ کسی آیت یا لفظ کی کمی واقع ہوئی اور نہ زیادتی۔ مدینہ، بیت المقدس، ترکی، روس، ہالینڈ اور دنیا کے کئی دوسرے مسلم و غیر مسلم ممالک میں قرآنِ مجید کے پرانے نسخے موجود ہیں جو عہدِ صحابہ اور تابعین کے ہیں۔ ان میں اور عصرِ حاضر کے مطبوعہ نسخوں میں کمی یا بیشی کی ایک مثال بھی ثابت نہیں کی جا سکی اور نہ ہی یہ امر تاریخی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے قرآن کی INTEGRITY کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

○ جہاں تک قرآن کے قابلِ عمل ہونے کا تعلق ہے۔ اس کا علم وہدایت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ پہلے بھی قابلِ عمل اور نتیجہ خیز تھا آج بھی قابلِ عمل اور نتیجہ خیز ہے اور قیامت تک اس کی یہ حیثیت اسی طرح برقرار رہے گی۔ اس سے کوئی کس قدر استفادہ کرتا ہے یہ ہر شخص اور ہر قوم کے نصیب کی بات ہے اس سے قرآن کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی متاثر نہیں ہوتی۔

آج بھی کئی نئی دریافت ہونے والی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن چودہ سو سال پہلے کر چکا ہے۔ کئی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور قانونی تصورات ایسے ہیں جنہیں اقوامِ عالم ترقی یافتہ اعلیٰ تصورات کے طور پر اپنے نظاموں میں اپنا رہی ہیں۔ حالانکہ ان کی صراحت پہلے سے ہی قرآن میں ہو چکی ہے۔ یہ مقام ان تفصیلات کے بیان کے لئے مناسب نہیں۔ اپنے اپنے مقام پر ان کا تفصیلی تذکرہ کر دیا جائیگا۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا درکار ہے کہ قرآن اور اس کا علم آج بھی جدید ہے اور مستقبل میں بھی ہمیشہ جدید رہے گا۔ کسی بھی دور کے تقاضے اس کے قابل عمل ہونے کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کا نقص ہے۔ قرآن ایسے نقص سے پاک ہے۔

الغرض قرآن کے کسی لحاظ سے بھی ثقہ اور معتبر ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہزاروں پہلوؤں کا بیان کتنے خوبصورت انداز میں صرف تین لفظوں "لَا رَیْبَ فِیْہِ" میں کر دیا گیا ہے۔ اسی چیلنج سے قرآن مجید کا ابتدائی تعارف کرایا گیا ہے کیونکہ یہ اسلام کی حقانیت کی ایسی قطعی اور ابدی دلیل ہے جس کا انکار کسی بھی صاحبِ عقلِ سلیم کے لئے ممکن نہیں۔

لفظ "الکتاب" کی معنوی حکمت۔

اس آیت میں کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کلام کا نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ "وہ کلام ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں" کیونکہ کلام نفسی بھی ہوتا ہے اور لفظی بھی۔ کبھی کلام کا اطلاق صرف صاحبِ کلام کے معنی و مفہوم پر ہوتا ہے اور کبھی الفاظ وعبارات پر بھی۔ لیکن "کتاب" کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کلام "معانی ومطالب" اور "الفاظ وعبارات" دونوں کا جامہ زیبِ تن نہ کیے ہوئے ہو۔ قرآن مجید نے خود کو "الکتاب" کہہ کر یہ شبہ دور کر دیا کہ اس کا نزول صرف معانی ومطالب کی صورت میں ہوا ہے یا الفاظ کے ساتھ۔ کیونکہ کلامِ الٰہی الفاظ و معانی دونوں کے مجموعے کے بغیر کتاب نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن صرف معانی و مطالب کی صورت میں نازل نہیں کیا بلکہ کتاب کی حیثیت سے نازل کیا ہے۔ اس میں معانی اور الفاظ دونوں شامل ہیں۔ دونوں منزّل من اللہ ہیں چنانچہ ان دونوں میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

مستزاد یہ کہ کتاب، کلام نفسی اور کلام لفظی کے علاوہ خاص ترتیب کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ کلام کے باہمی ربط و ترتیب کے بغیر "کتاب" کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ اس آیت نے اس حقیقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ قرآن کی ترتیب جس پر کتاب واقع ہے بھی منزل من اللہ ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسے صحابہ نے اپنی مرضی سے تراش لیا ہوگا۔ بلکہ ترتیبِ قرآنی بھی کتاب کا حصہ ہونے کی بنا پر خدا کی نازل کردہ ہے اور ہر شک سے بالاتر ہے۔ ہر چند کہ اسے ترتیب کتابی کے ساتھ ایک نسخے کی صورت میں مدوّن عہدِ رسالت کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں کیا گیا لیکن قرآن کی یہی ترتیب اور کتاب عہدِ رسالت میں بھی تھی۔ اسی ترتیب سے،

کئی صحابہ حافظ قرآن تھے اور اسی کے مطابق حضور ﷺ نے حضرت جرائیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔ بلکہ یہی کتابی ترتیب نزول سے بھی پہلے لوح محفوظ میں موجود تھی۔

چنانچہ قرآن نے "الکتاب" کا لفظ استعمال کر کے ہر شبہ کا ازالہ کر دیا اور اتنا جامع اعلان کیا گیا کہ عقل انسانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ "**ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ**" کا مفہوم یہ قرار پایا کہ "یہ (قرآن) وہ عظیم کتاب ہے جو الفاظ و معانی اور نظم و ترتیب ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔ اس کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی قسم کے شک کی گنجائش موجود ہو۔ الغرض قرآن کی عظمت و حقانیت کا یہ ناقابل تردید دعویٰ رسالتِ محمدی ﷺ کی صداقت کی ابدی دلیل ہے۔

آیت ۲:- اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

۳- ایمان بالغیب اور شانِ نبوّت

ایمان بالغیب میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مدارِ ایمان صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کامل اعتقاد اور یقین ہے۔ اللہ ؑ کی ذات و صفات، ملائکہ، قیامت، بعث بعد الموت، جنت و دوزخ، جزا و سزا وغیرہ سب غیب ہیں۔ نہ ان کا ادراک حواس کے ذریعے ممکن ہے نہ عقل سے، ان پر ایمان محض اس لئے لایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر دی حتیٰ کہ وحی قرآنی اور اس میں بیان کی گئی جملہ تعلیمات پر ایمان بھی زبانِ نبوت پر اعتماد ہی سے وجود میں آیا ہے لٰہذا یہاں سے یہ نکتہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان ہونے کا انحصار سراسر ایمان بالغیب پر ہے اور ایمان بالغیب کا کلی انحصار پیکر نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل اعتماد اور ناقابل شکست یقین پر ہے اس لئے ایمان کا مرکز و محور ہی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پختہ نسبت و اعتقاد ہے اگر اس میں کمزوری آگئی تو

سارے عقائد و اعمال اکارت جائیں گے۔ اس حقیقت کی تائید خود غیب کے لفظ سے ہوتی ہے۔

غیب کا معنیٰ

غیب' غاب۔ یغیب سے مصدر ہے۔ جو چیز آنکھ سے مخفی ہو غیب کہلاتی ہے۔ اصطلاح میں جو چیزیں حواس ظاہری اور عقل' دونوں کے ادراک سے باہر ہوں اور ان کی خبر انبیاء علیہم السلام دیں' حقیقی غیب کہلاتی ہے۔ اس آیت کے تحت یہی مفہوم امام راغب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ **مالا یقع تحت الحواس ولا تقتضیہ بداھۃ العقول انما یعلم بخبر الانبیاء علیھم السلام** ("وہ امور جو حواس کے تحت نہیں آتے نہ ہی بداہت عقلی ان کا تقاضا کرتی ہے بلکہ ان کا علم صرف انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے حاصل ہوتا ہے")۔

اس امر کی تصدیق قرآن مجید کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ **عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۔** ("وہ غیب کا جاننے والا ہے۔ پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے' پس وہ ان کا آگے پیچھے حفاظت کا پہرہ مقرر کر دیتا ہے"۔ الجن ۲۶'۲۷)۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ **وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔** ("اور اللہ کی شان یہ نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے' ہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چن لیتا ہے پس (اس لحاظ سے) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ"۔ آل عمران: ۱۷۹)۔

چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کو غیب پر مطلع ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اسے حسب ضرورت بیان کریں اور لوگ ایمان لے آئیں اس لئے قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرض منصبی کی ادائیگی کا ذکر یوں کرتا ہے: **وَمَا هُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ** اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب بیان کرنے میں بخیل نہیں ہیں"۔ التکویر: ۲۴)

چنانچہ اس پر ایمان لانا تقویٰ کی پہلی علامت ہے۔

جن مخفی حقیقتوں پر بغیر دیکھے ایمان لانا ضروری ہے ان کے وجود کا علم کسی شخص کو اپنے ذرائع سے نہیں ہو سکتا بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع سے ان کے ہونے کا پتا چلتا ہے لہٰذا ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلا دلیل مان لینے کا نام ہے۔ یہ مقام ذات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل اعتماد اور آپ سے غیر مشروط وفاداری کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتا۔ گویا باری تعالیٰ کا وجود ہو یا فرشتوں کا' آخرت کا انعقاد ہو یا جنت و دوزخ کا' نزول وحی کا نظام ہو یا رسولوں کی بعثت کا' ہر چیز پر ایمان محض اس لئے لانا چاہئے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر دی ہے۔ اگر حضور علیہ السلام کا ارشاد ہی ایمان بالغیب کی بنیاد نہ ہو تو ہمارے پاس نہ قرآن کے قرآن ہونے کی کوئی دلیل باقی رہتی ہے اور نہ اسلام کی دیگر اعتقادی حقیقتوں میں سے کسی ایک کی۔ لہٰذا توحید' رسالت' آخرت' حشر و نشر اور پورے اسلام کی تعلیمات کی حقیقی اساس ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بسروچشم قبول کرنا ہے۔ اسی وثوق اور یقین کا نام ایمان بالغیب ہے۔

عمل سے پہلے "ایمان بالغیب" کی صورت میں نتائج کا یقین ضروری ہے کیونکہ عمل میں کامیابی کے لئے یقین کی قوت ناگزیر ہے۔ بعد ازاں تجربی اور معروضی نتائج کے مشاہدات سے یقین کا درجہ تصدیق کے باعث بلند ہوتا چلا جاتا ہے لیکن یہ مشاہداتی تصدیق انہی کو نصیب ہوتی ہے جو پہلے سے دولت یقین کے ساتھ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایمان بالغیب کے بغیر انسان درجۂ ایقان کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

مشاہدے پر ایمان لانا عقل کا شیوہ ہے اور غیب پر ایمان لانا عشق کا۔ عملی زندگی کی بنیاد تنقیدی عقل پر نہیں ایمانی عشق پر استوار کی جانی چاہئے۔ اسی تصور کو علامہ اقبال یوں واضح کرتے ہیں۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

چنانچہ قرآن مجید نے تقویٰ کی اساس بھی عقل کو نہیں عشق کو قرار دیا ہے جب تک عقلِ نظری اور فکرِ مادی حضورِ عشق میں قربان نہ ہو جائیں اور تنقید و تحقیق کے سب ظاہری پیمانے توڑ کر جامِ تسلیم نوش نہ کرلیں، تقویٰ کی پہلی منزل بھی طے نہیں ہو سکتی اور اس شرط کو پورا کئے بغیر قرآنی ہدایت بھی اپنے جلوۂ زیبا سے نقاب نہیں اٹھتی۔

آیت ۳: وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

۴ - اقامت صلوۃ اور دین مصطفوی کا عملی پہلو

"اقامتِ صلوٰۃ" متقین کی دوسری علامت ہے۔ قرآنی ہدایت سے کامل استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ خدا اور رسول اور آخرت کو محض مان لینا تقویٰ کیلئے کافی نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہی حقیقی ذمہ داریوں کا آغاز ہوتا ہے۔ تقویٰ کا سب سے پہلا اور فکری تقاضا ایمان بالغیب تھا۔ اب اس کا سب سے پہلا تقاضا "اقامتِ صلوٰۃ" ہے اس کے بغیر دعوئ ایمان میں سچا ہونے کی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ ایمان بالغیب کے فوراً بعد نماز کا حکم یہ حقیقت جانچنے کے لئے ہے کہ جو شخص خدا اور رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ کیا وہ خدا کے حضور سرِنیاز خم کرنے کو بھی تیار ہے؟ کیا وہ نبیؐ اکرم ﷺ کی اطاعت کی اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے جسے حضور علیہ السلام نے "**بين العبد والكفر ترك الصلوٰة**" (بندہ اور کفر کے درمیان فرق صرف نماز کا ہے) کے الفاظ میں بیان فرمایا۔ اگر اس کی زندگی ایمان کی یہ عملی شہادت پیش کرتی ہے تو وہ تقویٰ کی منزل کی طرف گامزن ہے۔ جس سے وہ ہدایتِ ربانی سے فیض یاب ہونے کے قابل ہوگا۔ ورنہ اس کے نصیب میں محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن یہ عمل ملحوظ رہنا چاہیے کہ نماز پڑھنے کو نہیں بلکہ نماز قائم کرنے کو شرطِ تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ (یعنی نماز قائم کرنے) سے کیا مراد ہے؟ مزید یہ کہ نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے میں کیا فرق ہے؟

قرآنِ حکیم نے ہر جگہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز کے سلسلے میں اکثر مقامات پر **اَقِمِ الصَّلٰوةَ**، **اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ**، **يُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ**، **اَلْمُقِيمِيْنَ الصَّلٰوةَ**، **مُقِيْمُ الصَّلٰوةِ** اور **اَقَامُوا الصَّلٰوةَ** جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اقامت کا مادہ قوم ہے اور "اقام الامر" کے معنی کسی کام کو درست حالت میں رکھنے کے ہیں۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں "اقامۃ الشئی توفیۃ حقہ (المفردات) (کسی چیز کی اقامت کا معنی اس کے تمام حقوق کو پورا کرنا ہے) چنانچہ اقامۃ الصلٰوۃ کا معنی نماز کو اس کے تمام حقوق کی رعایت کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ بنابریں صلوٰۃ کو ہر جگہ "اقامت" کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تنبیھا علی ان المقصود منھا توفیۃ شرائطھا لا الاتیان بھیئاتھا (تاکہ لوگوں کو تنبیہ ہو کہ نماز کے حکم سے مراد محض اس کی ظاہری صورت کے ساتھ پڑھنا نہیں بلکہ اس کی تمام شرائط اور حقوق کو پورا کرنا ہے) مذکورہ بالا مفہوم کی روشنی میں نماز قائم کرنا درج ذیل امور پر دلالت کرتا ہے:۔

۱۔ نماز قائم کرنے سے مراد اس کو تمام ظاہری اور باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ نماز کے ظاہری حقوق یہ ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ اور سنتِ نبویہ کے مطابق اس کے تمام فرائض و ارکان اور واجبات و سنن کا صحیح طور پر لحاظ رکھا جائے۔ جن میں ادائیگی نماز کے مسنون طریقے کے علاوہ اوقات کی پابندی' تمام نمازوں کی حفاظت و باقاعدگی' طہارتِ کاملہ کا اہتمام اور اسی قسم کے دیگر متعلقاتِ شرعیہ کی بھی رعایت شامل ہے۔ نماز کے باطنی حقوق یہ ہیں کہ حدیثِ نبوی کے مطابق کمال درجے کا خشوع و خضوع ہو' انہماک اور قلبی استغراق اس حالت کو پہنچا ہوا ہو کہ دل کو دیدارِ حق کی کیفیت نصیب ہو جائے۔ اس حالت کا نام احسان اور اس نماز کا نام "معراج" ہے۔ جسم و روح دونوں کا ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک و صاف ہونا اور چہرہ و دل کا کعبہ اور ربِّ کعبہ کی طرف متوجہ رہنا اقامتِ صلوٰۃ کا اولین تقاضا ہے۔ اگر جسم حالت نماز میں تھا لیکن دل و دماغ اس کی لذت و طمانیت سے محروم رہے بلکہ غم دوراں کی گردش میں محو رہے تو یہ نماز پڑھی ضرور گئی مگر قائم نہ ہو سکی۔

عشق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب (اقبالؒ)

۲۔ نماز قائم کرنے سے مراد یہ بھی ہے کہ "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ" (العنکبوت: ۴۵) کے اعلان کے مطابق وہ اس طرح ادا کی جائے کہ اس سے زندگی میں مطلوبہ تبدیلی اور انقلاب بپا ہو۔ نماز یادِ الٰہی کی وہ اعلیٰ صورت ہے جو انسان

کو ہر قسم کے ظلم اور بدی سے روکتی ہے اور خدا کے قرب و فضل کے حصول کا باعث بنتی ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت ارشاد فرمایا۔ "تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا" (آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رکوع و سجود یعنی نماز کی حالت میں رہتے ہیں اور اس کے باعث ہمہ وقت خدا کے فضل اور رضا کے متلاشی ہوتے ہیں) اسی طرح ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ" (سجدہ کر اور اللہ کے قریب ہو جا)

نوٹ:۔ قارئین کرام اس آیت کو پڑھ کر سجدہ ضرور کریں

گویا نماز قربِ الٰہی کے حصول کی ضمانت مہیا کرتی ہے۔ لہٰذا نماز قائم کرنے کا معنی یہ ہوا کہ اس کا اہتمام اس انداز سے کیا جائے کہ اس کے فوائد و ثمرات اور اثرات و برکات زندگی میں مترتب ہو کر رہیں اور جو عملی انقلاب نماز کے ذریعے برپا ہونا ضروری ہے اس کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ نماز بھی پڑھی جائے اور ہر قسم کی خیانت، کذب، منافقت، ظلم، استحصال، اور حرام خوری بھی جاری رہے۔ نماز کا قائم ہونا یہ ہے کہ زندگی میں نماز کو اس طرح جگہ ملے کہ بدی اور ظلم کیلئے کوئی جگہ نہ رہے۔

۳۔ نماز قائم کرنے کا تیسرا مفہوم یہ کہ اسے اجتماعی سطح پر ایک نظام کے طور پر بپا کیا جائے۔ جیسے اس آیت کریمہ سے مستفاد ہے۔ "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (اہل حق وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ہم زمین میں حکومت دیں تو وہ نماز کا نظام بپا کریں گے) (الحج ۲۲: ۴۱)

گویا محض انفرادی طور پر نماز کے پڑھے جانے سے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے "وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" (اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) کے تحت مختلف اجتماعی سطحوں پر جماعت کا انتظام ہونا چاہیے۔ لوگ مل جل کر باجماعت نماز ادا کریں تاکہ ان میں باہمی ربط و تعلق، نظم و نسق اور وحدت و یک جہتی کی فضا ہموار ہو۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک ہوں، چھوٹے بڑے کا فرق مٹے، معاشرتی مساوات کی بنیاد فراہم ہو اور اس پورے نظامِ وحدت و مساوات کی بنیاد خدا کے گھر سے ہی رکھی جائے۔ جس طرح انفرادی نماز کے کچھ حقوق و شرائط تھے۔ اس طرح نماز باجماعت کے بھی حقوق و شرائط ہیں۔ ہر سطح پر نماز کا قائم کرنا ان بنیادی تقاضوں کی

تکمیل چاہتا ہے۔ اگر باجماعت نماز میں نمازیوں کے جسم باہم ملے رہے۔ لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے دور رہے تو یہ نماز پڑھی تو گئی لیکن قائم نہ ہو سکی۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ نماز کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صحیح طریقے سے قائم کیا جائے تاکہ معاشرہ اس کے بابرکت نتائج سے بہرہ یاب ہو سکے۔ قرآن ریاکاری کی نمازیں پڑھنے والے ان لوگوں کو جو نماز کی روح اور اس کے حقوق کو نظرانداز کیے ہوئے ہیں' نمازی تو کہتا ہے مگر ان کے لیے سورہ الماعون میں سخت عذاب کی وعید بھی دیتا ہے۔ لیکن کسی جگہ ان کو نماز قائم کرنے والے نہیں کہتا محض نماز کے پڑھنے اور اس کے قائم کرنے میں یہی بنیادی فرق ہے کیونکہ دینِ مصطفوی ﷺ فقط رسمی دین نہیں بلکہ عملی دین ہے۔

آیت : ۳ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

۵ ۔ رزق و انفاق کا مفہوم اور مصطفوی انقلاب کی معاشیاتی بنیاد

انفاق متقین کی تیسری علامت ہے کہ انسان بخیل' تنگ دل اور زر پرست نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جن جن نعمتوں سے اسے نوازا ہے وہ دوسروں کو بھی ان میں شریک کرے۔ مال و دولت ہو یا کوئی اور نعمت' اس سے انتفاع اور استفادہ صرف اپنی ذات کی حد تک محدود نہ رکھے بلکہ اسے خدا کی مخلوق پر بھی خرچ کرے۔ یہ عمل باری تعالیٰ کی نعمتوں کا حقیقی شکر ہے اور خدا کی راہ میں اپنے ہاتھوں کو بند رکھنا کفران نعمت ہے۔ دوسروں کے لئے ایثار و قربانی اور نفع بخشی و فیض رسانی کے اس جذبے کے بغیر انسان تقویٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔

رزق کا لغوی معنی ۔

یہاں "رَزَقْنٰهُمْ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اپنی وسعت کے لحاظ سے کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ لغوی معنی کے اعتبار سے "**الرزق یقال للعطاء الجاری وللنصیب دنیویا کان او اخرویا**" (المفردات' المنار) رزق ——— عطا ہونے والی بخشش اور حصہ کو کہتے ہیں خواہ دنیوی ہو یا اُخروی' حسی ہو یا معنوی۔ اس معنی کے حوالے سے

مال و دولت، جاہ و عزت، علم و معرفت اور ہر قسم کی قوت و صلاحیت پر رزق کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیۂ کریمہ میں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ جو کچھ بھی کسی کو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے وہ اس میں سے خدا کی مخلوق کی ضرورتوں پر خرچ کرے۔ لہٰذا اہل ثروت اپنے مال و دولت میں سے ضرورت مندوں پر خرچ کریں۔ اہل جاہ و منصب، اپنے مقام و حیثیت کے ذریعے پریشان حال سائلوں کی مدد کریں اور ان کی دشواریوں کو رفع کریں۔ اہل معرفت، اپنے علم و عرفان کے فیضان سے تہی دامنوں کو مالا مال کریں۔ طاقتور، کمزوروں کا سہارا بنیں اور باصلاحیت، بے صلاحیت لوگوں کو زندگی کی صحیح بنیادیں فراہم کرنے کے لئے اپنی صلاحیتیں خرچ کریں۔ الغرض ہر شخص خدا کی جس نعمت سے متمتع ہے اسے چاہیے کہ بجائے اپنی ذات کو ہی فائدہ پہنچانے کے خلقِ خدا کو بھی اس کے فیض سے سیراب کرے۔ یہی "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" کی حقیقی مراد ہے یہ حکم ایک مقام پر ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔ "وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (المنافقون، ۶۳: ۱۰) (جو کچھ بھی ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اسے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے)

رزق کا معروف معنیٰ۔

عرفِ عام میں رزق سے روزی یعنی صرف مال و دولت مراد لی جاتی ہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے مفہومِ آیت یہ ہوا کہ متقی وہ لوگ ہیں جو خدا کی عطا کردہ روزی یعنی مال و دولت میں سے دوسروں پر خرچ کرتے ہیں اور عملِ انفاق کے ذریعے مخلوقِ خدا کے معاشی تعطل کو رفع کرنے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اس شرط کی تائید ان آیاتِ ربانی سے ہوتی ہے۔ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (آل عمران، ۹۲) (تم ہرگز نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ دولت کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کردو)۔ "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (آل عمران، ۱۳۳، ۱۳۴) (اور جنت جس کی چوڑائی میں آسمان اور زمین آجائیں متقین کے لئے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور غمی ہر حال میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں) "وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى" (اللیل: ۱۷-۱۸) (اور دوزخ سے یقیناً بچا لیا جائے گا بڑے متقی شخص کو جو اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے

تاکہ پاک وصاف ہو جائے) مستزاد یہ کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر احسان نہیں۔ کیونکہ کسی حقدار کو اس کا حق دیا جائے تو یہ اس پر احسان تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "**وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ**" (الذاریات: ۱۹) (اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہے)

لہٰذا تقویٰ کی بنیادی شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق میں سے دوسروں پر خرچ کیا جائے۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ خدا کا نام لینے والا خدا کی مخلوق سے کس قدر ہمدردی اور دلسوزی رکھتا ہے اور عملاً اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کرکے خدا کی رضا کس حد تک حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کے مکشوفات میں سے ہے کہ باری تعالیٰ نے انہیں فرمایا۔ "**قُلْ لِاَحْبَابِکَ وَاَصْحَابِکَ اِغْتَنِمُوْا دَعْوَةَ الْفُقَرَاءِ فَاِنَّهُمْ عِنْدِیْ وَاَنَا عِنْدَهُمْ**" (رسالہ غوث الاعظمؒ) (اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کہہ دے کہ فقراء کی دعوت کو غنیمت جانیں کیونکہ وہ میرے پاس ہوتے ہیں اور میں ان کے پاس یعنی ہم ایک دوسرے کے مہمان ہوتے ہیں) اور اسی طرح فرمایا گیا۔ "**اکل الفقیر و شربہ اکلی و شربی**" (فقیر کا کھانا پینا' میرا کھانا پینا ہوتا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ فقراء و مساکین اور مستحقین پر خرچ کرنا' انہیں کھلانا پلانا اور ان کی ضروریات پوری کرنا درحقیقت خدا کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ اس لیے یہ عمل خدا کی رضا اور تقویٰ کا باعث بنتا ہے۔ اور اس کے بغیر انسان قرآنی ہدایت سے کامل استفادہ کا حقدار نہیں بن سکتا۔ یعنی جس کا دل خدا کی مخلوق کے لئے تڑپتا نہ ہو اور لوگوں کے دکھوں کا درد اپنے اندر محسوس نہ کرتا ہو' وہ سنگ دل شخص قرآن حکیم کی ہدایت کا اثر بھی قبول نہیں کرسکتا۔

ؔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پہ کلامِ نرم و نازک بے اثر

عطائے الٰہی کا احساس

یہاں "حکمِ انفاق" سے پہلے "**وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ**" کے الفاظ آئے ہیں کہ جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے۔ اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اس امر کو پہلے

بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں عطاءِ الٰہی کا احساس جاگزیں ہو جائے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں کہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے۔ سرمایہ و دولت، علم و عرفان، جاہ و منصب اور طاقت و قوت، الغرض سب کچھ خدا کا ہی عطا کردہ ہے۔ اس میں سے ہمارا تو کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا اگر اسی کے دیئے ہوئے میں سے کچھ اسی کی خاطر خرچ کریں تو اس میں ہم پر کوئی بوجھ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہمیں کسی پر احسان جتانا چاہیے۔ کیونکہ ہم ان نعمتوں کے مالک نہ تھے۔ صرف امین ہیں۔ یہ اس مالک کا کام ہے کہ رہنمائی کرے کہ میری امانتوں کو کہاں کہاں اور کس طرح خرچ کرنا ہے۔ چاہے تو وہ سب کچھ خرچ کرنے کا حکم صادر کر دے یا کچھ حصے کا۔ پہلے بھی ہر چیز اسی کی تھی اور اب بھی اسی کی ہے۔ اس شعور کو بیدار کرنے کیلئے **مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ** کے الفاظ وارد کیے گئے ہیں۔ لہٰذا متقی وہ لوگ ہیں جو زندگی اور اس سے متعلق تمام نعمتوں کو خدا کی عطائیں تصور کرتے ہوئے اس کی راہ میں خرچ کر کے بھی یہ کہتے ہیں۔

سہ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اِنفاق کا نصاب مقرر نہیں۔

"ما" کا کلمہ عام ہے جو تھوڑے سے تھوڑے کو بھی شامل ہے اور زیادہ سے زیادہ کو بھی۔ اس میں نہ قلیل کی کوئی حد ہے نہ کثیر کی۔ یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ **مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** کہ جو کچھ بھی ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال خارج از بحث ہو گیا کہ کتنا کچھ ہو تو اس میں سے خدا کی راہ میں دیا جائے اور کس قدر دیا جائے۔ حکم یہ ہے کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی دولت اور نعمت تو عطا کر ہی دی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت اسی میں سے کچھ دوسروں کو بھی دے۔ اگر اسے کم میسر آیا ہے تو وہ کم دے زیادہ میسر آیا ہے تو زیادہ جہاں وہ خود اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اسی سے دوسروں کی ضرورت بھی پورا کرنے کا خیال رکھے اگر یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جس شخص کی اپنی ضروریات اپنے وسائل سے پوری نہ ہو رہی ہوں وہ دوسروں کی ضروریات کیسے پوری کر سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعلیم صرف اس شخص کے لیے نہیں جو اپنی ضروریات کے پورا کرنے

میں بھی تنگ ہے۔ بلکہ پوری اسلامی سوسائٹی کے افراد کو نیکی و تقویٰ کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے تعلیم دی جارہی ہے۔ جب سب لوگوں کی سوچ اور عمل کا رخ یہی ہوجائے گا اور ہر شخص اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کرنا اپنے اوپر لازم کرنے لگے گا تو سوسائٹی میں ایسی نوبت کبھی پیدا ہی نہیں ہونے پائے گی کہ کوئی شخص ضروریات سے محروم ہو۔ اجتماعی تبدیلی سے زندگی کے انداز ہی بدل جاتے ہیں اور وہ مسائل جو اس وقت دکھائی دیتے ہیں بدلے ہوئے حالات میں جنم ہی نہیں لے سکتے۔ کیونکہ یہ مسائل اور حالات استحصالی نظامِ معیشت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جب تک معاشرے میں مطلوبہ اجتماعی انقلاب بپا نہ ہو اس تصور کو انفرادی زندگی میں عملی شکل ہی نہیں دی جاسکتی۔ یہ حکم اہلِ ثروت کے لئے تو بہرحال اہمیت کا حامل ہے ہی، کم وسائل رکھنے والے افراد کے لئے اس کی تعلیمی بنیاد یہ ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمت اور دولت کو اس کی راہ میں خرچ کرنا بہت بڑا صدقہ ہے اور شکر کی بڑی بلند صورت ہے اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ شکرانِ نعمت سے اللہ تعالیٰ نعمت میں بھی اضافہ فرمادیتے ہیں۔ اس لیے کہ ارشادِ باری ہے "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ" (ابراہیم: ۷) (اگر تم شکر بجالاؤ گے تو میں تم پر اپنی نعمت میں اضافہ کردوں گا) لہٰذا کم وسائل میں بھی حتیٰ المقدور دوسروں کو شریک کرنا وسائل کے اضافے کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ آیت اس لحاظ سے اسلام کے معاشیاتی فلسفے کی بنیاد ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دولت یا وسائل میں کمی نہیں ہوتی بلکہ مزید اضافہ، وسعت اور کشائش پیدا ہوجاتی ہے۔ علاوہ ازیں ضروری نہیں کہ ہر شخص سرمایہ و دولت میں سے ہی دوسروں پر خرچ کرنے پر مامور تصور کیا جائے۔ ہم پہلے ہی واضح کرچکے ہیں کہ خدا کا رزق اس کی تمام نعمتوں کو حاوی ہے۔ لہٰذا جس کو جو نعمت میسر ہے وہ اسی میں سے خرچ کرے اور اسی کے انفاق سے خلقِ خدا کو نفع بہم پہنچائے۔ اسی عام نفع بخشی اور فیض رسانی کے رویے کا نام تقویٰ ہے اور یہی مصطفوی انقلاب کی معاشیاتی بنیاد ہے۔

آیت ۴: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت اور آپ کی شانِ ختمِ نبوت

اس آیت کریمہ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ میں سب انبیاء و رسل سے افضل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ آپ کی بعثت سب انبیاء کے بعد ہوئی مگر یہاں آپ کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور جو پہلے مبعوث ہوئے ان کا بعد میں۔ ذکر کے تقدم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کو اجاگر کیا گیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ سرور انبیاء علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور تعظیم و تکریم کو سب انبیاء و رسل علیہم السلام اور پیشوایان عالم سے مقدم و عزیز تر سمجھا جائے کیونکہ باوجود سب سے آخر میں مبعوث ہونے کے حضور علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان لانے کا ذکر مقدم ہے اور پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کا ذکر موخر ہے۔ الفاظ ملاحظہ فرمایئے: "يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ"۔ گویا جو وحی پہلے نازل ہوئی اس پر ایمان لانے کا ذکر بعد میں آیا ہے اور جو وحی بعد میں نازل ہوئی اس پر ایمان لانے کا ذکر پہلے۔ یہ ترتیب بیان، جو ترتیب زمانی سے مختلف ہے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایمان بالوحی میں اور تعظیم و تکریم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سب سے مقدم ہے کیونکہ بعثت کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقدم تھے لیکن اس کے باوجود عالم ارواح کے میثاق، جس کا ذکر اس آیہ میں ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ"۔ (اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے یہ وعدہ لیا کہ جب تمہیں کتاب و حکمت عطا فرما دوں پھر تمہارے پاس یعنی دنیا میں وہ آخر الزماں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائیں جو تمہاری تعلیمات اور وحی و نبوت کی تصدیق کر دیں تو تم ضرور بالضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔ آل عمران: ۸۱) کے تحت تمام انبیاء علیہم السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے

اور آپ کی تعظیم کرنے پر مامور تھے اس لئے یہاں بھی حضور علیہ السلام کا ذکر پہلے اور دیگر انبیاء کا ذکر بعد میں کیا گیا۔

شانِ ختمِ نبوت

اسی آیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ ختمِ نبوت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ ایمان لانے کے لئے دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک۔ "ما انزل الیک" جو وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی۔

دوسرے۔ "مَا اُنزِلَ مِنْ قَبْلِکَ" جو وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نازل کی گئی۔

اگر خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بعد بھی کسی نبی یا رسول کی بعثت ممکن ہوتی اور کسی پر وحی اور آسمانی تعلیمات کا نازل ہونا ممکن ہوتا تو "وما ینزل من بعدک" (جو کچھ آپ کے بعد نازل ہو گا) کے الفاظ بھی وارد کیے جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا جس سے صریحاً یہ ثابت ہوا کہ وحیِ الٰہی حقیقت میں وہی تھی جو حضور علیہ السلام سے پہلے انبیاء پر نازل ہوتی رہی اور حضور علیہ السلام پر جس کا نزول ختم ہو گیا اب حضور علیہ السلام کی بعثت سے اس کائنات میں آئندہ سلسلۂ نبوت و رسالت بھی ختم ہو چکا ہے اور وحی کا نزول بھی منقطع ہو چکا ہے۔ آپ کے بعد انسانیت کو نہ کسی نئے پیغمبر اور نبی کی بعثت کی ضرورت ہے اور نہ کسی نئی وحی کی، اس لئے ایسا معاملہ شاملِ ایمان ہی نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی شخص حضور علیہ السلام کے بعد کسی کے لئے نبوت یا نزولِ وحی ثابت کرے تو وہ قرآن کی نفی اور اعلانِ باری تعالیٰ کی تردید کا مرتکب ہو گا اس لئے کہ سلسلۂ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا گیا اور "ختم بی النبیون" کے مصداق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء و مرسلین کے خاتم قرار پائے۔

آیت: ۶، ۷ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

۷ ۔ دعوت محمدی ﷺ اور ہٹ دھرم کافروں کی محرومی

کفر عربی لغت میں "ستر الشئی" یعنی کسی چیز کو ڈھانکنے اور چھپانے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حق کو چھپانے کا نام کفر رکھا گیا ہے۔ یہیں سے اس میں انکار کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ کفر مجموعی طور پر چار اقسام پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ کفرِ انکار: خدا اور رسول یا ضروریاتِ دین میں سے کسی کا کھلا انکار۔

۲۔ کفرِ جحود: دل سے ماننا لیکن زبان سے اقرار نہ کرنا۔

۳۔ کفرِ عناد: ناشکری اور بغض وحسد کی بناء پر تسلیم نہ کرنا۔

۴۔ کفرِ نفاق: زبان سے ماننا لیکن دل سے تسلیم نہ کرنا، جسے عام اصطلاح میں "اعتقادی منافقت" کہتے ہیں۔

یہاں موقع ومحل اور سیاق وسباق کے اعتبار سے کفر سے مراد "کفرِ انکار" اور "کفرِ عناد" ہے۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے حق اور قرآن کا پیغامِ ہدایت تسلیم کرنے سے کھلا انکار کر دیا ہے۔ خواہ ان کا انکار محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر ہے یا تعصب، ناشکری، انانیت اور بغض وحسد کی بناء پر۔ اس مقام پر یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے کہ کفر ان کے مقدر میں تھا اور اس کو اپنانے یا نہ اپنانے میں ان کی اپنی خواہش اور اختیار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ قرآن حکیم نے --- "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کے الفاظ میں فعلِ کفر کی نسبت خود ان افراد کی طرف کی ہے جس سے یہ امر آشکار ہو جاتا ہے کہ کفر ان پر مسلط نہیں کیا گیا بلکہ انھوں نے خود روشِ کفر اختیار کی ہے۔ یہ ان کا اپنا اختیاری اور ارادی فعل ہے کسی مجبوری یا بے بسی کا نتیجہ نہیں۔ اس لیے وہ صاحبِ اختیار فاعل اور مکتسب ہونے کی بناء پر خود اس کے نتائج کے ذمہ دار بھی ہیں۔ کفر اپنا لینے کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں نے دعوتِ مصطفوی ﷺ کو قبول کرنے اور حق وہدایت کو تسلیم کرنے کے بجائے محض انکار کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ ان کو حق وباطل کے

درمیان امتیاز کو سمجھنے سے کوئی سروکار نہیں ان کو توحید و رسالت کے دلائل سننے اور ان کی صحت و حقانیت کو جانچنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انھوں نے ہر حال میں انکار کیے جانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اپنے ذہنی تعصب، طبعی ضد، ہٹ دھرمی، انانیت، مفاد پرستی، حسد و عداوت اور بغض و عناد کی بناء پر وہ حق کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے۔ اس سے ان کی مصنوعی قیادتوں اور امارتوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ انھیں آخرت کے عذاب کی وعید سنائیں یا نہ سنائیں۔ وہ کسی صورت میں بھی دعوتِ حق قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کفر و انکار کے وطیرے کو مستقلاً اس لیے اپنا لیا ہے کہ اس کے سوا ان کے مزعومہ باطل مفادات کے تحفظ کی اور کوئی صورت ممکن نہ تھی۔

سَوَاۗءٌ عَلَيۡهِمۡ کی تصریح

"سَوَاۗءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ" (ان کے لئے برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے) کے الفاظ میں فقط ان کفار کی بدبختی اور محرومی کا ذکر ہے جنھوں نے دعوت محمدی ﷺ کو محض ہٹ دھرمی، عناد اور بغض و عداوت کی بناء پر قبول نہ کیا۔ اگر ان الفاظ کو اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا کی خبر مان لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ "جو لوگ کافر ہیں۔ ان (سب) کے لئے برابر ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے کفار کو دعوتِ حق دی۔ انھیں عذابِ آخرت کی وعید سنائی اور انہی میں سے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور شرفِ صحابیت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ ان کیلئے ڈر سنانا مفید ثابت ہوا کیونکہ وہ نتیجتاً ایمان لے آئے۔ تو پھر اس خبر کا کیا معنی ہوا؟ اگر ان الفاظ کو کفار کے ایک مخصوص گروہ کی حالت کے بیان پر اور ان کے کفر کی نوعیت کی وضاحت پر محمول کیا جائے۔ جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے تو معنی یہ ہوگا "وہ کفار جنھوں نے کفر کو اس طرح اپنایا ہے کہ ان کے لئے عذاب آخرت کا ڈر سنانا یا نہ سنانا برابر ہے یعنی وہ دعوت کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہونے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں نہ انہیں وعیدِ آخرت کی کوئی پرواہ ہے۔ اور نہ وہ روشِ کفر و انکار کو مصلحتہً چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ان کی بدبختی اور محرومی کو بیان کیا جا رہا ہے کہ ایسے لوگ کبھی بھی دولتِ ایمان اور فیضِ ہدایت سے ہمکنار نہیں ہو سکیں گے"۔

اس مفہوم کو سمجھنے سے بعض کفار کے ایمان لے آنے اور بعض کے نہ لانے' دونوں کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے اور کفر کی حالتوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ صاحبِ بحرالمحیط اور صاحب روح المعانی نے بھی اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔

ضد اور شیوۂ انکار و تعصب کا نتیجہ۔

یہاں دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے ضد اور انکار و تعصّب کا شیوہ اپنانے اور ہر حال میں قرآن کے پیغام ہدایت کو اپنے مفادات کی خاطر رد کرتے چلے جانے کا نتیجہ بیان کیا جارہا ہے کہ ایسے لوگ بارگاہ ایزدی میں بھی بالآخر مردود قرار دیدیئے جاتے ہیں اور وہ ایمان کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتے ہیں۔ تاوقتیکہ وہ اس شیوہ کو کلیتًا ترک نہ کردیں۔ جو لوگ ناسمجھی اور بے علمی کے باعث کفر میں مبتلا ہوں ان کی بات الگ ہے۔ کیونکہ جب انہیں ہدایت کی روشنی نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں اور نادانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اسلام کے پیغام کو قبول کرلیتے ہیں۔ لیکن جن پر اسلام کی حقانیت آشکار ہو چکی ہو۔ وہ اسلام اور بانئ اسلام ﷺ کا کردار اور فکر و عمل بھی اچھی طرح دیکھ چکے ہوں۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی غلطی اور گمراہی کا بھی احساس اور علم ہو چکا ہو۔ مگر اس کے باوجود ان کا تعصب' بغض و کینہ' حسد و عداوت اور مفاد پرستی و خود غرضی قبولِ ہدایت کی راہ میں مانع ہو۔ ان کی مادی منفعتیں اور دنیوی مصلحتیں اس پیغام کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ ہوں تو وہ کیونکر دولتِ ایمان سے ہمکنار ہو سکتے ہیں؟ اس لیے ان لوگوں کی بدبختی اور محرومی کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ اہلِ ایمان بھی اپنی زندگی میں محض ضد' بغض و حسد اور شیوۂ انکار و تعصب کو اپنانے سے باز رہیں۔ کیونکہ یہ اندازِ فکر بیشمار دینی نعمتوں اور روحانی برکتوں سے محرومی کا باعث ہوتا ہے۔ مستزاد یہ کہ ایسے رذائل و خصائص شیوۂ کفر ہیں۔ خواہ یہ اسلام کا نام لینے والوں میں ہی کیوں نہ پائے جاتے ہوں۔ آج ہم میں بھی کتنے افراد ہیں جو کسی بات کے حق ہونے پر مطلع ہو جاتے ہیں' اس کی صحت و حقانیت دلائل و شواہد کے ذریعے ان کے دل پر آشکار ہو جاتی ہے لیکن سب کچھ جان لینے کے باوجود محض تعصّب و تنگ نظری یا کسی مفاد و مصلحت کی خاطر حق کو ماننے سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ قرآن مجید اسی طرزِ فکر و عمل کی نشاندہی کر کے اس کی مذمت کر رہا ہے اور ایسے متعصبانہ فکر کو کافرانہ اندازِ

فکر قرار دے رہا ہے۔

روشِ کفر کا نتیجہ۔

یہاں ضد، ہٹ دھرمی اور انکار و تعصب پر مبنی کفر کا منطقی نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ کفر و انکار کو اپنا وطیرہ بنا لیتے ہیں اور تعصب و عناد کے باعث حق بات کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔ ان کی یہ روش انہیں بدبختی اور محرومی کے اس مقام تک پہنچا دیتی ہے کہ بالآخر ان کے فہم و ادراک کے تمام راستے ناکارہ اور مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ مسلسل انکار اور تعصب کے نتیجے میں سچی بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں انکی سمع و بصر سے کسی بھی حقیقت کو سننے اور دیکھنے کی استعداد سلب ہو جاتی ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے کہ وہ اپنے موقف کے خلاف حق بات نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور یہ کیفیت جو ان کے اپنے عمل سے مترتب ہوتی ہے انہیں ہمیشہ کے لیے نعمت ہدایت سے محروم کر دیتی ہے۔ بدبختی کی اسی حالت کو قرآن مجید دلوں اور کانوں پر مہر لگ جانے اور آنکھوں پر پردہ پڑ جانے سے تعبیر کر رہا ہے۔ اسے "خَتَمَ اللّٰهُ" کے الفاظ کے ذریعے باری تعالیٰ نے اپنی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ یہ قانونِ قدرت ہے۔ جو کوئی عمداً حق سے اس طرح چشم پوشی کرتا رہے گا اور ہدایت کے آشکار ہو جانے کے باوجود باطل مفادات کی خاطر پیہم انکار اور انحراف کی ڈگر پر چلتا رہے گا تو اس کی مسلسل ہٹ دھرمی اور تعصب کے باعث اس کے دل و دماغ اور دیدہ و گوش کی ساری قوتیں مفلوج ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگ جانے یا پردہ پڑ جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ایسے لوگوں کے نصیب میں ہی ہدایت نہ تھی اور ازل سے ہی ان کے راہِ راست سے محروم رہ کر گمراہیوں میں بھٹکتے رہنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ تقدیر کا یہ تصور محض جبریت ہے۔ جس کا اسلام کے نظامِ عدل اور نظامِ جزا و سزا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ایسی تقدیر ہے جو انسان خود اپنے ہاتھوں سے رقم کرتا ہے۔ جس طرح غلط غذا کے استعمال سے نظامِ انہضام اور جسمانی صحت کا متاثر ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ اسی طرح حق کے خلاف مسلسل متعصبانہ اندازِ فکر روا رکھنے اور انکار و کفر کی روش کو جاری رکھنے سے انسان کے قوائے فکر و نظر کے نظام کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ انسانی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جہاں باطل مفادات

اور تعصبات کا مصنوعی بھرم انسان کو ایسی انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ وہاں سے اس کا لوٹ کر حق کی طرف آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ باطل مفادات سے دیرینہ لگاؤ اور ان کی مصنوعی محافظت کی طویل کاوشوں کے نتیجے میں اس کا اندازِ فکر و نظر ہی بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے باطل ہی حق معلوم ہونے لگتا ہے اور اصل حقیقت اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں وہ جب سوچتا ہے۔ اس کی سوچ اسے غلط نتیجے تک پہنچاتی ہے۔ اس کے فلسفیانہ اور منطقی استخراجات سب کچھ حق کے فہم وادراک سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ حقیقی شقاوت اور محرومی ہے جو انسان اپنی زندگی میں خود اپنے رویے سے پیدا کرتا ہے۔ چونکہ یہ نظامِ قدرت اور عادتِ جاریہ ہے۔ اس لیے اسے باری تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر دیا ورنہ اس سے انسان کی بے بسی اور مجبوری کا بیان مقصود نہیں۔

گمراہی انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، کسی کا مقدر نہیں۔

اس تصور کو قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكَافِرِيْنَ" (اعراف: ۱۰۱) (پس یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنے کیونکہ یہ پہلے سے ہی حق کو جھٹلا رہے تھے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے کفر و انکار کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دیا کرتا ہے) اس آیتِ کریمہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر کا لگایا جانا ان کی پہلے سے طے شدہ تقدیر یا مجبوری نہیں ہوتی بلکہ انکے اپنے اختیاری کفر اور انکار کی روش ہی انہیں محرومی کی اس منزل تک پہنچا دیتی ہے جسے قرآن **"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ"** اور **"يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكَافِرِيْنَ"** کے الفاظ سے تعبیر کر رہا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے **"كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"** (ہرگز نہیں! جو اعمال وہ اپنی آزادی سے کیا کرتے تھے انہی کی سیاہی اور زنگ ان کے دلوں پر جم گیا ہے)

سورۂ نساء کی آیت ۱۵۵ میں اس امر کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے۔ **"فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا"** (پس اس وجہ سے کہ انہوں

نے اپنے عہد کو توڑ دیا اور اللہ کی آیات کا کھلا انکار کیا۔ انبیاء کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل بالکل بند ہیں یعنی اے گروہِ انبیاء! ان میں تمہاری باتوں کے داخل ہونے کے لئے ہم نے کوئی راستہ نہیں رکھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے ہی کفر وانکار کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ پس وہ ایمان نہیں لائیں گے، مگر بہت کم) یعنی جو ابھی بد بختی اور محرومی کی آخری منزل تک نہیں پہنچے۔ اگر وہ اپنے دلوں کو ہدایت ربانی کے پیغام کے لئے مقفل کر کے نہ رکھیں تو ان کے ایمان لے آنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ پیدائشی طور پر کسی کے دل پر مہر لگا کر نہیں بھیجتا اور نہ ازل سے کسی پر گمراہی وضلالت کو ٹھونس دیتا ہے بلکہ اسے انسان اپنے اعمال کے نتیجے کے طور پر خود خرید تا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ایزدی ہے۔ **"ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ"** (نحل : ۱۰۶-۱۰۷) (یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں محبوب جانا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسی کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غفلت کا شکار ہیں) یہاں بھی نہایت وضاحت کے ساتھ مذکورہ حقیقت کو بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ خود دنیا کو آخرت پر، گمراہی کو ہدایت پر اور غفلت کو بصیرت و آگہی پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے لیے ہدایت کے سارے راستے بند کر دیتے ہیں۔ اسی کیفیت کو اصطلاحاً "مہر لگ جانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

احادیثِ نبوی ﷺ سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ **"ان المومن اذا ذنب کانت نکتہ سوداء فی قلبہ فان تاب ونزع واستعتب صقل قلبہ وان زادت حتی تعلو قلبہ فذالک الران الذی قال اللہ تعالیٰ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون"** (ترمذی) (مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے باعث اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے، اس گناہ سے باز آجائے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے، تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے

دل پر چھا جائے تو یہی وہ سیاہی اور زنگ ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔ (ہرگز نہیں ! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اپنے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے) ان شواہدِ قرآن و حدیث سے یہ امر واضح ہوگیا کہ جب کسی ایسے فعل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتے ہیں تو اس سے نفسِ فعل کی نسبت مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس قانونِ قدرت اور ضابطۂ مشیت کو اپنی طرف منسوب کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جس کے تحت ایسے افعال اور ان کے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھی صلاحیتوں اور استعدادوں کے ساتھ پیدا کیا ہے پھر اس کو نیکی و بدی، خیر و شر اور ہدایت و گمراہی کے دونوں راستے دکھا دیئے۔ دونوں کے درمیان امتیاز کا شعور بھی اسے عطا کر دیا ہے۔ اس کے اندر نیکی اور اچھائی کو پسند کرنے اور برائی سے نفرت کرنے کی طبعی استعداد بھی ودیعت کر دی ہے۔ اس کے بعد اسے دونوں راستوں میں سے کسی کو اپنا لینے کی قدرت اور آزادی و اختیار بھی عطا کیا ہے۔ دونوں کے منطقی نتائج اور اثرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے چاہے تو ہدایت کی راہ کو اپنائے اور چاہے تو گمراہی کو۔ اب اس کے اپنے اختیاری اور ارادی عمل سے جو نتائج نظامِ قدرت کے تحت علت و معلول کے اصول کے مطابق مترتب ہوتے ہیں۔ اگر ان کی نسبت باری تعالیٰ نے اس عدل و انصاف پر مبنی نظامِ قدرت کے خالق و مالک ہونے کی بناء پر اپنی طرف کر دی تو اس میں انسان کے مجبور اور بے بس ہونے کا نتیجہ کہاں سے نکل آیا؟ اس نوعیت کی آیات و احادیث سے بلا وجہ نظریہ جبریت کو ثابت کرنا باری تعالیٰ کے نظامِ عدل پر الزام لگانے اور تصور جزا و سزا کو صریح ظلم قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس موضوع پر مزید آگہی کے لیے تفسیر منہاج القرآن کے دیگر متعلقہ مباحث کے علاوہ ہمارے درج ذیل دو مقالات کا مطالعہ فرمایئے:۔

1- Islamic Concept Of Human Nature.

2- Freedom Of Will and Human Conduct.

آیت: ۸ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞

۸۔ منافقین کا دعوائے ایمان کیوں مقبول نہیں؟

اس سے قبل پہلے رکوع میں دو گروہوں کا بیان تھا۔ ایک مومنین و متقین کا اور دوسرا کفار و منکرین کا۔ پہلا گروہ دل و دماغ اور قول و عمل ہر طرح سے ایمان لانے والوں پر مشتمل تھا۔ جب کہ دوسرا گروہ ظاہراً و باطناً ہر طرح سے اسلام کا انکار کرنے والوں پر۔

یہاں سے تیسرے گروہ کا بیان شروع ہو رہا ہے جو گروہِ منافقین ہے۔ مدینہ منورہ میں موجود منافقین کی مختلف اقسام کا ذکر ہم سورۂ بقرہ کے تعارف میں پہلے ہی کر چکے ہیں۔ یہاں منافقین کے وجود کا مختصر تاریخی پس منظر واضح کرنا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے سوا اہلِ نفاق کا یہ تیسرا گروہ کیوں معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ اہلِ مدینہ کے قبیلہ خزرج کا ایک بہت بڑا سردار عبد اللہ بن ابی تھا۔ اسے اس کے اثر و رسوخ کے باعث مدینہ کا حکمران بنایا جا رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی ہجرت سے صورتِ احوال میں زبردست تبدیلی آگئی۔ یہودیوں سمیت تمام اقوام نے متفقہ طور پر آنحضرت ﷺ کو مدینہ کا حاکم تسلیم کر لیا۔ جس سے عبد اللہ بن ابی اور اس کے مخصوص ساتھیوں کے مزعومہ مفادات کو سخت نقصان پہنچا۔ چنانچہ وہ اس دن سے اسلام اور بانیٔ اسلام ﷺ کے خلاف مخفی کاروائیوں اور پسِ پردہ سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔ یہ طبقہ اسلام کی کھلی مخالفت و مزاحمت کی جرأت نہ کر سکا۔ لہٰذا ظاہراً اسلام سے وابستگی کا لبادہ اوڑھ کر مختلف قسم کی فتنہ انگیزیوں کا جال بچھانے لگا۔ قرآن مجید نے اس طبقے کی نشاندہی اس قدر جامع اور ہمہ گیر انداز میں کی ہے کہ نہ صرف عہدِ رسالت کے منافقین کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ ہر دور میں منافقت کے مختلف روپ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں منافقین کی علامات اور ان کی نفسیات کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہی خرابی اہلِ اسلام کی ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ اگر اس کی صحیح قرآنی پہچان سامنے رہے اور اس کا علاج بھی قرآن و سنت کے مطابق جرأت مندی کے ساتھ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان

زوال اور ادبار کی حالت سے نجات نہ پا سکیں۔ آیت متذکرہ میں منافقت کی دو علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

- دعوائے ایمان صرف زبانی حد تک کرنا اور باطن کا اس کی تصدیق سے خالی ہونا۔
- محض توحید و آخرت پر ایمان کو کافی سمجھنا اور رسالت محمدی ﷺ پر ایمان ضروری نہ سمجھنا۔

آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کا ایمان زبان کے اقرار کی حد تک ہے دل کی تصدیق سے محروم ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ جو بات محض زبان سے کہی جائے دل اس کی تصدیق نہ کر رہا ہو تو منافقت کی سب سے پہلی پہچان ہے خواہ کہی ہوئی بات خدا و آخرت پر ایمان لانے کی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایسی پاکیزہ بات کا' جو اسلام اور ایمان کا اصل الاصول ہے۔ صرف زبان سے ادا ہونا خدا کے ہاں منافقت ہے تو زندگی کے عام معاملات میں باہمی گفتگو اور تعلقات کا یہ انداز منافقت کیوں نہ قرار پائیگا۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر ہمیں شب و روز کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم جس کسی سے جو کچھ بھی کہتے ہیں کیا دل سے کہتے ہیں یا محض زبان سے۔ اگر دل کی کیفیت ہماری زبان کی ہمنوا نہ ہو تو زباں میں تاثیر کہاں سے آئے اور اس منافقانہ رویہ سے زندگی میں برکت و نتیجہ خیزی کہاں سے پیدا ہو؟

دوسری علامت جس کا اشارہ اس آیت کے ظاہرِ عبارت سے ملتا ہے وہ رسالتِ محمدی ﷺ کی نسبت سوءِ ظن ہے۔ کیونکہ منافقین کے دعوئِ ایمان کی طرف جو الفاظ منسوب ہوئے ہیں ان میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے۔ ایمان بالرسالت کا نہیں۔ کیونکہ منافقین کو اصل عداوت اور بغض و عناد نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے تھا۔ جس کے باعث ان کے مفاد پرستانہ عزائم خاک میں مل گئے تھے۔ اس لیے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا ظاہری اعلان بھی کرتے تو اس انداز سے کہ گویا خدا اور آخرت پر ایمان ہی مسلمان ہونے کیلئے کافی ہے رسول اکرم ﷺ پر ایمان اس قدر ضروری اور ناگزیر تصور نہ کرتے تھے۔ اس لیے قرآن مجید

میں ان کے دعویٰ ایمان کے مذکورہ الفاظ ایمان بالرسالت کے ذکر سے خالی ہیں۔ جب کبھی یہ منافقین حضور علیہ السلام کی رسالت کا ظاہراً اقرار بھی کرتے تو یہ اقرار بھی سچا نہ ہوتا بلکہ دل کے انکار اور تعصب و عناد کے باعث سراسر جھوٹ ہوتا۔ جس کا ذکر سورۂ منافقون کی پہلی آیت میں یوں آیا ہے :۔ "اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ" (اے نبی ! جب منافق آپ کی خدمت میں آتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے سچے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں)

اس اعلانِ خداوندی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ منافق فی الواقع حضور علیہ السلام کی رسالت کے قائل نہ تھے اور جو کوئی ثبوت ان کے اقرارِ رسالت کی نسبت ملتا ہے وہ قرآنی وضاحت کے مطابق محض جھوٹ اور مکر و فریب تھا۔ اس جگہ بھی رسالت مآب ﷺ کی اہمیت کو گھٹاتے بلکہ نظرانداز کرتے ہوئے وہ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ جس کا جواب قرآن نے "وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ" کے الفاظ میں دیا ہے کہ جو لوگ پیکرِ رسالت ﷺ پر صحیح ایمان کے بغیر خدا اور آخرت پر ایمان لانے کی بات کرتے ہیں۔ ان کا دعوئِ ایمان باطل اور مردود ہے اور وہ منافق ہیں۔ کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کامل ایمان کے بغیر وہ کس خدا اور کس یومِ آخرت کو مانتے ہیں۔ جب کہ خدا اور آخرت کی معرفت و شناسائی بھی انسانیت کو نبی اور رسول کی ذات ہی کے توسط سے ہوتی ہے۔ جب اسی نبی اور رسول پر ایمان نہ رہا تو باقی عقائد کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس لیے ایمان بالرسالت کے بغیر دعوئِ ایمان کو منافقت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس دور میں منافقت کی یہ صورت ذات مصطفوی ﷺ سے عشق و محبت کے فقدان یا کمی کی شکل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور سنت نبوی ﷺ کی حجیت کے انکار کی شکل میں بھی۔

آیت : ۹ - یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

۹ - بارگاہِ الٰہی میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قدر و منزلت اور منافقین کی سوچ

یہاں منافقین کی ایک خاص علامت بیان کی گئی ہے جسے مخادعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "یُخٰدِعُوْنَ" خدع سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی چھپانا اور اصطلاحی معنی دھوکہ دینا ہے۔ خادع کسی کو دھوکہ دینے کے ارادے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ منافقین زبانی اقرار اور قلبی انکار کے ذریعے یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ ہم خدا اور اہل ایمان سے اپنی حقیقتِ کفر اور باطنی حالت چھپا کر انہیں فریب اور غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں حالانکہ یہ ان کا اپنا دھوکہ اور ناسمجھی تھی۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ منافقین کی مخادعت بزعم خویش ذات خداوندی سے نہ تھی بلکہ یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ہم اپنی باطنی حالت خدا سے چھپا سکتے ہیں ـــ ان کی دھوکہ دہی کی کوشش درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تھی جن کے بارے میں وہ علیحدگی میں کہتے بھی تھے کہ "کیسا رسول ہے، ہم دل سے اس کے ساتھ نہیں ہیں اس پر ایمان بھی نہیں رکھتے اس کے باوجود اسے ہماری حالت کی خبر نہیں اور ہمیں بدستور مسلمان سمجھتا ہے"۔ حضرت سدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عرضت علی امتی فی صورھا فی الطین کما عرضت علی اٰدم و اعلمت من یؤمن بی ومن یکفر بی فبلغ ذالک المنافقین فقالوا استھزاء زعم محمد انہ یعلم من یؤمن بہ ومن یکفر ممن لم یخلق بعد ونحن معہ وما یعرفنا فبلغ ذالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم فقام علی المنبر فحمد اللّٰہ تعالیٰ واثنی علیہ ثم قال ما بال اقوام طعنوا فی علمی لا تسئلونی عن شئی فیما بینک وبین الساعۃ الا نبأتکم بہ۔

مجھ پر میری تمام امت اپنی حالت خمیر میں پیش کر دی گئی ہے جیسا کہ حضرت آدم پر اشیاء پیش کی گئی تھیں چنانچہ میں نے ہر ایک کو جان لیا ہے کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا اور

کون نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد منافقین تک پہنچا تو انہوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) یہ گمان کرتے ہیں کہ جو لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں ان میں سے مومن و کافر کو پہچانتا ہوں۔ حالانکہ ہم ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ ہماری منافقت سے بھی باخبر نہیں ہے۔ منافقین کا یہ طعنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں آگیا۔ آپ اسی وقت منبر پر تشریف فرما ہوئے اور باری تعالیٰ کے حمد و ثنا کے بعد فرمانے لگے' ان لوگوں کی تباہی کا کیا عالم ہو گا جو میرے علم کی وسعت میں طعنہ زنی کرتے ہیں۔ تم اس وقت سے لے کر قیامت تک جو بات چاہو مجھ سے پوچھ لو میں تمہیں اس کی خبر دوں گا"۔ اس پر حضور علیہ السلام سے بعض مخفی نوعیت کے سوالات بھی ہوئے جن کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برجستہ جواب دیا۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے "**فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ' فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ**"۔ (کیا اب بھی میرے علم پر طعنہ زنی سے باز نہیں آؤ گے' کیا اب بھی میرے علم پر طعنہ زنی سی باز نہیں آؤ گے؟")۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ امر متر شح ہو گیا کہ منافقین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حالتِ نفاق سے بے خبر سمجھ کر دھوکہ دینا چاہتے تھے اور ان کا یہی خیال اہلِ ایمان کی نسبت تھا جس حقیقت کو قرآن نے یوں واشگاف کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخادعت' حقیقت میں خدا سے مخادعت ہے' جس طرح خود قرآن مجید نے کئی اور مقامات پر یہ اعلان کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینا خدا کو اذیت دینا ہے' حضور علیہ السلام کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے اور حضور علیہ السلام کی اطاعت و غلامی خدا کی اطاعت و غلامی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا "**یخدعون اللّٰہ**" (وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں") جس سے یہ صاف طور پر واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شان اقدس میں معمولی سا سوءِ ظن اور ادنیٰ سی بے ادبی بھی شان الوہیت میں بے ادبی و گستاخی کے مترادف ہے۔

اس مقام پر یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ کہنے کا بنیادی مقصد یہ نہیں کہ منافقین واقعتہً" اللہ سے دھوکہ دہی اور مخادعت کا گمان کرتے تھے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے بلکہ ان کا گمان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات اقدس سے (معاذ اللہ) مخادعت اور دھوکہ دہی کا ہوتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان، عظمت اور اپنی بارگاہ میں قرب و منزلت کے اظہار کے لئے حضور علیہ السلام کے اسم گرامی کی بجائے اپنا اسم مبارک بیان فرما دیا تاکہ مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجاگر ہو اور منافقین کو تنبیہہ ہو۔

امام حسن بصری سے یہی معنی منقول ہیں، فرماتے ہیں **معناہ یخٰدعون رسول اللّٰہ کما قال اللّٰہ تعالی اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ ای اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ۔** (اس کا معنی ہے کہ وہ رسول اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا "بیشک جو لوگ اللہ کو اذیت دیتے ہیں" اس سے مراد اولیاء اللہ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کو اذیت دینا ہے۔ البغوی۔) امام خازن نے یہاں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ منافقوں کا اللہ تعالیٰ کی نسبت تو ایسا سوچنا ہی ممکن نہ تھا، **ان اللّٰہ ذکر نفسہ و ارادبہ رسولہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم و ذالک تفخیم لا مرہٖ و تعظیم لشانہ"** (بیشک اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر اپنی ذات اقدس کا کیا ہے مگر مراد اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی لی ہے تاکہ اس کے حکم کی بڑائی اور اس کی شان کی عظمت کے باعث منافقین کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حیاء پیدا ہو)۔

امام نسفی نے تفسیر مدارک میں مزید لطیف بات کی ہے۔ فرماتے ہیں: **قدرفع اللّٰہ منزلۃ النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم حیث جعل خداعہ خداعہ وھو کقولہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔** (بیشک اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت منافقین کی مخادعت کو خود اپنی نسبت مخادعت قرار دے کر آپ کا درجہ اور قدر و منزلت بلند فرما دی ہے، یہ آیت اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "اے محبوب! بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، ان

کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے")۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر المظہری میں اس نکتے کو مزید یوں اجاگر کیا ہے کہ حذفِ مضاف کے ساتھ حقیقت میں **يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ** سے مراد **يخدعون رسوله** ہی ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں: **ان معاملتهم مع الرسول معاملتهم مع الله من حيث انه خليفته۔** (کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باری تعالیٰ کے خلیفہ و نائب ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا "جو کوئی رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی" اور "جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں' ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے)۔

الغرض اس مقام سے شان رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ پہلو آشکار ہوا کہ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ وآلہ وسلم میں بے ادبی درحقیقت بارگاہِ الٰہی میں بے ادبی ہے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے اعتنائی درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بے نیازی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف عدمِ رجوع و رغبت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بندگی سے اعراض و انحراف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بلند و اعلیٰ مقام و مرتبہ اور حضورِ الٰہی میں نسبتِ وحدت کے شرف کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آیت : ۱۰۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

۱۰ - حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت کا انکار دلوں کا روگ ہے

اس آیت کریمہ کا مضمون بھی پچھلے مضمون کا تسلسل ہے۔ آیت : ۹ میں واضح کیا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت کا چھپا انکار صریح منافقت ہے۔ یہاں اسی منافقت کو فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کہہ کر اسے دلوں کا روگ یعنی باطنی اور روحانی بیماری قرار دیا گیا ہے اور اس بیماری کی شدت اور سنگینی یوں بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بیماری کو اور بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عناد کے باعث دردناک عذاب تک جا پہنچتے ہیں"۔

اس کی وجہ مطالعہ قرآن سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ باطنی امراض کی اصلاح کے لئے بارگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ ہوتے تھے ان کے قلب و باطن کو وہ صحت و تندرستی اور صفائی و نورانیت میسر آتی تھی کہ وہ آگے بھی ہزاروں بیمار دلوں کو تازہ زندگی بخش سکتے تھے کیونکہ "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ" کے مطابق انہیں تزکیہ و تصفیہ خود نگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نصیب ہوتا تھا لیکن جو لوگ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہی سے بغض و عناد اور حسد و عداوت رکھتے تھے بلکہ جب بھی انہیں انہی کی بہتری کے لئے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نیاز مندی کے ساتھ آنے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ غرور و تکبر کے ساتھ اپنا سر جھٹک دیتے تھے، جیسا کہ خود قرآن ان الفاظ میں یہ شہادت مہیا کر رہا ہے : وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے لئے مغفرت چاہیں یعنی تمہاری نجات و فلاح کا سامان کریں تو وہ اپنا سر جھٹک دیتے ہیں اور آپ انہیں دیکھیں گے وہ تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں۔ المنافقون : ۵)

جب حضور علیہ السلام سے حسد و عداوت اور منافقت کا یہ عالم ہو کہ حضور علیہ

اسلام کی وساطت سے اپنی بہتری پسند نہ کرتے ہوں تو ان کی بیماریوں کی اصلاح کیونکر ممکن ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا **فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا**۔ کہ ان بدبختوں کا یہ مرضِ منافقت اور بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے جھوٹ کی پاداش میں دردناک عذاب کو جا پہنچتے ہیں۔ ان منافقین کی زندگی کو جھوٹ کے معمول سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ جب ان کے دل میں ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی نسبت اس قدر بغض اور حسد و عداوت کار فرما ہے تو ان کا ایمان کا نام لینا' اسلام سے وفاداری کا دم بھرنا' نمازیں پڑھنا اور دیگر فرائضِ دینی کی ظاہری ادائیگی کا اہتمام کرنا سب جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔

آیت: ۱۱، ۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

۱۱۔ **منافقت کا گھناؤنا روپ۔ نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی۔**

ان آیات میں منافقین کی ایک اور علامت اور منافقت کا ایک نیا روپ بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی۔ فساد کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ **"الفساد خروج الشئی عن الاعتدال"** خواہ افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی۔ لہٰذا کسی شخص کا ہر وہ عمل جو خلافِ عدل ہو فساد سے تعبیر کیا جائے گا۔ عدل کی تعریف یہ ہے۔ **"وضع الشئی فی موضعہ"** (کسی شے کو اپنے صحیح مقام پر رکھنا) اگر کوئی شے اپنے اس مقام سے ہٹا دی جائے جس کی وہ مستحق تھی یا کسی شے کو ایسے مقام پر رکھ دیا جائے جس کی وہ مستحق نہ تھی تو ان دونوں حالتوں کا نام فساد اور ظلم ہے۔ ایسے ہی ہر عمل کو خلافِ عدل یا بے اعتدالی کہتے ہیں۔ چنانچہ فساد فی الارض ایسی جامع اصطلاح ہے کہ اس میں ہر ظلم اور زیادتی' بے اصولی و ناانصافی' حق تلفی واستحصال' اثم وعدوان' گمراہی وضلالت' شر انگیزی وفتنہ پروری' منافقت ومنافرت' تخریبی وسازشی کاروائیاں اور منفی اندازِ فکر وعمل شامل ہیں۔ عقائد و نظریات اور اعمال وافعال کے جس نظام سے ارضی زندگی اور انسانی سوسائٹی میں عدل وانصاف اور صداقت وشرافت کی اقدار قائم رہیں بلکہ فروغ پاتی رہیں اور ہر حقدار کو

اس کا صحیح حق ملتا رہے وہ نظام حق پر مبنی ہوتا ہے اور اسی حالت کو صلاح و فلاح کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی عمل سے اس نظامِ حق و عدل کے فروغ میں تعطل پیدا ہو یا حصولِ فلاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو تو اسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآنِ حکیم جملہ منافقین کی نسبت یہ واضح اعلان کر رہا ہے کہ ان کا اندازِ فکر و عمل ہمیشہ مفسدانہ، منفی، تخریبی اور استحصالی ہوتا ہے۔ جو انسانی سوسائٹی کیلئے ضرور کسی نہ کسی طور پر نقصان دہ ہوتا ہے۔ طرّہ یہ کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد بپانہ کرو تو وہ اپنے آپ کو کبھی بھی مفسد تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ خود کو پورے معاشرے میں نہ صرف سب سے بڑا صالح بلکہ واحد مصلح تصور کرتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی حق ہے اور اسی سے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ چنانچہ اس نام نہاد، صالحیت اور مصلحیت کے زعم میں مبتلا رہ کر وہ فساد انگیزی جاری رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم ان کے وہمِ باطل کو رد کرتے ہوئے برملا اعلان کر رہا ہے کہ ان کی مصلحانہ نعرہ بازی اور نیکی کی ظاہری دعوت کو دیکھ کر کہیں انہیں مخلص رہنما اور قومی مصلح تصور ہی نہ کر لیا جائے بلکہ آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ حقیقت میں فساد بپا کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ فتنہ و شر کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ ان کی ساری نام نہاد اصلاحی کارروائیاں منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ان کی بدبختی کی انتہا یہ ہے کہ یا تو انہیں اپنے مفسدانہ عمل کا علم و شعور ہی نہیں ہوتا اور اصلاح کی خوش فہمی میں ہی فساد مچاتے چلے جاتے ہیں یا وہ اپنے منافقانہ مفادات میں اس قدر حریص ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے عمل کو فساد انگیزی تصور نہیں کر سکتے۔ گویا یہ احساس ان کی لوحِ قلب و دماغ سے مٹ چکا ہوتا ہے کہ کیا ہم بھی فساد کا باعث ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید نے منافقت کی یہ ایسی اہم علامت بیان کی ہے کہ جسکا صدور و ظہور ہر دور میں یکساں ہوتا چلا آرہا ہے۔ آپ تاریخِ اسلام کا مطالعہ فرمالیجئے۔ اسلام میں جس قدر باطل فرقے، الحادی تحریکیں، تشدد ساز شی جماعتیں اور متکبر قیادتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان کا ہمیشہ یہی دعویٰ اور نعرہ رہا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ مسلمان اپنے عقائد و اعمال کے اعتبار سے تباہ ہو چکے ہیں اس لیے ہماری کاوش انہیں اعتقادی اور عملی گمراہیوں سے نجات دلا کر صحیح اسلامی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ کسی نے بھی خود سے بڑھ کر

کسی اور کو مصلح تصور نہیں کیا۔ نتیجتاً ایسی تحریکیں کئی مسلمانوں کو اصلاحِ احوال کے دلکش اور دلفریب نعروں کی جاذبیت کے باعث اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور دینِ حق کی صحیح راہ سے بھکانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی عمومی اعتقادی اور عملی حالت اصلاح طلب ہے اور اصلاح طلب رہتی ہے چنانچہ ان کی اصلاح کا فریضہ بھی اہلِ علم کو ادا کرنا ہوتا ہے بلکہ اہلِ اقتدار جنہیں فی الواقع مصلح کا کردار ادا کرنا چاہیے اکثر اوقات خود اصلاح کے ضرورت مند ہوتے ہیں اور یہ کام بھی معاشرے کے زعماء و علماء کے ذمے ہوتا ہے۔ لہٰذا کئی سمتوں سے اصلاحِ احوال کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ یہاں وہ نازک منزل آتی ہے جہاں اہلِ اسلام کو حق پرستانہ اور منافقانہ نعروں میں امتیاز کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس امتیاز کو پیشِ نظر رکھے بغیر اگر ہر قیادت اور دعوت کی پیروی شروع کر دی جائے تو احوال سنورنے کی بجائے اور بگڑتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر کوئی ظاہراً دعوتِ اصلاح ہی دے رہا ہو تو حق و باطل میں امتیاز کا معیار کیا ہو گا؟ قرآن حکیم کی یہ آیات اسی معیارِ امتیاز کو واضح کر رہی ہیں۔ قرآن منافقت کے مختلف رویوں کو چن چن کر بے نقاب کر رہا ہے اور اس کی مختلف علامات کی حتمی پہچان بھی بیان کر رہا ہے۔ اگر سب علامات کو سامنے رکھ کر اسی قرآنی معیار پر حق پرستی اور منافقت کی پرکھ کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دھوکہ وفریب کی گنجائش باقی رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآنی معیارِ حق کی بات تو کرتے ہیں لیکن عملاً اس کے پیمانے پر کھوٹے اور کھرے کی پرکھ نہیں کرتے۔ پرکھ کیلئے ہم نے اپنے ذہنی معیارات اور مفاد پرستانہ پیمانے قائم کر رکھے ہیں۔ قرآن بھی ان پر پورا اترے تو مانتے ہیں ورنہ اس کی تاویل کر لیتے ہیں۔

ع خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

باری تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین!

آیت : ۱۳ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝

۱۲۔ دوسروں کو بے وقوف اور صرف خود کو عقلمند سمجھنا خود بیوقوفی ہے۔

یہاں منافقین کی ایک اور توجہ طلب نفسیاتی علامت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو بے وقوف، کم فہم اور کم عقل سمجھنا۔ بلکہ دوسروں کو اپنی نام نہاد عقل و دانش اور فہم و فراست کے مقابلے میں اس قدر ہلکا تصور کرنا کہ ان کی ڈگر کو بے عقلی اور گمراہی سے تعبیر کرنا۔

اَلسُّفَهَاءُ کا معنی۔

یہ سفیہ کی جمع ہے۔ سَفہ کے اصل معنی خفت، کمزوری، ردی پن اور ہلکا پن ہے۔ ہلکے اور کمزور جسم والے کو "سَفِيهُ الْبَدَنِ" اور گھٹیا کپڑے کو "ثوب سفیہ" کہتے ہیں۔ چونکہ کم عقلی، انسان کا سب سے بڑا ہلکا پن ہے۔ اس لیے عام استعمال میں سفیہ کا معنی بے وقوف اور کم عقل کیا جاتا ہے۔ اقتصادی نظم و نسق کی سوجھ بوجھ میں کمی کے باعث بعض لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا" (تم اپنے وہ اموال نا سمجھ اور نا اہل لوگوں کے سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہارے لیے وجہِ بقا اور باعثِ استحکام بنایا ہے)

عہدِ رسالت میں جب منافقوں سے یہ کہا جاتا کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح دل سے ایمان لے آؤ اور اسلام کے خلاف خفیہ فتنہ و سازش بند کرو تو وہ جواب دیتے کہ دوسرے لوگ تو بیوقوف اور کم عقل ہیں جنھوں نے دل سے حضرت محمد ﷺ کی غلامی اختیار کرلی ہے اور اسلام کی خاطر ہر طرح کی جانی و مالی قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ کیا ہم بھی ان کی طرح بے وقوف ہو جائیں اور دنیوی منفعتوں کو نظر انداز کر دیں۔ ہمیں کیا پڑی کہ ان بیوقوفوں کی طرح ہر کسی سے مخالفت مول لیتے پھریں۔ اپنی رشتہ داریاں، دیرینہ دوستیاں اور سابقہ تعلقات بگاڑ لیں۔ پھر اسلام کے لیے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کہنے پر ہر قسم کی قربانی دیں۔ جنگوں میں حصہ لیں۔ دن کی مصروفیات اور رات کے آرام و سکوں کو قربان کریں۔ اپنی سرداریاں چھوڑیں اور ایک شخص کے حلقۂ غلامی میں آجائیں۔ دراصل ان منافقین کے سامنے اسلام کا اصل روپ اور روح

تھی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے صحابۂ کرامؓ کو حبیب کبریا ﷺ کے احکام کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بنتے دیکھا تھا۔ انہیں یہ حقیقت ہر وقت روزِ روشن کی طرح عیاں دکھائی دیتی تھی۔

؎ یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جب اہلِ مدینہ کا ایک وفد بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضور علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے کر قبولِ اسلام کا حلف اٹھا رہا تھا۔ تو اس وقت حضرت عباس بن عبادہ انصاریؓ نے کھڑے ہو کر برملا یہ اعلان کیا۔ **انکم تبایعونہ علی حرب الاحمر والاسود من الناس** (تم نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر فی الحقیقت اس امر کی بیعت کر رہے ہو کہ اسلام کی خاطر دنیا کے ہر سرخ و سیاہ انسان سے جنگ کرو گے) جس پر سب نے بیک آواز لبیک کہا۔ یہ تھی وہ بنیادی روح جو ایمان لاتے ہی، عالمِ کفر و طاغوت کی بے پناہ مخالفتوں اور عداوتوں کی وجہ سے ہر مسلمان کیلئے لازمۂ حیات بن جاتی تھی۔ اس کے بغیر کسی کا مسلمان ہونا ہی نامکمل رہتا تھا۔ منافقین کی سوچ کیونکہ خالصتاً مادیت پرستی پر مبنی تھی۔ وہ ہر چیز کو دنیوی سود و زیاں کے مزعومہ پیمانے پر پرکھتے تھے۔ سابقہ آرام کی زندگی کو چھوڑ کر اس مسلسل انقلابی زندگی کو اپنا لینا انہیں اپنی نظر میں عقلمندی کا فیصلہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس لیے وہ سب مسلمانوں کو بے وقوف اور خود کو عقلمند تصور کرتے تھے۔ قرآن ان کی نام نہاد عقلمندی کو بے سمجھی اور کم فہمی سے تعبیر کر رہا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس قربانی کی زندگی میں سب سے بڑا نفع مضمر ہے۔ آخرت کا نفع تمام دنیوی منافع سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ وہ خود چار روزہ زندگی کی ظاہری منفعت کو دیکھ کر اخروی زندگی کی ابدی اور دائمی منفعت کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ یہ بے سمجھی اور بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ باری تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے "**قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى**" (نساء: ۷۷) "فرما دیجئے دنیا کی ساری دولت، اپنی حیثیت کے لحاظ سے قلیل ہے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کیلئے آخرت بہترین دولت ہے۔"

قرآن مجید نے منافقت کی یہ علامت ایک مستقل مادہ پرستانہ ذہنیت کے طور پر نمایاں کی ہے۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس ذہنیت سے کُلّیتاً پاک ہیں؟ اگر کوئی خوش

نصیب دین حق کی راہ میں معمولی سی قربانی کیلئے بھی تیار ہوتا ہے تو اس کے اَعِزّاء واقارب اور دوست واحباب کیا اسے بیوقوف تصور نہیں کرتے؟ کیا اسے اپنا وقت مال ودولت اور دیگر آسائشوں کے زیاں کا طعنہ نہیں دیتے؟ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو اندازہ فرمایئے کہ منافقت کس حد تک ہمارے رگ و ریشہ میں رچ بس چکی ہے۔ ہم دین کو صرف اسی حد تک اپنانے کیلئے تیار ہیں۔ جس حد تک جانی ومالی قربانی کا تقاضا نہ ہو۔ جہاں دینِ حق کو جان، مال اور وقت کی قربانی مطلوب ہو۔ ہم اس حد میں داخل ہونے کو بے وقوفی سمجھتے ہیں۔ یہ ہے منافقت کی وہ اصل جو دین کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ یاد رکھیے! کہ دین سراسر قربانی کا نام ہے۔ اگر زندگی اس جذبے اور عمل سے خالی ہو تو کوئی بھی شخص جس قدر دینداری کا چاہے ڈھنڈورا پیٹتا رہے قرآن کی نظر میں اس کا نام منافقت ہے۔ ایسی منافقت کے ساتھ ادا کی جانے والی نمازیں بھی ریاکاری متصور ہوتی ہیں جن پر بجائے ثواب کے متحقق ہونے کے سخت اذیت ناک عذاب کی وعید آئی ہے۔ سورہ الماعون اس حقیقت کی واضح عکاسی کر رہی ہے۔

امت مسلمہ کے اکثر افراد کو گمراہ تصور کرنا منافقانہ سوچ ہے:۔

اہلِ مدینہ میں سے اکثر افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ جب کہ منافقین کی تعداد ان کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ یہاں قرآن مجید نے ایک اصولی انداز کو اپنایا ہے۔ منافقین سے کہا جا رہا ہے۔ "**اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ**" (جس طرح مدینہ کے اکثر افراد ایمان لا چکے ہیں۔ تم بھی انہی کی طرح ایمان لے آوٴ) قاعدہ یہ ہے "**للاکثر حکم الکل**" (اکثر کیلئے کل کا ہی حکم ہوتا ہے)۔ یہاں بھی "الناس" سے مراد "اکثر الناس" ہیں کیونکہ سارے لوگ تو صاف ظاہر ہے ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔ ان میں اکثر افراد نے ہی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ یہاں قرآنی استدلال یہ ہے کہ جب اکثر افرادِ امت دل وجان سے حلقہ بگوش اسلام ہو کر حضور علیہ السلام کی غلامی اختیار کر چکے ہیں تو تم اقلیت میں ہوتے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت کی مخالفت کیوں کر رہے ہو؟ تم بھی اپنی عقل ودانش کے ناقص فیصلے پر ڈٹے رہنے کی بجائے اہلِ اسلام کی اکثریت کی پیروی کر لو اور ایمان لے آوٴ۔ اس پر منافقین یہ جواب دیتے تھے کہ وہ تو سب کے سب کم فہم، کم علم اور بے عقل ہیں۔ وہ تو گمراہ ہو چکے ہیں۔ بھلا ہم ان بے وقوفوں کے پیچھے کیوں لگ

جائیں۔ قرآن مجید نے اس اندازِ فکر کو منافقت سے تعبیر کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت کو گمراہ اور بے عقل تصور کرنا خود بے عقلی اور گمراہی کی بات ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی سوسائٹی کے چند افراد یا کوئی ایک آدھ شخص خود کو ہی صاحبِ عقل و فہم اور راست فکر کا حامل تصور کرتے ہوئے اپنی رائے اور تحقیق کو صحیح اور باقی امتِ مسلمہ کی اکثریت کو گمراہ قرار دینے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی اکثریت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اہل اسلام کی اکثریتی جماعت پر خدا کی حفاظت کا ہاتھ رہتا ہے۔ یہ نبیٔ اکرم ﷺ کی رحمت و برکت کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ "**ان اللّٰہ لا یجمع امتی علی ضلالۃ ید اللّٰہ علی الجماعۃ من شذ شذ الی النار**" (رواہ ترمذی عن ابن عمرؓ) (اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر کبھی اکٹھا نہ ہونے دیگا۔ جماعت پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا ہاتھ ہے جو کوئی اس سے جدا ہو گا، دوزخ میں جا پڑے گا)۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں "**لن تجتمع امتی علی خطاء**" (میری امت کبھی بھی غلطی پر جمع نہیں ہو سکتی)۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امت کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ حضور علیہ السلام نے خود اس امر کی وضاحت یوں فرمائی ہے۔ "**اثنان خیر من واحد و ثلاثۃ خیر من اثنین و اربعۃ خیر من ثلاثۃ فعلیکم بالجماعۃ فان اللّٰہ لن یجمع امتی الا علی الھدی**" (حدیث صحیح، مسند احمد بن حنبل۔ رواہ ابوذرؓ) (کسی مسئلے پر دو کا ایک کے مقابلے میں جمع ہونا بہتر اور محفوظ ہے۔ اسی طرح تین، دو کے مقابلے میں بہتر ہیں اور چار تین کے مقابلے میں۔ تم پر اکثریتی جماعت کی پیروی لازم ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ میری امت کو سوائے ہدایت کے کسی غلط بات پر جمع نہیں ہونے دیگا)۔ کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۳۷ پر حضرت ابو جعفرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا "**تشاوروا فی امرکم فان کان اثنان و اثنان فارجعوا فی الشوری و ان کان اربعہ و اثنان فخذوا صنف الاکثر**" (طبقات ابن سعد) (اپنے امور میں باہمی مشورہ کیا کرو۔ اگر کسی مسئلے پر رائے دو اور دو افراد میں مساوی تقسیم ہو جائے تو پھر اسے شوریٰ میں لے جاؤ۔ اگر رائے کی تقسیم چار اور دو میں ہو جائے تو اکثریتی رائے کو اپنا لو)

امتِ مسلمہ کی اکثریتی رائے کو تمام امت یا کل جماعتِ مسلمہ کی رائے اس

لیے قرار دیا گیا ہے کہ ہر مسئلے پر فی الواقع سو فی صد اتفاق رائے عقلاً و نقلاً ناممکنات میں سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا عمل بھی یہی تھا کہ مشاورت میں اکثریتی رائے کا احترام فرماتے۔ خلفاء راشدین کے استخلاف میں جہاں بھی ضرورت پڑی اسی اصول کو اپنایا گیا بلکہ اکثریتی رائے کے اقلیتی رائے پر فائق ہونے کا اصول پوری دنیا کے مسلمات میں سے ہے۔ جس پر اہلِ اسلام اور غیر اہلِ اسلام میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ قرآن مجید نے یہاں منافقین کے اقلیتی گروہ کو "**کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ**" کہہ کر اکثریتی طبقے کی راہ کو اپنانے کا استدلال اختیار کیا۔ جس پر ان کا جواب یہ تھا کہ "ہم کیسے ان لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ وہ تو عقل و شعور اور فہم و بصیرت سے عاری ہیں" باری تعالیٰ نے اس اندازِ فکر کو منافقت سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا! اپنی رائے اور تحقیق کو اکثریتی رائے اور تحقیق پر فائق سمجھنا اور مسلمانوں کی اکثریت کو گمراہ تصور کرنا خود گمراہی' بے عقلی اور بے بصیرتی ہے۔ گویا اس اصول کے بیان سے قرآن حکیم نے امتِ مسلمہ کے اندر نام نہاد اصلاح و تجدید کے نام پر آئے دن پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے فکری اور اعتقادی فتنوں اور متجددانہ تحریکوں کا سدِباب کیا ہے۔ جو ہمیشہ امتِ مسلمہ کے اکثریتی طبقے کو گمراہ' کافر و مشرک' بدعتی اور بیوقوف قرار دیتی ہیں۔ اس تصور کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مسلمانوں کے اکثریتی طبقے میں کوئی خرابی یا بگاڑ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ امرِ واقع ہے کہ بگاڑ اور خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن ہمیشہ پیغمبرانہ تعلیمات کے مطابق اکثریتی طبقے کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے' یعنی سوادِ اعظم سے منسلک رہتے ہوئے ہی امت کی اصلاح کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اہلِ ایمان کے سوادِ اعظم کو گمراہ قرار دے کر اس سے خارج ہو کر اپنے لیے نئی راہ بنانا یہی حقیقت میں گمراہی اور منافقت ہے۔ اور اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس مفہوم کو حضرت علیؓ نے بھی ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "**والزموا السواد الاعظم فان ید اللہ علی الجماعۃ وایاکم والفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب**" (نہج البلاغہ: ۳۸۳ مطبوعہ تہران) (امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے گروہ سے منسلک ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی حفاظت کا ہاتھ اس جماعت پر ہے اور اس اکثریتی طبقے سے الگ ہونے یعنی فرقہ بندی کرنے سے گریز کرو۔ بیشک جو لوگوں

کے اکثریتی گروہ سے الگ ہوتا ہے شیطان کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے جیسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے الگ ہونے والی بکری بھیڑیئے کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے)

کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ سے اجماعِ امت کے وجوب پر استدلال:

اس آیت کا مبداءِ استدلال یہ بھی ہے کہ امت کی اکثریت کا کسی مسئلے پر متفق ہو جانا خود بھی شرعی دلیل قرار پاجاتا ہے۔ اس پر عمل اور اس سے انحراف حرام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ مجید میں بالعموم اہلِ ایمان کی راہ کی پیروی نہ کرنے کو براہِ راست رسولِ اکرم ﷺ کی مخالفت اور گمراہی قرار دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: **"مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا"** (جو کوئی ہدایت کے آشکار ہو جانے کے بعد رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور اہلِ ایمان کی راہ کے بجائے کسی دوسری راہ کی پیروی کریگا تو ہم اسے اسی گمراہی میں بھٹکنے دیں گے اور اسے جہنم میں ڈالیں گے جو نہایت برا ٹھکانہ ہے) لہٰذا آیت زیرِ مطالعہ' آیت متذکرہ اور مذکورہ بالا احادیث سب اجماعِ امت کے واجب ہونے کی مقتضی ہیں۔ اس لیے اہلِ اسلام کے نزدیک متفقہ طور پر قرآن وسنت کے بعد "اجماع" کو تیسرا ماخذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اجماعِ امت یا مسلمانوں کے اکثریتی طبقے کے اتفاق رائے سے مراد امت کے جہلاء اور محض عوام ہی کی اکثریت کا بغیر دلیل کے کسی مسئلے پر مجتمع ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ عوام کو تو از خود مسائل کا صحیح علم اور فہم بھی نہیں ہوتا۔ جب امت کا اکثریتی طبقہ کسی دینی موقف پر متفق ہوتا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد علماء راسخین اور مجتہدینِ امت کی تحقیق وتصریح یا اہلِ علم کا تعامل وتواتر ہی ہوتا ہے۔ اہلِ علم کے قبول عام کی بنا پر اس شرعی موقف کو امت مسلمہ کی اکثریت بھی قبول کر لیتی ہے۔

لہٰذا اس پر ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے کہ امت مسلمہ کے اکثریتی طبقے کا اجماع از خود واقع نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اجماع ہمیشہ اہلِ علم واجتہاد کی اکثریت کے نزدیک کسی مسئلے کے "تلقی بالقبول" کی بناء پر واقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجماعِ امت یا سوادِ اعظم پر مبنی مذہب کو شریعت نے مذہبِ حق قرار دیا ہے۔

عہدِ صحابہؓ میں بھی تمام صحابہؓ معروف بالعلم والاجتہاد نہ تھے۔ رسوخ فی العلم اور اجتہادی بصیرت تو بعض صحابہ کو ہی حاصل تھی۔ جب کہ باقی صحابہؓ اس دور کے عوام الناس کے زمرے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اجماعِ صحابہؓ یا صحابہؓ کے اکثریتی طبقے کا اتفاقِ رائے اس لیے آج بھی شرعاً حجت ہے کہ اس کی بنیاد بھی اہلِ علم صحابہؓ کا اجتہاد ہوتا تھا جو ہمیشہ قرآن وسنت کی روشنی میں واقع ہوتا۔ جب اسے تمام یا اکثر صحابہؓ میں قبولِ عام حاصل ہو جاتا تو وہی اجتہاد' اجماع قرار پاتا اور اسی کو سوادِ اعظم کا مسلک کہا جاتا تھا۔ تعاملِ صحابہؓ اور آثارِ تابعینؒ کے متعدد نظائر و شواہد اسی طور واقع ہوئے ہیں۔

لہٰذا امت محمدی ﷺ کے اکثریتی طبقے کو قرآن وسنت کے خلاف اور گمراہ تصور کرنا دراصل اپنی آمریت کو قرآن وسنت یا اسلام کا نام دے کر دوسروں پر مسلط کرنے کی خواہش ہے۔ اس لیے اسے قرآن مجید نے منافقت قرار دیا ہے۔

آیت ۱۴، ۱۵ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۞

۱۴۔ کردار کا دوغلاپن اور سازشی منصوبہ بندی کھلی منافقت ہے۔

یہاں منافقت کی ایک اور علامت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے کردار کا دوغلا پن۔ اسی کو ظاہر و باطن کا تضاد کہتے ہیں۔ منافقین کا رویہ بزدلانہ تھا۔ وہ اپنے اندر کے کفر کو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے باعث ظاہر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اپنا تعلق اپنے وڈیروں اور سرپرستوں سے منقطع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا وطیرہ اس دوغلے کردار کی غمازی کرتا تھا

؎ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

اپنی طرف سے ان کا یہ طریقِ کار نہایت مخفی اور رازدارانہ تھا۔ لیکن قرآن ان کی منافقانہ نفسیات اور بزدلانہ روشِ زندگی کو بے نقاب کر رہا ہے کہ جب غلامانِ محمد ﷺ سے ملتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یعنی ہم مسلمان ہیں اور سابقہ حالتِ کفر سے تائب ہو چکے ہیں اور جب اپنے کفر کے رؤساء و قائدین کے

پاس علیحدگی میں جاتے ہیں تو انہیں اپنی وفاداری اور کفر سے وابستگی کا یقین دلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں مسلمانوں سے راہ ورسم اور ملنا جلنا انہیں بے وقوف بنانے کیلئے ہے اور ان سے ہم جو اپنے مسلمان ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ محض تمسخر اور استہزاء ہے یہ تھا ان کے کردار کا دوغلا پن' جسے قرآن نے نمایاں طور پر انہی کے الفاظ میں واضح کردیا۔

خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ کا مفہوم

اس آیت میں منافقین کے دو اقوال کا ذکر ہے۔ **ایک قولِ ایمان'** جو وہ مسلمانوں سے کرتے تھے اور دوسرا قولِ کفر' جو وہ کفر کے سرغنوں سے کرتے تھے۔ پہلے قول کیلئے "**اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا**" کے الفاظ آئے ہیں (کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو انہیں اپنے مسلمان ہونے کی یقین دہانی کراتے ہیں) لیکن کفر کے قول کیلئے "**اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ**" کے الفاظ آئے ہیں۔ (کہ جب اپنے شیطانوں سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو انہیں اپنے کفر کی یقین دہانی کراتے ہیں) "**خلا الیہ یا خلا فلان بفلان**" کے معنی ہیں "وہ اس کے ساتھ علیحدگی میں ملا یا اس کے ساتھ خلوت میں ہوا" یہاں اس امر کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ منافقین کا قولِ کفر' خلوت میں ہوتا تھا یعنی یہ ان کا باطن تھا اور قول ایمان وہ ظاہر میں کرتے تھے۔ گویا ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد تو تھا ہی لیکن اس کی نوعیت یہ تھی کہ وہ ظاہرًا ایمان' اسلام' نیکی اور اچھائی کی بات کرتے تھے لیکن ان کا باطن کفر اور بدی سے لبریز ہوتا تھا۔ اسی نوعیت کے تضاد کو قرآن نے منافقت قرار دیا ہے۔ یہ ایسا دائمی معیار ہے کہ ہر شخص اپنے ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت کے تضاد کو پرکھ کر یہ تعین کرسکتا ہے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔

سازشی منصوبہ بندی منافقت کا بڑا گھناؤنا روپ ہے۔

اس آیت میں **خَلَوْا** اور **شَیٰطِیْنِہِمْ** دونوں الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔

خلوا کے لفظ سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اہلِ حق کے خلاف ساری سازشیں اور ریشہ دوانیاں خلوت میں مخفی اور سازشی انداز میں ہوتی تھیں۔ منافق لوگ اہلِ حق کی مخالفت کھلے انداز میں نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے انہیں خوشامدانہ رویے سے پیش آتے تھے۔ ان کے سامنے ایسے کلمات بھی کہتے جن سے انہیں ظاہرًا خوش کرنا

مقصود ہوتا۔ ان کی تائید کرتے اور اپنے آپ کو ان کا ہمنوا ظاہر کرتے۔ لیکن ان کے خلاف چھپ کر اپنی مخصوص مجلسوں میں سازشیں اور گھناؤنے منصوبے تیار کرتے رہتے تھے۔ منافقت کا یہ بیان اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مخفی اور سازشی انداز کی کاروائیاں اور بند کمروں کے منصوبے سب اپنی اصل کے لحاظ سے منافقت ہوتے ہیں۔ اہلِ حق' سچائی کی بات کو ہر جگہ یکساں طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ اگر دینی تقاضے کے تحت کسی کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو وہ بھی کھلی اور دو ٹوک ہوتی ہے۔ ان کی مخالفت میں بھی مخفی سازش کا عنصر کارفرما نہیں ہوتا۔ ہمارے معاشرے میں اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کے خلاف سازش کرنا اور مخفی طریقوں سے ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ایک عمومی رویہ بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ مذہب کے کئی نام نہاد داعی بھی دوسروں کے خلاف سازش اور مخفی منصوبہ بندی (Intrigue اور Conspiracy) میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ کسی کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو چھپے انداز میں۔ یہ منافقت بعض طبیعتوں میں اتنی عام ہوتی جا رہی ہے کہ ان کا پورا کردار اسی عمل سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے۔ طریقِ کار کے اعتبار سے یہ حق و باطل کے درمیان معیارِ امتیاز ہے۔ آپ کسی بھی فرد' طبقے' گروہ یا جماعت کے طور طریقوں سے اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی بنیاد حق ہے یا منافقت۔ کیونکہ قرآن کی یہ تعلیمات محض واقعات پر نہیں بلکہ ابدی اصولوں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم اپنے ذہنی تراشیدہ معیارات کے بجائے فی الحقیقت قرآنی معیارات پر جانچ کر حق و باطل کا تعین کریں تو بہت سی حقیقتیں بے نقاب ہو سکتی ہیں۔

سازشی سرغنے قرآن کی اصطلاح میں شیطان ہیں۔

شیطان کا لفظ شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔ شیطان رحمتِ الٰہی سے دور اور محروم ہونے والے کو کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک شیطان' **شاط یشیط** سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی غضب میں جلنے کے ہیں۔ یہ جلد باز' مشتعل مزاج' متمرد اور شریر و سرکش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کی مزید لغوی تحقیق اور معنوی تفصیلات و اطلاقات "تسمیۃ القرآن" کے حصے "**اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ**" کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف یہ

بیان کرنا مقصود ہے کہ اس جگہ قرآن مجید نے گروہ منافقین کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ "ایک عام منافقین" "دوسرے شیاطین"۔عام منافقین سے مراد وہ تمام لوگ تھے جو زبان پر کلمۂِ اسلام اور دل میں کلمۂِ کفر رکھتے تھے۔ جن کا ذکر اس آیت کے سیاق وسباق میں چلا آرہا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت محض کارکنوں کی تھی۔ کفر کے اصل سرغنے تو وہ سردار اور لیڈر تھے جو مخصوص مجلسیں سجا کر بیٹھتے اور مسلمانوں کے خلاف مخفی سازشیں کرتے تھے۔ ان کو قرآن مجید نے ان کے گھناؤنے کردار کی بناء پر شیاطین قرار دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا عمل عام منافقوں سے کہیں زیادہ قبیح تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں شیطان کہا گیا۔ یہ الفاظ منافقانہ اور سازشی کارروائیوں کی سرپرستی کرنے والے لیڈروں اور سرغنوں کیلئے لمحۂِ فکریہ ہیں۔

تمسخر اور استہزاء کی نفسیات۔

مسلمانوں سے تمسخر اور استہزاء کی نفسیات بذاتِ خود منافقت ہے۔ غلط بیانی اور طعنہ زنی کا انداز بھی اسی میں شامل ہے۔ علامہ زمخشریؒ نے استہزاء کا معنی "**انزال الھوان والحقارۃ**" یعنی ذلت اور حقارت کا وارد کرنا' کیا ہے۔ کیونکہ استہزاء کرنے والے کا اصل مقصد دوسرے کی تحقیر ہوتا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے بھی "روح المعانی" میں یہی معنی بیان کیا ہے۔ بیضاوی لکھتے ہیں کہ استہزاء کی اصل "ہزا" ہے۔ جس کے معنی خفت کے ہیں اور یہ سرعت سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا استہزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے۔ ہنسنا محض ایک ذریعہ ہے جس سے تحقیر کی جاتی ہے۔ تحقیر کے بغیر ہنسنا' استہزاء نہیں کہلاتا۔ یہاں منافقین کی مخصوص ذہنیت اور عادت کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر تھی۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے تھے۔ استہزاء ان کی اسی سوچ کا مظہر تھا۔ اس سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ وہ اہلِ حق کو حقیر اور خود کو اعلیٰ وفائق تصور کرتے تھے۔ اسی لیے تو ان کے نزدیک مسلمانوں کے استہزاء کا جواز نکلتا تھا۔ یہی سوچ بد قسمتی سے آج ہمارے ہاں حاوی ہوتی جارہی ہے۔ بہت سے لوگ عامۃ المسلمین کو حقیر' بے وقعت اور ناسمجھ جان کر انہیں قابلِ التفات نہیں سمجھتے بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کے عوام کو اسی سوچ کے تحت حقیر جان کر نظر انداز کرنا از روئے قرآن مذموم اور علاماتِ منافقت

میں سے ہے۔ اس بیان سے یہ تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے کہ طنز' تمسخر اور استہزاء کا انداز عام گفتگو میں بھی ہرگز روا نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ بات اسلام کے آداب گفتگو کے صریح خلاف ہے۔ آدابِ گفتگو کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے اس کا منشاء و مراد اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے متضاد نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ منافقوں کو ذلت و رسوائی کی سزا دیتا ہے۔

"اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ" کے دو معنی ہیں اور یہاں فی الحقیقت دونوں مراد ہیں۔ استہزاء کا لفظ اس آیت میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے منافقین کے فعل کے طور پر اور اب باری تعالیٰ کے فعل کے طور پر۔ اس حکمت کو سمجھنے کے لیے ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ جب بھی کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا درکار ہو تو عام طور پر ظاہراً وہی فعل بولا جاتا ہے۔ جو انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر دونوں کے استعمالات میں فرق یہ ہوتا ہے کہ چونکہ انسان ہر فعل میں ذرائع اور وسائط کا محتاج ہے یعنی اسکا ہر فعل کسی نہ کسی ذریعے اور واسطے کی صورت میں اپنی غرض و غایت اور اصل مقصود کو پہنچتا ہے۔ جو اس فعل کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن باری تعالیٰ اپنے فعل میں کسی ذریعے کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے جب کوئی لفظ انسانی فعل کے بیان کے لیے بولا جائیگا تو اس میں ذریعہ اور مقصود دونوں شامل ہوں گے۔ مگر وہی لفظ باری تعالیٰ کے فعل کے لیے بولا جائیگا تو اس سے مراد فعل کی صرف آخری غرض یعنی نتیجہ و مقصود ہوگا ذریعہ نہ ہوگا۔ مثلاً انسان دیکھتا ہے تو دیکھنے میں آنکھ اور روشنی دونوں کا محتاج ہے۔ اس لیے اس کے فعل میں یہ ذرائع بھی شامل ہونگے۔ مگر جب یہ کہا جائے کہ اللہ دیکھتا ہے تو یہاں آنکھ اور روشنی جیسے ذرائع نہیں بلکہ صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہی مراد ہوگی۔ اسی طرح انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا۔ اور اصل مقصود جو سننے سے حاصل ہوتا ہے مراد ہوگا۔ ایسے ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے دل پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا رحم اور غضب' دل کی کیفیات کا نہیں بلکہ صرف نتیجے کا نام ہے۔ یہی معنی "اللہ کے استہزاء" کا ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ استہزاء میں اصل غرض دوسرے کی ذلت و رسوائی ہے اور ہنسنا محض ذریعہ ہے۔ لہٰذا اللہ کے

استہزاء میں اصل غرض، مقصود اور نتیجہ باقی رہ گیا اور ہنسا جو ذریعہ تھا، مفقود ہو گیا۔ کیونکہ اللہ اس سے پاک ہے۔ چنانچہ "**اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِھِمْ**" کا معنی یہ ہو گا کہ "اللہ تعالیٰ ان منافقین کو ذلیل و رسوا کرے گا۔ ان کے اس استہزاء کے بدلے میں جو وہ اہلِ ایمان سے کرتے ہیں"۔

سزائے فعل کا ذکر اسی فعل سے کرنا اسلوب قرآن ہے۔

عربی زبان بلکہ خود قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ بعض اوقات کسی فعل پر دی جانے والی سزا کا ذکر بھی اسی فعل کے الفاظ میں کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ وہ لفظ فعل کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے اور دوسری مرتبہ سزائے فعل کے مفہوم پر۔ امام ابنِ جریرؒ کہتے ہیں کہ جب ایک ہی فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے فعل کی سزا ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے "**جزآؤُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا**" (الشوریٰ : ۴۰) (برے فعل کی جزا بھی اسی طرح بری ہوتی ہے) حالانکہ سزا تو عدل و انصاف کا عین تقاضا ہوتی ہے بری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا۔ "**فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ**" (بقرہ : ۱۹۴) (پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے۔ تم بھی اس پر زیادتی کرو یعنی اس کی زیادتی کی سزا دو) اسی آیت میں پھر حکم ہے۔ "**فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ**" ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔ "**وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا**" (البقرہ : ۱۹۰) (اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرو)

اسی طرح باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "**لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ**" (الحشر : ۱۹) (اور ان (بد نصیب) لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے ان کو بھلا دیا)۔ ایک مقام پر منافقین کا نام لیکر یہی بات یوں کہی گئی ہے "**نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ**" (التوبہ : ۶۷) (انہوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ نتیجتاً اللہ نے ان کو بھلا دیا۔ بیشک منافق ہی نافرمان ہیں)۔ حالانکہ خدا کی ذات بھولنے بھلانے سے پاک ہے۔ لیکن منافقین کے بھلانے پر جو سزا دی گئی۔ اس کو بھی بھلانے سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ استہزاء سے پاک ہے لیکن منافقین کے استہزاء پر جو سزا دی گئی اس کو بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے امام راغب اصفہانیؒ

نے المفردات میں اور ابنِ منظورؒ نے لسان العرب میں اسی معنی کی تائید کی ہے۔ علامہ قرطبیؒ کے بیان سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ صاحبِ جلالین اس کا معنی "**یجازیھم باستھزائھم**" (اللہ تعالیٰ ان کے مذاق پر انہیں سزا دیتا ہے) کرتے ہیں۔ "**سمی جزاء الاستھزاء باسمہ علی سبیل المشاکلۃ لانہ لایجوز الاستھزاء ای السخریۃ علیہ سبحانہ تعالیٰ شانہ عن العبث والجھل**" (طریق مشاکلہ پر استہزاء کی سزا کو بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے استہزاء یعنی تمسخر جائز نہیں۔ وہ ذات ہر عبث اور جہالت کے کام سے پاک ہے)۔ محاورۂ عرب کا استعمال بھی اسی معنی کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے کفار و مشرکین اس آیت کے نازل کے بعد کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

بعض منصوبوں کا کچھ دیر قائم رہنا ان کے حق ہونے کی دلیل نہیں۔

مَدَّ یَمُدُّ کے اصل معنی کھینچنا اور پھیلانا کے ہیں۔ اس میں "**امھال**" یعنی مہلت اور ڈھیل کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص خدا کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا اسے ڈھیل اور مہلت دیتے ہیں کہ چاہے تو کسی وقت بھی تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے یا پھر اپنی گمراہی اور سرکشی کی انتہاء کو پہنچ جائے۔ تاکہ اس کی رسی دراز کیے رکھنے کے بعد اس کی گرفت ہو تو اتنی ہی شدید ہو جتنی شدید اس کی سرکشی اور بغاوت تھی۔ اس آیت سے لوگوں کے اپنے اعمال اور گمراہی و سرکشی کی راہ اختیار کرنے کی نسبت اللہ کی طرف سے عطا کردہ آزادی اور اختیار بھی ثابت ہوتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کسی کو غلط راہ پر پڑنے کیلئے مجبور کرتا ہے اور نہ غلط کاری کے بعد مہلت دیئے بغیر کسی کی گرفت کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین کو بھی عہدِ رسالت ﷺ میں ڈھیل دی گئی۔ حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے بعد حضور ﷺ کے آخری ایام میں انہیں سزا دی گئی۔

یہاں تعلیم و تربیت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی شریر و سرکش کو اپنی منفی اور تخریبی کاروائیاں جاری رکھنے کا کچھ موقع ملا رہے اور اس کے منصوبے کچھ عرصے تک قائم رہیں تو نہ اس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ وہ حق ہے کیونکہ باطل ہوتا تو نیست و نابود ہو جاتا اور نہ یہ مراد لیا جائے کہ وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اسے زوال نہیں

آسکتا۔ یہ سب انسان کی ناقص عقل کی بھول ہے۔ حقیقت میں یہ مہلت نہ اس کی حقانیت کی علامت ہے اور نہ اس کے ہمیشہ باقی رہنے کی دلیل۔ اس میں اس کی کوئی کامیابی نہیں۔ اسے اس مہلت اور DURATION پر خوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ باری تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے تاکہ وہ اپنی گمراہی کے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے۔ اس تصور کو "یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ" کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

طغیان۔۔ طغیٰ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی نافرمانی میں حد سے گزر جانے کے آتے ہیں۔ اسی لیے اس کا ترجمہ سرکشی اور بغاوت کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا "اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی" (طٰہٰ: ۲۴) (فرعون کی طرف حق کا پیغام لے کر جا۔ وہ یقیناً حد سے گزر چکا ہے)

یعمهون۔۔ عمه کے معنی ہیں "التردد فی الامر من التحیر" (المفردات) (تحیر کی وجہ سے کسی معاملے میں متردد ہونا)۔ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ یہ لفظ عمی کی مانند ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ عمی۔ اندھاپن، ظاہری نابینائی اور عقل و فکر یا رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن عمه۔۔ صرف عقل و فکر کی یعنی باطنی نابینائی پر استعمال ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی نافرمانی کے باعث ایسے لوگ باطنی روشنی اور صحیح فکری رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی گمراہی و سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ تاوقتیکہ اپنے تمرد اور بغاوت سے تائب ہو جائیں یا بدبختی میں اس انتہاء کو پہنچ جائیں کہ پھر ان پر عذابِ الٰہی کی گرفت اتنی سخت ہو کہ وہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔

آیت : ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًاجِ فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ
بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ● صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ
لَا يَرْجِعُوْنَ ● اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ج
يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ
مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ● يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ
مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَاَبْصَارِهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ●

۱۴۔ منافقین کے دو گروہوں کی مثال :۔

پہلا گروہ :۔

مجموعی طور پر منافق دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو دل سے کفر ہی پر قائم تھے اور صرف زبان کی حد تک دعوئِ ایمان کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تعصب اور عناد کی بناء پر اسلام کو سرے سے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ گویا یہ قطعی منکر تھے۔ دوسرے جو ایمان تو قبول کرتے۔ لیکن اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا کر اور اپنے مذعومہ مفادات کو معرضِ خطر میں دیکھ کر پھر اسلام سے دستبردار ہو جاتے۔ ان کا دل ایمان لانے کے لیے تیار ہوتا مگر ہمیشہ مفادات اور خطرات آڑے آجاتے تھے۔ گویا یہ تذبذب اور شک کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس آیت میں پہلے گروہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے اور دوسرے گروہ کی تمثیل آگے آیت ۱۹ میں آرہی ہے اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے حق کی آگ روشن کی اور اس کے نور سے سارا گردو نواح منور ہو گیا۔ ایک معنی کے مطابق اس سے مراد جناب سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ **مثلی کمثل رجل استوقد**

نارا (میری مثال اس شخص کی مانند ہے۔ جس نے آگ جلائی) آپ ﷺ نے اسلام کے پیغام اور اپنے نورِ تبلیغ سے زندگی کے تمام ماحول کو روشن کر دیا۔ حق کو باطل سے' خیر کو شر سے اور نیکی کو بدی سے نمایاں کر دیا۔ وہ ماحولِ حیات جو شبِ تاریک کی مانند ظلمتوں اور گمراہیوں کا گہوارہ تھا حضور علیہ السلام کے مہیا کردہ نورِ ہدایت سے چمک اٹھا اور ہر طرف پیغامِ حق کا اجالا ہو گیا۔ جو اہلِ نظر اور اربابِ دانش تھے۔ ان پر ساری حقیقتیں آشکار ہو گئیں۔ لیکن منافق جو ہوا و ہوس کی پرستش میں سب سے آگے جا چکے تھے باوجود روشنی کے حقیقت کو نہ پا سکے۔ انہوں نے اس نورِ ہدایت کو ٹھکرا دیا اور تعصب و عناد کے پردے اٹھا کر حق و صداقت کا روشن چہرہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ جب انہوں نے از خود گمراہی کو ہدایت پر اور ظلمت کو روشنی پر ترجیح دی اور نورِ حق سے منہ پھیر کر کفر و ضلالت کی تاریکیوں کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا۔ یعنی انہیں حسبِ خواہش گمراہیوں اور ظلمتوں میں بھٹکنے دیا۔ جنہوں نے اس نور سے اکتسابِ فیض کیا تھا وہ منزلِ مراد کو پا گئے اور جو اس کے منکر ہوئے تھے وہ کفر کی ظلمات میں بھٹکتے رہے۔

صُمٌّ۔ اَصَم کی جمع ہے **بُکْمٌ۔ ابکَمُ** کی جمع ہے اور **عُمْیٌ۔ اعمٰی** کی جمع ہے۔ ان کے معنی بالترتیب بہرا گونگا اور اندھا کے ہیں۔ ان کی گمراہی اور قبولِ حق سے انکار کا یہ عالم ہے کہ ان کے کان حق کی بات سننے سے قاصر ہیں۔ ان کی زبانیں حق کہنے سے عاری ہیں اور ان کی آنکھیں حق کو دیکھنے سے محروم ہیں۔ یہاں مولانا نعیم الدین مراد آبادیؒ نے مذکورہ تمثیل کی وضاحت میں خوب نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں "جنہوں نے اظہارِ ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مومن ہونے کے بعد مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرتِ سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کر دیا مگر انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے' ماننے' کہنے اور راہ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان' زبان' آنکھ سب بے کار ہیں۔" (خزائن العرفان علی کنز الایمان)

دوسرا گروہ

اس جگہ منافقین کی دوسری قسم کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ الفاظ کے

مرادی معنیٰ سمجھنے سے پہلے لغوی معنیٰ پر توجہ کرلیں۔

صیب۔۔ **صوب** سے مشتق ہے۔ **صواب' فی نفسہ** پسندیدہ امر کو کہتے ہیں چنانچہ **صوب یا صیب** ایسی بارش کو کہا جاتا ہے جو فائدہ مند ہو۔ صیب خود ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں۔

السماء۔۔ ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ محض بلندی پر بھی بولا جاتا ہے۔ سماء کے لفظ کا اطلاق زمین پر پڑنے سے پہلے بارش پر بھی ہوتا ہے اور سماء کے معنیٰ خود "سحاب" یعنی بادل کے بھی ہیں۔

الصواعق۔۔ صاعقہ کی جمع ہے۔ اور صعق سے مشتق ہے۔

صاعقہ اس ہولناک آواز کو کہا جاتا ہے جو گرج اور کڑک سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بعض اوقات آگ' موت اور عذاب بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ لیکن امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔۔ **"فهو اشياء حاصلة" من الصاعقة" هي الصوت الشديد من الجو۔۔ وهي في ذاتها شئ واحد وهذا الاشياء تاثيرات منها"** (المفردات) یہ سب چیزیں فی الحقیقت صاعقہ کے نتائج اور تاثیرات ہیں۔ صاعقہ محض ہولناک آواز ہی کا نام ہے۔ جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے زلزلے اور آندھی میں جو ہولناک آواز آتی ہے۔ اس پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس تمثیل میں آسمان سے برسنے والی بارش سے مراد وحیٔ الٰہی کا نزول یا اسلام ہے۔ جو عالمِ انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیروں سے مراد وہ مصائب ومشکلات ہیں جنھوں نے ہر طرف سے اسلام کو گھیر لیا تھا۔ گرج اور کڑک سے مراد اہلِ اسلام پر دشمنوں کے وہ خوفناک حملے ہیں۔ جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے تھے۔ چمک سے مراد اسلام کی وہ پے در پے فتوحات اور کامیابیاں ہیں جو باوجود مشکلات اور ناساعد حالات کے مطلع کو روشن کررہی تھیں اور ان کے باعث اہلِ اسلام کے دلوں کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

اسلام بلاشک وشبہ حق کی بارشِ رحمت بن کر مردہ دلوں کو تازہ زندگی عطا کرتا ہے۔ جس طرح زوردار بارش کے وقت بسا اوقات تیز آندھیاں اور گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور بادل کی ہولناک کڑک سے دل دہلنے لگتے ہیں۔ دورِ رسالت ﷺ میں اسلام

کی آمد کے ساتھ ہی باطل اور کفر و طاغوت کی طرف سے کھلی عداوتوں اور پوشیدہ سازشوں کا لامحدود سلسلہ جاری ہوگیا۔ اہلِ حق کی راہ میں طرح طرح کی مخالفتیں اور مزاحمتیں کھڑی ہوگئیں۔ مصائب و آلام کے بادل گرجنے لگے۔

ان تمام ہوناکیوں نے مل کر عجیب وحشت کا سماں پیدا کردیا۔ جنھوں نے صدقِ دل سے نورِ ہدایت کو قبول کرلیا تھا۔ وہ ظاہرًا ان ناسازگار حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ کوئی مصیبت اور مخالفت بھی ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکی۔ لیکن جو لوگ نیم دلی اور بزدلی کا شکار تھے۔ جن کی کیفیت تذبذب اور تربص کی تھی۔ وہ اسلام کی حیات بخشی اور نفع مندی سے بھی متمتع ہونا چاہتے تھے۔ لیکن مومنانہ جرأت و ہمت کے فقدان کے باعث مصائب و آلام کی تاریک گھٹاؤں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے اور شدید مخالفت و مزاحمت کی ہولناک آوازوں کو سن کر ان کے دل دہل جاتے تھے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر گویا وہ ان پریشان کن کیفیات سے لاتعلقی ظاہر کرتے تھے یوں اسلام سے وابستگی منقطع کرنے میں وہ اپنی عافیت تصور کرتے تھے۔

یہاں ان کے حسد کی کیفیت بیان کی جارہی ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود اسلام کو روز بروز ترقی اور فتح و کامرانی نصیب ہو رہی تھی۔ جنگوں میں فتوحات ہوتیں۔ اہلِ حق کے ہاتھ اموالِ غنیمت آتے۔ ان کی مالی حیثیت بھی مستحکم ہوتی اور سیاسی و معاشرتی بھی اور اس طرح لمحہ بہ لمحہ اسلام ایک عالمگیر قوت بنتا جارہا تھا۔ جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی تو وہ حیران و ششدر رہ جاتے اور اسلام کی فتح و کامرانی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل اٹھتے۔ ان کی اسی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی فتوحات کی چمک اور دمک کہیں ان حاسدوں کی آنکھوں کی بینائی ہی سلب نہ کرلے۔ ان کامیابیوں کی روشنی کو دیکھ کی انہیں اسلام کا راستہ آسان نظر آنے لگتا تو وہ مفاد پرستی اور دنیوی منفعت کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ ہو جاتے اور ان کے ہمراہ اسلام کی منزل کی طرف بڑھنے لگتے۔ لیکن اسی اثنا میں جنگ و قتال اور ایثار و قربانی کا کوئی مرحلہ آجاتا تو مشکلات کی تاریکیوں میں وہیں رک جاتے اور خطرات دیکھ کر مسلمانوں کو پھر چھوڑ جاتے۔ یہ تھا ان کا مفاد پرستانہ طرز عمل کہ ظاہری منافع و مفادات کے حصول کی امید لگتی تو فائدہ اٹھانے کے لیے اہلِ حق کے ساتھ ہو جاتے۔ خطرات و مصائب کے لمحات میں قربانی کا وقت آتا تو فورًا لاتعلق ہو جاتے۔

لو حرفِ شرط ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا گیا۔ **لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ** (اگر ہم چاہتے کہ لہو ولعب کو اپنائیں تو ہم اسے اپنی طرف سے اختیار کر لیتے) یہ انداز کسی خلافِ مشیت امر کے بیان کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ اس بیان کا مقصود مذکورہ امر کی نفی ہوتا ہے۔

شاء۔ مشیئۃ "کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی شۓ کی ایجاد ہے۔ جب کہ انسان کی مشیت "اصابۃ۔ الشی" یعنی کسی شے کے ارادے کا نام ہے۔ شئی اصل میں شاء کا مصدر ہے جو بمعنیٰ مفعول استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ "جو چیز چاہی گئی"۔ یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا گیا۔ بعض علماء کے نزدیک شئی اس چیز کو کہا جاتا ہے۔ جو جانی جائے اور جس کی خبر دی جائے۔ "ما صح ان یعلم او یخبر عنہ" (کشاف) یہاں اللہ تعالیٰ یہ واضح فرما رہا ہے کہ اگر میں چاہتا تو پہلے گروہ کی طرح ان کی بصارت اور سماعت بھی سلب کر لیتا اور انہیں اسلام کی طرف وقتی طور پر راغب ہونے کی بھی توفیق نہ ملتی۔ لیکن یہ مشیتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ جو شخص جس قدر سننے اور دیکھنے کے لیے تیار ہو اسے اسی قدر توفیق مرحمت فرمائی جاتی ہے۔ اس پر ذاتِ حق اپنے فیصلے سے کسی قسم کا جبر وارد نہیں کرتی۔ پہلے گروہ نے نورِ ہدایت قبول کرنے سے کھلا انکار کر دیا تھا اور انہوں نے تعصب کا پردہ ڈال کر اسلام کی حقانیت کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہم نے بھی انہی کے حسبِ خواہش اور حسبِ عمل انھیں نورِ بصارت سے محروم کر دیا۔ یعنی انہیں توفیقِ ہدایت سے دور کر دیا۔ لیکن یہ گروہ کبھی مفادات کی خاطر اور کبھی عظمتِ اسلام سے مرعوب ہو کر' الغرض کچھ نہ کچھ اور کبھی نہ کبھی تو اسلام کے قریب آتا ہی ہے۔ ہر چند کہ پھر خطرات سے گھبرا کر دور چلا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے اسلام کی خاطر جس حد تک اپنے دیدہ و گوش کھول رکھے ہیں۔ ہماری حکمت و مشیت کا یہ تقاضا نہیں کہ اسے ان سے بھی محروم کر دیا جائے۔ یہ بیان باری تعالیٰ کے عدل و انصاف اور انسانی اعمال میں اس کی آزادی اور اختیار پر کھلی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید برآں اس میں حق کی دعوت دینے والوں کو یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ جس حد تک اور جس حال میں بھی حق کے قریب آنا چاہیں انہیں اس سے نہ روکا جائے۔ ممکن ہے اسلام اور حق سے قرب کے باعث ان کی

مفاد پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی میں بدل جائے اور وہ منافقت سے تائب ہو کر بالآخر سچے مسلمان بن جائیں۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مفادات کے پیش نظر حق کے قریب آرہے ہیں۔ درست نہیں انہیں دور کر دینا درحقیقت ان کے لیے حق کو صدقِ دل سے قبول کرنے کے امکانات کو معدوم کر دینا ہے۔

قدیر قدرت سے ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ قدیر کے معنی اصطلاح شرع میں "**الفاعل لما شاء علی قدر ما تقتضی الحکمۃ" لا زائدا علیہ ولا ناقصا عنہ**" (المفردات) (اس کام کا کرنے والا جسے وہ چاہے اسی قدر جو حکمت کا تقاضا ہے۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم) کے آتے ہیں۔ لہٰذا خدا کے قادر مطلق ہونے کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ایسے کام اس کی قدرت کی طرف منسوب کیے جائیں جو اس کی حکمت اور مشیئت کے خلاف ہوں۔ کیوں کہ قدرتِ الٰہی کے تصور میں اس کی "حکمت و مشیئت" بھی شامل ہیں۔ پس شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کا یہ مفہوم ہے کہ "وہ ذات ہر وہ کام کرسکتی ہے جو وہ چاہے۔ یعنی جو اس کی مشیئت کو مطلوب ہو۔ اور اس حد تک کرسکتی ہے جس حد تک اس کی حکمت کا تقاضا ہو" اس معاملے میں وہ نہ محتاج ہے اور نہ عاجز و کمزور۔ لیکن جو امور اور افعال اس کی شانِ الوہیت اور مشیئت و حکمت کے منافی ہوں ان کا کرنا نہ وہ چاہتی ہے اور نہ اس کی حکمت کا مقتضیٰ ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے حوالے سے اس کی قدرتِ مطلقہ کا بیان کرنا قطعاً نامناسب بلکہ اس کے قدیر ہونے کے خلاف ہے۔

آیات ۸ تا ۲۰ میں مسلسل منافقین کی علامات کا بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ان کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے:۔

۱۔ دعوئ ایمان صرف زبانی حد کرنا اور باطن کا اس کی تصدیق سے خالی ہونا۔

۲۔ محض توحید و آخرت پر ایمان کو کافی سمجھنا اور رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان اس قدر ضروری نہ سمجھنا۔

۳۔ دھوکہ دہی اور مکر و فریب کی نفسیات۔

(i) یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہماری حالتِ نفاق سے بے خبر ہیں۔

نیز یہ سمجھنا کہ ہم اپنی مکاریوں' حیلہ سازیوں اور چالاکیوں سے دوسروں کو فریب دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

۴۔ قلب و باطن کا بیمار ہونا۔

۵۔ جھوٹ بولنا۔

۶۔ نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی۔ یعنی مفسدانہ طرزِ عمل کے باوجود خود کو صالح اور مصلح سمجھنا۔

۷۔ دوسروں کو بے وقوف اور صرف خود کو اہلِ عقل و دانش سمجھنا۔

۸۔ امتِ مسلمہ کی اکثریت کو گمراہ تصور کرنا۔

۹۔ اجماعِ امت یا سوادِ اعظم کی پروا نہ کرنا۔

۱۰۔ کردار کا دوغلہ پن اور ظاہر و باطن کا تضاد۔

۱۱۔ اہلِ حق کے خلاف مخفی سازشیں اور تخریبی منصوبے تیار کرنا۔

۱۲۔ اہلِ حق کے استہزاء کی نفسیات۔

۱۳۔ مسلمانوں پر طنز' طعنہ زنی اور ان کی تحقیر و تمسخر کے درپے ہونا۔

۱۴۔ باطل کو حق پر ترجیح دینا۔

۱۵۔ سچائی کو روشن دیکھتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں بند کر لینا۔

۱۶۔ تنگ نظری' تعصب اور عناد میں اس حد تک پہنچ جانا کہ کان' حق نہ سن سکیں زبان' حق کہہ نہ سکے اور آنکھیں' حق دیکھ نہ سکیں۔

۱۷۔ اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرانا اور ان سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا۔

۱۸۔ اہلِ حق کی کامیابیوں پر دنگ رہ جانا اور ان پر حسد کرنا۔

۱۹۔ مفاد پرستانہ طرزِ عمل۔ یعنی مفادات کے حصول کیلئے اہلِ حق کا ساتھ دینا اور خطرات و مصائب میں قربانی سے گریز کرتے ہوئے ان سے علیحدہ ہو جانا۔

۲۰۔ حق کے معاملے میں نیم دلی اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہنا۔

یہ قرآن مجید کا وہ پہلا چارٹر (CHARTER) ہے جہاں منافقت کی علامات کو واضح طور پر گنوایا گیا ہے ہم نے انہیں تفصیل اور نظم و ضبط کے ساتھ اس لیے قلمبند کر

دیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے باقاعدہ طور پر ہر شخص اپنے احوال اور معاملات کا جائزہ لے سکے اور ان کی روشنی میں اپنی اصلاح کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان اور اسلام میں کامل اخلاص عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم

آیت ۲۳: وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا

۱۵ ۔ عبدیّت محمدی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کا علوّ مرتبت

اس مقام پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبدیت کاملہ کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باری تعالیٰ کا عبدنا کے کلمات سے یاد فرمانا اپنے اندر ایک نرالی شان رکھتا ہے' عام طور پر لوگ اس کی حکمت [illegible] ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلق باللہ میں دو شانیں حاصل ہیں' عبدیت اور رسالت۔ جیسا کہ عبدہ ورسولہ سے ظاہر ہے۔ عبدیت میں بندگی کی شان کا غلبہ ہے اور رسالت میں پیغمبری کا۔ عبدیت میں توجہ الی اللہ ہے اور رسالت میں توجہ الی الخلق' عبد' مخلوق سے کنارہ کش ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قرب و وصال کی طرف جاتا ہے اور رسول' بارگاہ ایزدی سے ہدایت لے کر مخلوق کے اصلاحِ احوال کے لئے آتا ہے۔ عبدیت میں عروج ہے اور رسالت میں نزول' شبِ معراج حضورِ الٰہی میں جانے اور فیض پانے کے لئے اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ اور فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ فرمایا گیا مگر مخلوق کی طرف بعثت کے لئے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ اور بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا ارشاد فرمایا گیا۔ اس لئے جب قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبدنا یا عبدہ کہا جاتا ہے تو اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عروجی تعلق کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور آپ کی ذات باری تعالیٰ سے حصولِ فیض کی نسبت بھی اجاگر کی جا رہی ہوتی ہے۔

عبد اور عبدیت سے مراد کیا ہے؟

اس جگہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر نبوت اور رسالت کے

اوصاف سے کرنے کی بجائے عبدنا کہہ کر عبدیت کے وصف سے کیا گیا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ان کے بیان سے قبل عبد کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ عبد کسی خاص نوع کی یعنی بشری یا نوری مخلوق وغیرہ کا نام نہیں بلکہ عبد مطلقاً" بندے کو کہتے ہیں اور عبدیت کا معنی بندگی کیا جاتا ہے' اسی سے عبادت بھی ہے لہذا ہر وہ شے جو اپنے حسبِ حال باری تعالیٰ کی عبادت کرے یعنی اس کی بندگی میں ہو عبد کہلاتی ہے خواہ وہ زمینی مخلوق ہو یا آسمانی' بشری ہو یا نوری' نباتات ہوں یا حیوانات' ملائکہ ہوں یا جنات' الغرض کائنات ارض و سما کی تمام مخلوقات باری تعالیٰ کے لئے عبد کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ وہ ذات اکیلی معبود ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ عبد ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا: **اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔** (جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب رحمان کے حضور عبد کی حیثیت سے ہی پیش ہوں گے۔ سورہ مریم : ۹۳)' اسی طرح جو لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے ان کے زعم باطل کو رد کرتے ہوئے کہا گیا: **وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔** (اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کی' وہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ (فرشتے اس کے) برگزیدہ بندے ہیں۔ (الانبیاء ۲۶) کیونکہ کائنات ہستی کی ہرشے اپنے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت کرتی ہے اور اس کی بندگی میں مگن ہے اس لئے ہر قسم کی مخلوق کو عبد کہا جاتا ہے۔ فی الواقع کسی کو عبد کہنے کا مقصد اس سے الوہیت اور معبودیت کی نفی اور اس کے مخلوق ہونے کا اثبات ہوتا ہے تاکہ یہ متحقق ہو جائے کہ یہ ہستی خود خالق کائنات کی عبادت اور بندگی کرنے والی ہے دوسروں کی عبادت کی مستحق نہیں۔ اس لفظ سے نہ کسی کی بشریت یا نورانیت ثابت ہوتی ہے اور نہ اس کی نفی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے بربنائے جہالت ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متنازع فیہ بنا کر ایسی آیات کو جہاں حضور علیہ السلام کی عبدیت مذکور تھی' اپنے مناظرانہ معتقدات کی تائید میں پیش کیا ہے جس سے نہ صرف عبدیت کا مفہوم اور اس کی رفعت و عظمت نظر انداز ہو گئی ہے بلکہ اس سے لفظ کا معنوی حسن بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

بندہ اور مملوک کی بناء پر عبد غلام کو بھی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے عبد کی تین قسمیں ہیں:

○ عبد آبق ------ جو غلام اپنے مالک کی غلامی اور اطاعت سے بھاگ گیا ہے۔

○ عبد رقیق ------ جو غلام بدستور اپنے مالک کی ملک اور غلامی و اطاعت میں ہو۔

○ عبد ماذون ------ جو غلام اپنے مالک کی اطاعت و بندگی کے ذریعے اس کی نظروں میں اس قدر عزیز اور محبوب ہو چکا ہو کہ وہ اسے اپنا اذن سپرد کر کے یعنی اپنا مختار و نمائندہ بنا لے کہ جو کچھ یہ کہے یا کرے گا وہ میرا ہی حکم یا فعل تصور کیا جائے گا۔ اس درجے میں خود عبد کو تصرف اور شفاعت وغیرہ کا اختیار و اذن سپرد کر دیا جاتا ہے۔

مشرکین اور کفار و منافقین پہلی قسم کی عبدیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام اہل ایمان دوسرے قسم کی عبدیت سے' جب کہ انبیاء و رسل اور اولیاء و صالحین حسب مراتب تیسری قسم کی عبدیت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہر ایک کو اس کی بندگی اور قرب کے مطابق درجۂ ماذونیت عطا کرتا ہے۔ یہ عبدیت اس مقام سے عبارت ہے جہاں طالب خود ذات حق کا مطلوب بن جاتا ہے جسے اقبال نے یوں واضح کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لہٰذا بشریت و نورانیت کی تمام ذاتی فضیلتیں مقام عبدیت پر آ کر معدوم ہو جاتی ہیں' اس کی فضیلت تمام اوصاف کی فضیلت سے بلند و بالا ہوتی ہے کیونکہ اس عبد کو درحقیقت بارگاہِ ایزدی میں ایسا مقامِ محبوبیت نصیب ہو جاتا ہے جو مرید کو مراد میں اور محب کو محبوب میں بدل دیتا ہے۔ اس مقامِ محبوبیت کے بھی دو درجے ہیں ایک ادنیٰ دوسرا اعلیٰ۔ عبدیت (ماذونیت) کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ کمالِ بندگی کے باعث خود محبوب خدا بن جائے جیسا کہ اوپر مذکور ہے لیکن اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ یہ محبوبیت کی اس حد تک جائے کہ اس کی غلامی بھی دوسروں کو محبوبیت سے نوازنے لگے۔ اب اس مقام پر نہ صرف وہ بندہ خود محبوب خدا ہوتا ہے بلکہ جو کوئی اس کی غلامی اور اطاعت اختیار کرتا ہے وہ بھی محبوبِ خدا بن جاتا

ہے۔ یہ عبد ایسا باکمال ہوتا ہے کہ جو کوئی صدق دل سے اس کے دامن سے وابستہ ہو جائے اسے بھی کمال محبوبیت سے سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ یہ درجہ کمال عبدیت کی انتہا ہے اور اس کی سزا وار ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی مقدس عبدیت ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا گیا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔ آل عمران: ۳۱)۔ مراتبِ عبدیت کے اس فرق کو اقبال یوں واضح کرتا ہے۔

عبد دیگر عبدہ' چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر

عبد اور عبدیت کا مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اب اس امر کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ آیت متذکرہ میں محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وصفِ عبدیت سے کیوں یاد کیا گیا' اس کے دو سبب ہیں:

۱۔ اثباتِ توحید
۲۔ اظہار شرف محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضور علیہ السلام کو عبد سے موسوم کرنے کا سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ نبوت و رسالت کے اعلیٰ و ارفع مقامات اور بلند ترین روحانی کمالات و تصرفات کا حامل ہونے کے باوجود آپ کی ذات اقدس معبود نہیں بلکہ عبد ہی ہے۔ جب مخلوقات کی تمام عظمتوں کے منتہائے کمال پر فائز ہونے والا انسان بھی خدا کا بندہ ہے اور خود پرستش کا مستحق نہیں تو اس کے سوا کسی اور مخلوق کو یہ مرتبہ کیونکر دیا جا سکتا ہے؟۔ یہ بیان کفار و مشرکین کے عقیدۂ شرک کا رد تھا کہ تم اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو معبود سمجھتے ہو (جن کا ذکر آگے اس آیت میں آ رہا ہے) اور ان کے سامنے جبینِ بندگی جھکاتے ہو حالانکہ وہ تو کسی لحاظ سے بھی کسی عظمت کے حامل نہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ ہستی اور وہ پیکرِ نبوّت و رسالت جس کی عظمت و بلندی کی دہلیز پر کائنات خلق کی تمام

عظمتیں قربان ہو سکتی ہیں، جب وہ معبودِ حقیقی کا عبد ہے تو کسی اور کی طرف شرفِ معبودیت کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا سبب خود شرف و تکریم محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اظہار ہے۔ کیونکہ عبدیت، قرب الٰہی کا وہ بلند ترین مقام ہے جہاں بندہ اپنے تعینات کو معدوم پا کر جلوۂ معبود میں محو ہو جاتا ہے اور ساری انسانی فضیلتیں اسی کے باعث متحقق ہوتی ہیں اس لئے باری تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبینا یا رسولنا کی بجائے عبدنا کے لقب سے یاد کیا۔ مزید برآں نبوت و رسالت چونکہ خلق خدا کی ہدایت کے لئے واقع ہوتی ہے اس لئے اس کی جہت "توجہ الی الخلق" ہوتی ہے۔ یعنی اس کا سفر خالق سے مخلوق کی طرف ہوتا ہے اور عبدیت تکمیل ذات کے لئے ہوتی ہے اس لئے اس کی جہت "توجہ الی اللہ" ہوتی ہے، یعنی اس کا سفر مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا ہے۔ پھر یہی مرتبۂ عبدیت ہر کمال اور فضیلت کی بنیاد بھی ہے، درجۂ نبوت بھی اسی سے ثابت ہوتا ہے اور درجۂ رسالت بھی اسی سے۔ اس لحاظ سے عبدیت جوہر کا درجہ رکھتی ہے اور نبوت و رسالت سب اس کی صفات ہیں۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے تعلق ذاتی کے بیان اور منتہائے قرب کے اظہار کے لئے حضور علیہ السلام کو عبدنا "اپنے بندے" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ یہ لفظ اجمال ہے اور اس کی تفصیل ان آیات میں بیان فرمائی گئی ہے: **وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى**۔ (اور وہ خاک آپ نے نہیں پھینکی جو آپ نے پھینکی تھی بلکہ وہ تو اللہ نے پھینکی تھی --- انفال: ۱۷) **إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ**۔ (بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ الفتح: ۱۰) **مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ**۔ (اور جو کوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وہی اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ النساء: ۸۰) **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى**۔ (اور وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتے بلکہ جو کچھ بھی بولتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے جو ان پر کی جاتی ہے۔ النجم: ۳،۴)

مستزادیہ کہ جب لوگوں نے ایک مرتبہ حضور علیہ السلام سے پہلے اپنے قربانی کر لی تو باری تعالیٰ نے اسے قبول نہ فرمایا اور حکم دیا: لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (تم اپنی قربانیوں اور دیگر اعمال میں اللہ اور اس کے رسول سے پہل نہ کیا کرو۔ الحجرات : ۱)' حالانکہ کسی عمل یا قربانی میں اللہ سے پہل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب احکام دراصل جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارگاہِ ایزدی میں اس انتہائی قرب کی نشاندہی کر رہے ہیں جس مقام پر عبد مقرب' اپنے تعینات ذاتی کو معدوم کر کے جلوۂ معبود میں یوں محو ہو جاتا ہے کہ اپنے پرائے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ یہاں عبدنا کہہ کر اسی تعلق خاص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہاں وصفِ نبوت کا ذکر بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا ذکر بھی ہے اوہ وہ مما نزلنا کے الفاظ میں ہے' یعنی جو ہم نے نازل فرمایا اپنے بندے پر"۔ یہی نبوت ہے جو عبدنا کو ملی ہے۔

آیت ۲۳: وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

۱۶ - من دون اللہ کا مفہوم اور شانِ انبیاء و اولیاء کا امتیاز

"مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کوئی مخصوص قرآنی اصطلاح نہیں ہے۔ جیساکہ کم فہمی کی بناء پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ دون کا مادہ دان ہے۔ دان یدون دونا میں کمزوری' حقارت' خساست' پستی اور گھٹیا پن کا معنی پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ "صار دونا ای خسیسا" کہ وہ دون یعنی گھٹیا ہو گیا۔ صاحب المنجد نے دون کا معنی "الخسیس الحقیر السافل" کیا ہے۔ دنو' دنیٔ اور دنیا کے الفاظ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ ان میں بھی گھٹیا پن' پستی اور حقارت وخساست کا مفہوم موجود ہے۔ جو شخص اپنی کمزوری کے باعث کسی کام کے کرنے سے بھی عاجز و قاصر ہو اسے بھی دون کہا جاتا ہے (یقال للقاصر عن الشئی دون) (المفردات) اگر کوئی چیز کسی کے مقابلے میں تھوڑی' کم' حقیر اور ہلکی ہو تو اسے بھی دون کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا۔ (وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ) (جو گناہ اس سے کم اور ہلکا ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیتا ہے) عام طور پر اس لفظ کا استعمال "غیر" کے معنی میں ہوتا ہے

قرآن مجید میں اکثر و بیشتر "من دون اللہ" یا "من دونہ" کے الفاظ کفار و مشرکین کے شرک کی نفی اور ابطال کے ضمن میں ان کے معبودانِ باطلہ کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے نہ صرف ان کا غیرِ خدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ ان کی اصل حیثیت یعنی بے مائیگی بھی متعین ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کے غیرِ خدا ہونے سے ان کی الوہیت اور قابلِ پرستش ہونے کا رد بھی ہو جاتا ہے۔ اور دان یدون کے اصل معنیٰ کی بناء پر ان کا پست و حقیر ہونا' ان کا گھٹیا اور عاجز و کمزور ہونا ان کا کم مایہ بلکہ بے مایہ ہونا اور بارگاہِ خداوندی میں ان کا بے حیثیت ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اس سے ان کے مشرکانہ معتقدات اور توہمات کا قلع قمع یوں مقصود ہے کہ "اے کفار تمہارے جھوٹے معبود اس قدر بے حیثیت ہیں کہ وہ تمہارے لیے کسی قسم کے نفع و نقصان کا باعث نہیں ہو سکتے" لہٰذا قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی من دون اللہ یا اس کے مماثل الفاظ کا ذکر ہو۔ وہاں چند امور بنیادی طور پر پیش نظر رکھنا ہوں گے۔

۱۔ اس کلام کے سیاق و سباق میں کفار و مشرکین یا ان کے باطل عقائد و نظریات کا ذکر ہو گا۔ اس طرح کسی نہ کسی صورت میں ان کی تردید اور تغلیط مقصود ہو گی۔

۲۔ ان الفاظ کے ذریعے عام طور پر ان کے معبودانِ باطل یعنی ان بتوں کی نشاندہی مقصود ہو گی۔ جنہیں وہ خدا کا شریک ٹھہرا کر مستحقِ عبادت سمجھتے ہیں۔

۳۔ ان الفاظ کے ذریعے ان معبودانِ باطل کی ذاتِ حق سے مطلقاً بے تعلقی اور ان کی الوہیت کی نفی مقصود ہو گی۔

۴۔ من دون اللہ جیسے الفاظ کے ذریعے ان معبودانِ باطل کی بے بسی' بے حیثیتی اور بے وقعتی ظاہر کرنا مقصود ہو گی تاکہ کفار و مشرکین اس حقیقت پر متنبہ ہو کر اپنے مزعومہ مشرکانہ خیالات سے باز آ سکیں اور انہیں عبادت کے لائق نہ سمجھیں۔

۵۔ اس کلام کے مخاطب مورد و اطلاق کے اعتبار سے اہلِ ایمان نہ ہوں گے۔ لہٰذا نہ تو من دونِ اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء و رسل ہونگے اور نہ ہی صلحاء و اولیاء جنہیں بارگاہ ایزدی میں شرفِ مقبولیت اور مقامِ قرب و محبوبیت سے نوازا گیا ہے۔ کیونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں اس ڈھب پر نہیں کیا جاتا۔ اور نہ اہلِ ایمان انہیں خدا کا شریک یا اپنا معبود سمجھتے رہے ہیں۔ اگر کسی جگہ عیسائیوں کے ضمن میں حضرت عیسیٰ

علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے حوالے سے ایسی بات کہی گئی ہے تو وہ بھی صرف اس بناء پر کہ انہوں نے دونوں کو خدا اور خدا کا بیٹا تصور کر کے واضح شرک کیا تھا اور ان سے الوہیت منسوب کرلی تھی۔ جس پر سوالیہ انداز میں اس بات کا ذکر کیا گیا۔ "ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰـهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (کیا تو نے ان (مشرک) لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو)۔ جس کا جواب نفی میں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں بھی عیسائیوں کے مزعومہ مشرکانہ عقائد کی تردید اور خدا کے سوا ہر ایک سے الوہیت کی نفی مقصود ہے۔

۶۔ کبھی من دونِ اللّٰہ یا من دونہٖ کے الفاظ کے ذریعے کفار کے معبودان باطل کے ولی اور شفیع ہونے کا انکار بھی مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً "لَیْسَ لَهُمْ مِنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ" اس کلام کا اشارہ بھی منکرین و مشرکین اور ان کے جھوٹے معبودوں کی طرف ہے۔ کیونکہ اہلِ ایمان کیلئے تو ولایت بھی ثابت ہے اور شفاعت بھی اور خود قرآن کی رو سے انبیاء و صلحاء مؤمنین کے ولی بھی ہیں اور شفیع بھی۔ بلکہ ایمان داروں کو صرف انہی پر اعتماد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خود ارشاد باری تعالیٰ ہے" اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ" اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہونگے مگر پرہیزگار۔ "اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (تمہارا مددگار تو صرف اللہ اور اللہ کا رسول (ﷺ) ہے اور ایمان والے ہیں)۔ "اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ" (اس کے اولیاء تو صرف پرہیزگار ہی ہیں) (الانفال: ۳۴)

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یا مِنْ دُوْنِهٖ جیسے الفاظ اپنے معنیٰ و مفہوم کے لحاظ سے تو عام ہیں اور ان کا معنیٰ بھی غیرِ خدا ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں غیرِ خدا کا مفہوم اپنے اندر یہ واضح اشارہ رکھتا ہے کہ وہ ذات غیرِ خدا ہے جو خدا سے دور لے جانے والی ہو۔ خدا سے انکار اور کفر و شرک کا باعث ہو۔ اور خدا کی بارگاہ میں کسی بھی رتبے یا درجے کی حامل نہ ہو بلکہ عند اللہ محض بے حیثیت اور بے عزت ہو۔ جہاں تک مومنین کاملین اور خدا کے مقبول و برگزیدہ بندوں کا تعلق ہے وہ بارگاہِ ایزدی میں مقرب اور محبوب ہونے کی بناء پر خدا کے اپنے تصور کیے جاتے ہیں، غیر نہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔ "اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ" (الصّٰفّٰت: ۸۱، ۱۱۱، ۱۳۲) (بیشک وہ تو ہمارے مومن بندوں میں سے ہے) باری تعالیٰ مومنوں کو تو غیر سمجھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک

غیروہی ہیں جو ان سے دور ہیں۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا۔ "یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ" (الانفال: ۶۴) (اے نبی! آپ کو اللہ اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین کافی ہیں)۔ یہاں بھی باری تعالیٰ نے مومنین کو محض اپنا تصور کرتے ہوئے اپنے ساتھ ملا کر نبی اکرم ﷺ کو ان پر اعتماد کی تلقین فرمائی ہے اور اس طرح اپنی بارگاہ میں ان کی حیثیت اور قدر و منزلت کو واضح کیا ہے۔ کیونکہ انبیاء و رسل اور مومنین خدا کی بارگاہ میں باعزت اور باحیثیت تصور کیے جاتے ہیں بے عزت اور بے حیثیت نہیں۔ جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ" (المنافقون ۶۳: ۸)۔ (اور عزت تو صرف اللہ کیلئے ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مومنین کیلئے) یہاں بھی رسول علیہ السلام اور مومنین کو اپنے حلقے میں شمار کر کے انہیں "مِنْ دُوْنِهٖ" یعنی اپنے غیروں کے زمرے سے نکال لیا ہے۔ اس امر کو کمال صراحت کے ساتھ ایک اور مقام پر یوں واضح کیا گیا ہے۔ "وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً" (التوبہ: ۱۶) (اور جنہوں نے سوائے اللہ کے، رسول کے اور مومنین کے کسی کو ولی (دوست) نہ بنایا)۔ یہاں باری تعالیٰ نے دو ٹوک لفظوں میں رسول کو اور مومنین کو "من دون اللہ" یعنی اللہ کے غیر کے زمرے سے خارج فرمادیا ہے۔ کیونکہ باری تعالیٰ کے نزدیک اس کا غیر نہ اس کا رسول ہے اور نہ اس کے مومنین کاملین۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے ماسوا کو اپنا ماسوا اور ان کے غیر کو اپنا غیر تصور کرتا ہے۔ ان کے دوست کو اپنا دوست اور ان کے دشمن کو اپنا دشمن کرتا ہے۔ جس طرح وہ غرباء کے صدقات کو اپنے لیے قرض حسن قرار دیتا ہے۔ دین کی خدمت کو اپنے لیے مدد قرار دیتا ہے۔ اعمال میں حضور علیہ السلام سے پہل کرنے کو اپنی ذات سے پہل قرار دیتا ہے۔ مومنین کی راہ کی پیروی کو اپنی راہِ ہدایت قرار دیتا ہے۔ رسول کے ہاتھ پر بیعت کو اپنی بیعت قرار دیتا ہے۔ رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دیتا ہے۔ رسول کے قول کو اپنا قول اور اس کے عمل کو اپنا عمل قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ رسول اور اس کے جانثار مومنین کو "حزب اللہ" اور ان کے غیر کو من دون اللہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا من دون اللہ جیسے الفاظ باری تعالیٰ سے جس غیریت کا بیان کرتے ہیں وہ لغوی کلامی اور لفظی نہیں بلکہ حکمی، مرادی اور معنوی

غیریت ہے۔ یعنی خدا کے غیر سے مراد وہی ہے جو پیمانۂ محبت کے اعتبار سے غیر ہو اور بے نسبتی و بے تعلقی کے لحاظ سے پرایا ہو۔ ورنہ انبیاء وصالحین کو نگاہِ ربوبیت میں جو اپنائیت حاصل ہوتی ہے اسے نظرانداز کرتے ہوئے ان پر بھی من دون اللہ کی غیریت کا اطلاق کرنا قرآنی تعلیمات کے ساتھ صریح ناانصافی اور خود ربِّ ذوالجلال کے ارشادات کا کھلا انکار ہے۔ ہم نے یہاں من دونِ اللہ کے مفہوم کے ضمن میں چند بنیادی باتیں قدرے تفصیل سے اس لیے عرض کردی ہیں۔ کیونکہ کچھ لوگ ناسمجھی میں جہاں کہیں "مِنْ دُوْنِ اللہ" کے الفاظ آتے ہیں اور پھر جو کچھ وہاں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق بلا استثنٰی انبیاء ورسل اور اولیاء وصلحاء پر بھی کردیتے ہیں۔ جس سے قرآنی احکام کے بیان کی توجہ نہ صرف اصل مرکز سے ہٹ جاتی ہے بلکہ خدا کے محبوب اور مقرب بندوں کی تنقیصِ شان بھی واقع ہوتی ہے۔ جو نہ اسلام کو گوارا ہے اور نہ خود ذاتِ باری کو۔ لہٰذا قرآنی الفاظ کا عموم ہو یا خصوص۔ ان کے استعمال کا قرآنی اصول اور اسلوب بھی ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے اگر یہ بات نظرانداز ہوگئی تو تفسیرِ قرآن ہی سے گمراہی کے ہزاروں راستے پیدا ہونے لگیں گے۔ خوارج کا طریق بھی یہی تھا کہ اصل مدعا کو سمجھے بغیر الفاظ کے ظاہری عموم کی بناء پر قرآنی حکم کا ہر جگہ اطلاق کرتے تھے۔ خواہ وہ اطلاق قطعاً غیر موزوں اور غلط ہی کیوں نہ ہوتا۔ خوارج کے بارے میں منقول ہے۔ **کان ابن عمر** رضی اللہ عنہ **یراھم شرار خلق اللّٰہ و قال انھم انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المومنین**" (البخاری، ۲: ۱۰۲۴۔ باب قتال الخوارج و الملحدین) (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ان خارجیوں کو مخلوقِ خدا کا بدترین طبقہ تصور کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ وہ آیات نکال لیتے ہیں جو کفار کے حق میں نازل ہوئیں اور انہیں مومنوں پر چسپاں کرتے ہیں)۔ اس لیے آیات اور الفاظ قرآنی کا اصل مورد و محل جانے بغیر انہیں اس طرح بے باکی کے ساتھ ہر جگہ استعمال کرنا بذاتِ خود گمراہی ہے۔ اور قرآن کے ہر طالب علم کا اس گمراہی سے بچنا ضروری ہے۔

آیت: ۲۵ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ۔

۱۷۔ جنتی ثمرات اور ظاہری و حقیقی مماثلت میں فرق

جَنّٰتٌ جَنَّۃٌ کی جمع ہے جو جَنَّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کا مخفی رکھنا ہے۔ جنت اس باغ کو بھی کہتے ہیں جس کے درختوں نے زمین کو ڈھانپ لیا ہو اور وہ دکھائی نہ دیتی ہو۔ جن اور اس کی جمع جنّات میں بھی یہی معنی پایا جاتا ہے کہ وہ دکھائی نہیں دیتے جنّت کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اسے انسان کے حواسِ ظاہری سے مخفی رکھا گیا ہے۔ اس اخفاء کا اشارہ خود قرآنِ مجید میں یوں موجود ہے۔ **"فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ"** (السجدہ: ۱۷) (کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی اخروی نعمت مخفی رکھی گئی ہے)۔ اس امر کی وضاحت ایک حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے **"قال اللّٰہ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر"** (البخاری) (باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے آخرت میں وہ کچھ تیار کر رکھا ہے۔ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ اس کا تصور کسی بشر کے دل پر گزرا) بعض لوگوں نے عالمِ آخرت میں جنت کے باقاعدہ خارجی وجود کا انکار کیا ہے۔ بلکہ جنت کی تمام نعمتوں کو صرف ذہنی سکون' قلبی آسودگی اور راحت کی مختلف صورتوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تصور غلط اور قرآن و سنت کے صریح احکامات کے خلاف ہے۔ قرآنِ مجید نے یہاں جنت کے باغات اور ان کے نیچے رواں نہروں کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پھر ان باغات کے پھلوں کا تذکرہ کیا ہے اور ایک دوسرے سے یا دنیوی پھلوں سے ان کی محض ظاہری مشابہت بیان کی ہے۔ جس سے یہ امر مترشح ہو جاتا ہے کہ جنت کی ان نعمتوں کا علیحدہ خارجی وجود ہو گا پھر وہاں پاکیزہ ازواج کا ذکر ہے کہ ان کی رفاقت اور زوجیت بھی اخروی نعمتوں میں سے ایک ہو گی اور آخر میں اس جنت کی

ابدی رہائش اور اس کی نعمتوں سے دائمی تمتع کا ذکر ہے۔ حالانکہ دنیا کی کوئی بھی راحت اور سکون بطور قاعدہ کلیہ ہیشگی اور دوام پر مبنی تصور نہیں ہو سکتی۔ نہ خود دنیا کو دوام واستمرار حاصل ہے اور نہ اس کی راحتوں کو۔ یہ تمام امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان وعمل آخرت میں فی الواقع ان انعامات الٰہیہ سے نوازے جائیں گے۔ جہاں تک ان کی اصل ماہیت کا تعلق ہے۔ اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔ "**لا یشبه شئی مما فی الجنة**" **ما فی الدنیا الا فی الاسماء**" (ابن کثیر) جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی شے سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں)۔

جنتی ثمرات اور ان کے تشابہ کی حقیقت۔

یہاں جنت کے رزق اور اس کے پھلوں کی متعدد خصوصیات میں سے ایک کا ذکر کیا گیا ہے "وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا" (اور انہیں صورت میں ملتا جلتا پھل دیا گیا ہوگا)۔ اس تشابہ اور مماثلت کے دو مصداق ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنت کے تمام پھل دیکھنے میں ملتے جلتے ہونگے اور ان کی یہ ظاہری مماثلت باہمی ہوگی۔ جب کبھی جنتیوں کو کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ شکل میں مماثلت کے باعث اسے پہلے کھائے ہوئے پھلوں میں سے شمار کریں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہے جسے ہم پہلے کھا چکے ہیں۔ کیونکہ شکل وصورت اور رنگ میں سارے ایک دوسرے کے مماثل ہونگے لیکن ہر ایک کا ذائقہ، خوشبو اور لطف جدا جدا ہوگا۔ ہر پھل اس اعتبار سے انفرادیت اور نئی لذت کا حامل ہوگا۔ اس مفہوم کو اکثر علماء ومفسرین نے اپنایا ہے۔ صاحب جلالین لکھتے ہیں "**یشبه بعضه بعضا لونا و یختلف طعما**" ائمہ تفسیر لکھتے ہیں۔ "**الثمار فی الجنة**" **متشابهة فی اللون او فی الصورة مختلفة**" **فی الطعم فاذا رزقوا ثمرة بعد اخری ظنوا انها الاولی**" (جنت میں پھل رنگ اور صورت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مماثل ہونگے لیکن ذائقے کے لحاظ سے قطعی مختلف۔ جب اہلِ جنت کو ایک کے بعد دوسرا پھل دیا جائے گا تو وہ اسی ظاہری مشابہت کی بناء پر کہیں گے کہ یہ تو وہی پہلا پھل ہے جو ہم کھا چکے ہیں) ابنِ عباس، مجاہد، ربیع، حسن بصری، قتادہ اور متعدد تابعین رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔

دوسرے یہ کہ جنت کے پھل نام یا ظاہری صورت میں دنیا کے پھلوں کے مماثل ہونگے۔ جب اہلِ جنت کو جنتی پھل اور میوے کھانے کیلئے پیش کیے جائیں گے تو دنیوی پھلوں اور میووں سے ظاہری مشابہت کی بناء پر کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو ہم پہلے یعنی دنیا میں کھا چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مشابہت محض ظاہری ہوگی ورنہ دنیا کے پھلوں کی کوئی نسبت بھی ان پھلوں سے نہ ہوگی۔ اس مفہوم کی تائید تابعین میں سے محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں اور آئمہ تفسیر نے بھی اس کو بیان کیا ہے (بغوی، خازن، نسفی، مظہری رحمھم اللہ وغیرہ)

بہرحال دونوں مصداق درست ہیں اور آیت کریمہ میں **"وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا"** کے الفاظ دنیا اور جنت دونوں کے ثمرات کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اکثر مترجمینِ قرآن نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اس کا اطلاق جنتی پھلوں یا دنیوی پھلوں، دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ظاہری مشابہت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ قرآن کے الفاظ اپنے معنی کو کسی بھی ایک مشابہت تک محدود نہیں کر رہے۔ اگر ترجمہ میں اسی معنوی وسعت کا لحاظ نہ رکھا جائے جو الفاظِ قرآنی میں پائی جاتی ہے تو حسنِ کلام باقی نہیں رہتا۔ میری نظر سے حضرت مولانا احمد رضا خاں کا ترجمہ گزرا ہے۔ جنہوں نے اس جگہ قرآنی الفاظ کی معنوی عمومیت اور وسعت کو برقرار رکھا ہے۔ بیشک یہ فہم اور بصیرت باری تعالیٰ کی عطا ہے۔ ورنہ انسان اپنے تئیں ہر جگہ ایسا اہتمام نہیں کر سکتا۔

یہاں چونکہ اہلِ ایمان و عمل کے اجر کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ انہیں جنت میں پھلوں کا رزق دیا جانا اور ان کا یہ سمجھنا کہ یہ تو ہمیں بھی مل چکا ہے، درحقیقت باطنی ثمرات اور روحانی احوال و کیفیات کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی دنیا میں صادر کیے جانے والے نیک اعمال اور اطاعات و عبادات کی جزاء عالمِ آخرت کے ایسے روحانی ثمرات کی صورت میں متمثل ہو کر مومنین کے سامنے آئے جیسے باطنی معانی و مطالب یا نفسانی اور روحانی کیفیات خواب میں مناسب اشکال کی صورت میں متمثل کر کے دکھائی جاتی ہیں۔ جس سے اہلِ نظر اپنے احوالِ باطنی کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ایمان و عمل میں اخلاص اور کمال کے حامل لوگوں کو جب ان کے اعمالِ صالحہ جنت میں اُخروی ثمرات اور لذات کی صورت میں دکھائی دیں گے تو ان

کا اصلی مناسبت کا ادراک اتنا کامل ہو گا کہ وہ دنیوی معارف اور اخروی ثمرات کو ایک جان کر یہ کہہ دیں گے کہ ہم تو یہ سب کچھ پہلے بھی پا چکے ہیں۔ حالانکہ اعمالِ صالحہ کی وہ لذات و ثمرات اور معارف و برکات جو انہیں دنیا میں "فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً" کے وعدہ الٰہی کے تحت میسر آئی ہوگی۔ ان کی کوئی نسبت ان اخروی ثمرات ولذات سے نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ انسانوں پر انعامات الٰہیہ کے نقطۂ کمال کا وقت ہو گا۔ دونوں میں ظاہری مشابہت ضرور ہوگی تاکہ یہ نیکوکار اور اطاعت گزار بندے عمل اور اس کی جزاء کے باہمی تعلق اور علاقے کو پہچان سکیں۔ ورنہ دونوں میں بے حساب فرق ہو گا۔ جس سے دنیا پر آخرت کی فوقیت آشکار ہو رہی ہوگی۔

ظاہری مماثلت، حقیقی مماثلت کی دلیل نہیں ہوتی۔

یہاں جس مفہوم کو بھی قبول کیا جائے ایک اصول بہرصورت واضح ہو گیا کہ دو مختلف اشیاء میں رنگ و بو اور شکل وصورت کی ظاہری مماثلت، ان میں حقیقی اور کلی مماثلت یا وحدت کی دلیل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی دونوں کو محض اس بناء پر ایک یا ایک جیسا قرار دیا جاسکتا ہے۔ اہلِ جنت بھی پھلوں کی ظاہری مشابہت کے باعث یہ سمجھیں گے کہ یہ وہی پھل ہے۔ حالانکہ قرآن نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ وہی پہلے والا پھل نہ ہو گا بلکہ صرف ظاہراً اس سے ملتا جلتا ہو گا اور ظاہراً کسی ایک کا دوسرے سے ملتا جلتا ہونا ان کے ایک یا ایک جیسا ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ قرآن شاہد ہے کہ کفار ومشرکین اور منکرین نبوت کا ہمیشہ یہی استدلال ہوا کرتا تھا کہ یہ افراد جو نبوت ورسالت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں، کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں "وَقَالُوْا مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا" (اور وہ کہنے لگے اس رسول کو کیا ہوا، کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کی طرف کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر ڈر سناتا)۔ گویا انبیاء ورسل کی زندگی کے ظاہری معمولات کو اپنی مانند دیکھ کر کفار نے ان کی نبوت کا ہی انکار کر دیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ نبی یا رسول ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے کسی پہلو کی کوئی مماثلت اور مشابہت عام انسانوں کی زندگی کے ساتھ نہ ہو۔ بلکہ اس کا رہن سہن اور اندازِ دعوت و تبلیغ مافوق البشری

صورت کا ہو۔ باری تعالیٰ نے اس وہمِ باطل کو رد کردیا کہ زندگی کے ظاہری معمولات میں ان مشابہتوں کی بناء پر ان کے کمالاتِ نبوت و رسالت کا انکار نہ کرو اور نہ انہیں کلیتًا اپنے جیسا تصور کرو بلکہ ایسی ظاہری مشابہت اور مماثلت کا پیدا کرنا حکمت الٰہیہ ہے اور خود تمہاری بہتری کا تقاضا ہے۔ ایک مقام پر اسی ضمن میں ارشاد فرمایا گیا "**لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ**"۔ (الانعام: ۹) (اگر ہم کسی فرشتے کو نبی بناتے' تو اسے بھی انسان یعنی مرد ہی بناتے اور پھر بھی ہم انہیں شبہ اور مغالطہ کا شکار کردیتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں) اور وہ شبہ یہ ہے کہ یہ افراد تو ہماری ہی مثل انسان ہیں اور ہماری طرح معمولاتِ زندگی رکھتے ہیں۔ یہ خدا کے فرستادہ نبی اور رسول کس طرح ہوسکتے ہیں؟ قرآنِ حکیم کی زیرِ مطالعہ آیت نے اسی حقیقت کو واضح کردیا کہ انسانوں کی ظاہر بیں نگاہیں' رنگ و بو' شکل و صورت یا چند ظاہری امور میں مماثلت اور مشابہت کو دیکھ کر دونوں کو ایک ہی سمجھ بیٹھتی ہیں اور امتیازی خصائص کا انکار کرنے لگتی ہیں۔ حالانکہ یہ مشابہت صرف ظاہری ہوتی ہے۔ حقیقت کی نہیں مولانا رومؒ فرماتے ہیں ع

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر' شِیر

آیت: ۲۶ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ●

۱۸۔ تمثیلی کلام کے رموز اور شانِ انبیاء و اولیاء کے ادراک میں کوتاہی

طریقہ تمثیل کی افادیت

یستحی۔۔ کا مادہ حی ہے جس سے حیاۃ (زندگی) ہے۔ حیاء بھی اسی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی بری باتوں سے رکنا اور ان کا ترک کرنا ہے۔ یہی معنی استحیاء کا ہے۔

یہاں "لا یستحی" بمعنی لا یخشی ' لایترک یا لایمتنع استعمال ہوا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ توضیحِ مدعا اور بیانِ حقیقت کیلئے اگر اللہ تعالیٰ مکھی، مکڑی، مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی شئ کی مثال دینا ضروری سمجھیں تو دے دیتے ہیں۔ وہ نہ کسی کم فہم کے اعتراض سے ڈرتے ہیں' نہ کسی کے انکار کے باعث اسے ترک فرماتے ہیں اور نہ کوئی اور امر ارادۂ الٰہی میں مانع ہوتا ہے۔

بعوضۃ ۔۔۔ بعض سے مشتق ہے۔ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں مچھر کا جسم نہایت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے "بعوضۃ" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں انتہائی درجہ کمزور چیز کی مثال مچھر سے دی جاتی ہے۔

قرآن مجید نے کئی مقامات پر کفار و مشرکین کے معبودان باطلہ کی بے بسی' عجز اور کمزوری کا بیان ایسی معمولی اور بے حیثیت چیزوں کی تمثیل سے کیا ہے۔ جس پر انہیں اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلامِ الٰہی ہے۔ جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلات دی گئی ہیں۔ اگر یہ کلامِ الٰہی ہوتا تو اس طرح کی گفتگو اس میں نہ ہوتی۔ باری تعالیٰ نے ان کی اسی سوچ کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ حق کی وضاحت کیلئے اگر مچھر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی مثال سے فائدہ ہوتا ہو تو ہم اسے بیان کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔ ایسی تمثیلات سے کلام کا تقدس یا عظمت متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ طریق فی نفسہٖ مفید اور اعلیٰ تفہیم کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے کلام کی بے ساختگی اور حقیقت پسندی ثابت ہوتی ہے۔ تصنع اور خود ساختہ پن کی نفی ہوتی ہے۔ اس لیے جہاں بھی کسی تمثیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قرآن نے اسے برمحل بیان کیا ہے۔ بلکہ یہ آیت فی الواقع طریقۂ تمثیل کی افادیت اور مشروعیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر صوفیاء کرام نے اپنی تعلیمات کو عام انسانوں کے ذہن نشین کرانے کیلئے تمثیلات کا انداز کثرت سے اپنایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو بات بعض اوقات کسی تمثیل یا تشبیہ کے ذریعے پوری طرح سمجھی جاسکتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

ایک ہی بیان سے ہدایت اور گمراہی دونوں کا امکان۔

جن لوگوں کے دل ودماغ انکار اور تعصب وعناد کے باعث مفلوج اور ناکارہ ہوچکے ہیں۔ انہیں حقیقت کی سچی جستجو ہی نہیں رہی۔ ان کی ظاہر بین نگاہیں صرف

ظاہری الفاظ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے بجائے وہ کلامِ الٰہی سے بھی غلط استدلال کرنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ خدا کے کلام کو بھی اپنی گمراہی کا باعث بنالیتے ہیں اور حق کا بیان سن کر یا پڑھ کر بھی بسا اوقات حق سے دور چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جنہیں قدرت نے بصیرت' نورِ باطن اور تلاشِ حق میں اخلاص کی دولت سے نوازا ہے۔ ان کو انہی تمثیلات اور ارشادات میں حکمت و دانائی کے جواہر نظر آتے ہیں۔ وہ بجائے الفاظ کے ظاہر پر اکتفا کرنے کے' ان کے باطن میں مخفی ہزاروں معارف و مطالب کو جان جاتے ہیں اور انہیں اسی کلام میں' جو کوتاہ نظروں کیلئے باعث مضحکہ تھا' باری تعالٰی کی معرفت کی راہیں دکھائی دیتی ہیں۔

عرفاء کے کلام پر طعن کی ممانعت۔

یہ آیت کریمہ اس امر کی واضح نشاندہی کرتی ہے کہ حق اور معرفت کا وجود' ہر شخص کی عقل و دانش اور اس کی بساط پر موقوف نہیں۔ اگر کوئی عارفانہ اور حکیمانہ بات' جو اہلِ حق سے صادر ہوئی ہو' ظاہری الفاظ کے باعث کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی تضحیک اور تمسخر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ فاسقوں اور بدبختوں کا شیوہ ہے۔ قرآن مجید کے مطابق ایسا مغالطہ تو ظاہر بینوں کو خود کلامِ الٰہی میں بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی کلام کی اصل افادیت اور معنویت و حکمت کا کسی شخص کی سمجھ میں نہ آنا' اس کلام کے ناقص اور لائقِ طعن ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس شخص کے اپنے فہم و دانش کا نقص ہے۔

حضور علیہ السلام کی تعلیمات میں بھی کئی پہلو ایسے تھے جو صرف خواص ہی سمجھ سکتے تھے عوام نہیں۔ کیونکہ وہ ان کے مکلف ہی نہ تھے۔ ہاں جہاں تک احکامِ شریعت کا تعلق ہے' جن کا ہر خاص و عام مکلف ہوتا ہے وہ ایسے واضح' صریح اور عام فہم انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ ہر شخص انہیں سمجھ جاتا ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ علومِ نبوت یا تعلیماتِ نبوی محض احکامِ شرعی ہی تک محصور نہ تھیں۔ وہ ان کے علاوہ بھی کئی اقسام کے علوم و معارف کا احصاء کرتی تھیں۔ لہٰذا ان تمام کا فہم ہر کس و ناکس کے لیے یکساں طور پر ضروری نہیں تھا۔ اس میں افراد کی ذہنی استعداد' علمی صلاحیت' صفائے باطن' تصفیہ قلب' قرب و صحبت نبوی ﷺ ' دینی منصب' الغرض کئی اعتبارات کا تفاوت پیش نظر ہوتا تھا۔ ہر شخص اپنی حیثیت اور ظرف کے لحاظ سے ان خصوصی معارف میں

سے حصہ پاتا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں "**حفظت من رسول اللّٰہ وعائین فاما احدھما فبثثتہ واما الآخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم**" (البخاری' ۱: ۲۳) (میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو طرح کے علوم سیکھے۔ پہلا علم تو وہ ہے جو میں نے تمہارے سامنے عام طور پر بیان کر دیا ہے اور جہاں تک دوسرے علم کا تعلق ہے اگر میں اسے برسرعام بیان کردوں تو یہ گلا کاٹ دیا جائے) شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ پہلا علم احکام واخلاق کا علم ہے اور دوسرا اسرار وغوامض کا جو اغیار کیلئے نا قابلِ ادراک ہے اور صرف اہلِ عرفان سے مختص ہے (لمعات شرح مشکوۃ) اسی امر کی وضاحت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ یوں فرماتے ہیں۔ "**العلم اللدنی الماخوذ من بطون القران ومن مشکوۃ صدر النبی علیہ السلام الذی لاسبیل الی درکہ الا الانعکاس واما درک درکہ فبعید عن القیاس**" (المظہری ا' : ۱۴۹) (وہ علم لدنی جو قرآن کے باطن اور سینہ نبوی ﷺ کے قندیل سے ماخوذ ہوتا ہے' سوائے توجہ اور انعکاس کے نہیں سمجھا جاسکتا' بلکہ جہاں تک اس کے فہم اور معرفت کا تعلق ہے وہ بھی خود عقل وقیاس کی پرواز سے ماورا ہے)۔ ملا علی قاریؒ عظیم محدث اور فقیہہ علا طیبیؒ کا قول نقل فرماتے ہیں۔ "کہ ایسے علوم ومعارف اور انکی غایت وحکمت کا جاننا عرفاء ہی کا راستہ ہے۔ یہ خدا اور انبیاء واولیاء کے درمیان راز ہے" (مرقاۃ المفاتیح ا' : ۲۵۲)

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا جس قدر ذاتِ باری سے تعلق پختہ اور قریبی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پر محبوبِ حقیقی جل مجدہٗ کے کلام کے اسی قدر زیادہ سے زیادہ اسرار وغوامض کھلتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ کسی کی گفتگو کی جو شناسائی اس کے دوستوں کو ہوتی ہے وہ اغیار اور بے تعلق لوگوں کو نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا کسی بات کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا در اصل اپنی غیریت اور لاتعلقی کا اظہار واعتراف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ راسخین کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ اسرار وغوامضِ قرآنی اور معارفِ شریعت صرف کتابوں کی ورق گردانی سے نصیب نہیں ہوتے بلکہ ذاتِ حق سے کامل تعلق عبدیت استوار کرنے اور اس کی محبت ومعرفت کی کٹھن منزلیں طے کرنے سے نصیب ہوتے ہیں اور یہ راستہ مکتب ومدرسہ میں تعلیم

و تعلم سے نہیں بلکہ اہلِ قلب و نظر کی بارگاہ کی دریوزہ گری سے میسر آتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرے اور عرفاء و صالحین اور مقبولانِ کاملین کے کلام پر زبانِ طعن دراز نہ کرے۔

گمراہوں کو قرآن سے بھی گمراہی میسّر آتی ہے۔

جو لوگ اپنی فکر و دانش کو حرفِ آخر اور عقلِ کل سمجھتے ہیں اور ہر بات کی صحت و عدمِ صحت یا حق و بطلان کا فیصلہ صرف اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ وہ بدنصیب قرآن پڑھ سن کر بھی قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن دانی صرف اپنے افکارِ ذہنی کی تائید اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تسکین سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا ظاہراً کثرت سے قرآن پڑھنا' ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے باطنی فسق اور ذہنی آمریت کے باعث قرآن کے اسی حکم سے جس سے اہلِ اطاعت ہدایت پاتے ہیں' گمراہی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہی کی نسبت یہاں ارشاد فرمایا گیا۔ "وَ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا" (اور وہ اسی سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے) "**وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ**" (اور اس سے انہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو (پہلے ہی) فاسق ہیں)۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ فسق' بعض اوقات' نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "**فان لہ اصحابا یحقر احدکم صلوٰتہ مع صلوٰتھم وصیامہ مع صیامھم یقرؤن القران لا یجاوز تراقیھم یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیہ**" (البخاری ۲: ۱۰۲۴' مشکوٰۃ المصابیح ۲: ۵۲۶۔۵۲۷ باب فی المعجزات) (بیشک اس کے ساتھی ایسے ہونگے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم میں سے ہر شخص اپنی نمازوں کو حقیر اور قلیل جانے گا۔ جن کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانے گا۔ وہ قرآن (کثرت سے) پڑھیں گے مگر ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہونگے جیسے تیر کمان سے)۔ ایک مقام پر انہی لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا "**السنتھم احلی من السکر وقلوبھم قلوب الذئاب**" (ترمذی' ۲: ۶۳)۔ (ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہونگی مگر ان کے دل' بھیڑیوں کے ہونگے)

قرآن سے غلط استدلال کر کے گمراہ ہونے والے علماء کی بھی نشاندہی نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی "**عن حذیفہ ابن الیمان** رضی اللہ عنہ **قال قال رسول اللہ** ﷺ **ان مما اتخوف علیکم رجل قراء القران حتی اذا روبت بھجتہ علیہ و کان رداء ہ الاسلام' اعتراہ الی ماشاء اللہ انسلخ منہ ونبذہ وراء ظھرہ وسعی علی جارہ بالسیف ورماہ بالشرک قال قلت یانبی اللہ ایھما اولی بالشرک المرمی او الرامی قال بل الرامی**" (تفسیر ابن کثیر' ۲: ۲۶۵ مطبوعہ مصر)۔ (حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جن امور کا خدشہ ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہو گا جو قرآن بہت پڑھے گا۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور پر سیراب ہو گا۔ اسکا اوڑھنا بچھونا بھی اسلام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے کسی عیب (یعنی زعم) میں مبتلا کر دے گا کہ قرآنی اثرات اس سے جدا ہو جائیں گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پس پشت ڈال کر اپنے معاشرے میں قرب وجوار کے مسلمان لوگوں کو مشرک قرار دے گا اور ان کے قتل کے درپے ہو گا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ یارسول اللہ ﷺ ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک کون ہو گا۔ مشرک کہنے والا یا وہ جس کو مشرک کہا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ دوسروں کو مشرک کہنے والا خود مشرک ہو گا)۔ یہ حدیث مسند امام ابو یعلیٰؒ میں روایت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ' امام یحییٰ بن معینؒ اور دیگر آئمہ و محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوگیا کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے کے باوجود قرآن سے غلط استدلال کر کے امت محمدی ﷺ کو گمراہ اور مشرک ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ یہی سوچ ان کی اپنی گمراہی ہوگی۔ کیونکہ باطن میں فسق ہو اور سینہ ودل انوارِ معارف قرآنی سے خالی ہوں تو قرآن کا مطالعہ بھی ایسے بد نصیبوں کیلئے گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی حفظ وامان میں رکھیں۔ آمین

یُضِلُّ بِہٖ سے کیا مراد ہے؟

یہاں ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ باری تعالیٰ نے بعض لوگوں کو گمراہ کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ لوگوں کو (معاذ اللہ) گمراہ بھی کرتا ہے۔

اگر ایسی بات ہے تو پھر گمراہ شخص کی اپنی ذمہ داری کیا ہو گی؟

اس مسئلے پر ہم آیت (۶' ۷) کے تحت پہلے ہی کچھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ہماری درج ذیل دو کتب کا مطالعہ نہایت مفید ہو گا:۔

۱۔ ایمان بالقدر

۲۔ ISLAM AND FREEDOM OF HUMAN WILL

یہاں **یضل** کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اضلال مصدر سے ہے۔ اس کا معنی عام طور پر "گمراہ کرنا" ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال اس طرح بھی ہوتا ہے۔ مثلا **اضللتہ** (میں نے اسے گمراہ پایا اور گمراہ قرار دیا)۔ امام راغب اصفہانیؒ "صاحب المفردات" اسی مفہوم کی تائید میں یہ فقرہ لائے ہیں کہ اگر کسی کا اونٹ گم ہو جائے تو وہ کہتا ہے --- "**اضللت البعیر**" (میرا اونٹ گم ہوگیا)۔ چنانچہ لغتِ عرب اور احادیث میں **اضللتہ** کا استعمال **احمدتہ** (میں نے اسے محمود یعنی قابل تعریف پایا) اور **ابخلتہ** (میں نے اسے بخیل پایا) کی طرز پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ "**ان النبی ﷺ اتی قوما فاضلھم**" (بیشک نبی اکرم ﷺ جس قوم میں تشریف لائے اسے گمراہ پایا) یہاں **فاضلھم** کا لفظ **یضل** ہی کا ہم معنیٰ ہے۔ اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ (معاذ اللہ) حضور علیہ السلام نے اس قوم کو گمراہ کردیا۔ حضور علیہ السلام تو آئے ہی گمراہ قوم کو ہدایت سے بہرہ ور کرنے کے لئے تھے۔

لہٰذا **اضل یضل** کا استعمال یہاں کسی کو گمراہی کی حالت میں پانا یا کسی کو گمراہ قرار دینا کے معنیٰ میں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا یہ معنی کیا ہے کہ "اللہ اسی کے باعث بہت سے لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے"۔

کسی کو گمراہ کرنے اور اسے گمراہ ٹھہرانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گمراہ کرنا دشمنی اور عداوت کی بات ہے۔ لیکن کسی کو گمراہ ٹھہرانا اس کی حقیقی ہمدردی اور بہتری کی بات ہے۔ یعنی کسی شخص کو اس کی اس گمراہی پر آگاہ کرنا ہے۔ جس کا شاید پہلے اسے شعور تک نہ ہو۔ اور اگر وہ اپنے فسق' ذاتی عناد اور بدبختی کے باعث پہلے ہی گمراہ ہو چکا ہے تو اسے اس کی گمراہی میں چھوڑ دینا بھی اضل یضل کے زمرے میں آتا ہے۔

لہٰذا دونوں صورتوں میں قرآن مجید یا کسی اور کلامِ حق سے گمراہی پانا' فاسقوں

اور بد بختوں کی اپنی ذمہ داری اور ان کا اپنا اکتساب ہے۔ اس کا الزام باری تعالیٰ کو نہیں دیا جاسکتا۔

فاسقین کا معنی۔

یہاں اس امر کی مزید صراحت کردی گئی کہ اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کو گمراہ ٹھہراتے یا قرار دیتے ہیں جو فاسق ہیں۔ **فَاسِقٌ۔ فِسْقٌ** سے ہے۔ جس کا معنی **"الخروج عن حجر الشرع"** (شریعت کی روک اور حد سے نکل جانا) کے ہیں۔

لغت کے اعتبار سے فسق ہر چھوٹے بڑے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر گناہ، شریعت کی خلاف ورزی ہے اور اس کے ارتکاب سے انسان شریعت کی روک اور حد کو پھلانگ جاتا ہے۔ اس لیے امام قرطبیؒ نے اس کا شرعی مفہوم بھی یہی بیان کیا ہے۔ **"الخروج من طاعۃ اللہ"** (اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے نکل جانا)۔ لیکن عرفِ عام میں فسق، کثرت گناہ پر بولا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص شریعت کی خلاف ورزی پر عملاً اصرار کرتا ہے اور احکامِ دین کی حدود کو بے دریغ توڑتا ہے۔ اسے فاسق کہا جائے گا۔

بنا بریں کسی پر فسق کے لفظ کا اطلاق بھی تب ہی ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی بڑی اعتقادی یا عملی گمراہی میں مبتلا ہو چکا ہو۔ لہٰذا کسی کو فاسق کہنا اس کے گمراہ، نافرمان اور سرکش ہونے کا باضابطہ اعلان ہے۔

اس لیے **"وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ"** کے الفاظ خود اس حقیقت کا انکشاف کر رہے ہیں کہ خدا کی ذات کسی کو گمراہ نہیں کرتی بلکہ احکامِ دین کی خلاف ورزی اور ہدایتِ الٰہیہ سے انحراف کی بناء پر کچھ لوگ خود ہی گمراہی اور سرکشی و نافرمانی کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے اوپر محرومی و بد بختی کو مسلّط کرلیتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو قرآن کے ذریعے گمراہ ٹھہراتا ہے اور انھیں ان کے حسبِ منشاء انہی کی خریدی ہوئی گمراہی میں رہنے دیتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی پسند اور مرضی سے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا ہوتا ہے۔ جیساکہ ارشاد فرمایا گیا۔ **"اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی۔"** (البقرہ، ۱۶) (یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی)۔

زیرِ مطالعہ حصۂ آیت مذکورہ بالا مفہوم کی تائید کا دوسرا قرینہ ہے۔

آیت ۲۸: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝

۱۹۔ انسانی سفر کے مراحل اور حیاتِ برزخی کا ثبوت۔

اس آیتِ کریمہ میں ذاتِ باری تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت پر ایک شاندار استدلال قائم کیا گیا ہے۔ وہ ہے "انسان کا حالتِ عدم سے حالتِ وجود کی طرف منتقل ہونا" منکرینِ حق کے نقطۂ نظر کو سوالیہ انداز میں رد کیا جا رہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کا کس طرح انکار کرتے ہو۔ جب کہ اس کی ہستی پر اتنی بڑی دلیل روشن آفتاب کی مانند تمہارے سامنے ہے۔ تم عدمِ محض تھے مگر تمہیں خلعتِ وجود سے نوازا گیا۔ "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" (الدہر:۱) (بیشک انسان پر اس عرصہ کائنات میں ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا) "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ" کے الفاظ پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ 'کیا نیستی سے ہست ہو جانا کسی صاحبِ قدرت کی خلاقیت کے بغیر ممکن ہے؟ یہاں انسان کی حالتِ عدم کو پہلی موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور موجودہ زندگی کو حیاتِ اولیٰ سے۔ مفہومِ کلام یہ ہے کہ ہم نے موت میں سے حیات کو تخلیق کیا اگر تمہیں ہماری قدرت و خلاقیت کے اس مظاہرے پر اب بھی شک ہے تو ہم تمہیں ایک اور نظارہ حیات میں سے موت تخلیق کر کے دکھاتے ہیں "ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ" سے مراد ہر شخص کی موت اور اس کے بعد قبر کی برزخی زندگی ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ ہر شخص طبعی یا حادثاتی طور پر موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی انسان کسی بھی طریقے اور بہانے سے اپنے آپ کو اس حالت سے نہیں بچا سکتا۔ اگر خدا کی ذات نظامِ کائنات کی خالق و مالک نہیں ہے تو بتاؤ پھر اتنے بڑے آفاقی اور دائمی نظامِ موت و حیات کو کون چلا رہا ہے؟ اب اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لو کہ جس طرح تمہیں پہلی حالتِ موت سے نکال کر حیاتِ دنیوی سے آشنا کیا گیا تھا۔ اسی طرح تمہیں اس موت کے بعد فوراً عالمِ برزخ میں ایک نئی حیات سے آشنا کیا جائے گا اور انعقادِ قیامت تک تم یہی برزخی زندگی بسر کرو گے۔ اور

"ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" کا معنی یہ ہے کہ انجامِ کار قیامت کے دن' موت وحیات کے سب مراحل سے گزر کر' تمہیں پھر بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہونا ہو گا۔ جہاں سے حیاتِ اُخروی کا آغاز ہو گا۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر انسان کے حوالے سے دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر صراحتاً موجود ہے۔ اہلِ جہنم کہیں گے۔ "رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَھَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ" (المومن: ۱۱) (اے ہمارے رب! تونے ہمیں دوبار موت کی حالت سے گزارا اور دوبار زندگی سے۔ پس ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا۔ کیا اب ہمارے لیے عذابِ جہنم سے بچنے کا کوئی راستہ ہے) اس آیت کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بطریقِ امام سفیان ثوریؒ منقول ہے کہ یہ آیت بھی سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم بیان کرتی ہے اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کا مضمون بھی وہی ہے جو سورہ المومن کی آیت نمبر ۱۱ میں بیان ہوا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر' ۱: ۶۷)

آیت مذکورہ کا حیاتِ برزخی پر استدلال۔

جو موت انسانوں پر موجودہ زندگی میں طاری ہوتی ہے اس موت سے لے کر قیامت تک کا سارا درمیانی عرصہ "عالمِ برزخ" ہے۔ لہٰذا ہر شخص دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قیامت کے انعقاد تک عالمِ برزخ میں رہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" (المومنون: ۱۰۰) (اور ان کی موت کے بعد قیامت کے دن تک' عالمِ برزخ ہے) "برزخ" کے معنی عربی ادب میں پردے کے کیے جاتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے "وَجَعَلَ بَیْنَھُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا" (الفرقان: ۵۳) (اور ان کے درمیان پردہ اور رکاوٹ کے طور پر آڑ کو حائل کردیا) مرنے کے بعد قیامت تک کے زمانے کو برزخ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم گویا پس پردہ ہے کسی کو نظر نہیں آتا اور یہ عالم مرنے والوں کے لئے ایک رکاوٹ بھی بن جاتا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ واپس اپنی سابقہ زندگی میں نہیں لوٹ سکتے۔ بعض لوگ قرآن وحدیث سے انکار یا جہالت کی بناء پر بعد از مرگ زندگی کے قائل نہیں ہیں اور وہ حیاتِ برزخی کا کھلا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ اسے ماننا عذابِ قبر پر ایمان کی بنیادی شرط ہے۔

اس کے بغیر عذابِ قبر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ زیرِ مطالعہ آیت میں "ثُمَّ يُحْيِيكُمْ" کے الفاظ بعد از مرگ، برزخی زندگی پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد پھر "ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" کے ذریعے قیامت کے دن حساب وکتاب کے لئے اٹھنے کا بیان ہے۔
یہ آیت فی الحقیقت انسانی زندگی کے پانچ مراحل اور چار عوالم بیان کر رہی ہے:۔

۱۔ عالمِ ارواح (جب انسان کو وجود عنصری نصیب نہ ہوا تھا)

یہ دور باپ کی صلب اور ماں کے رحم میں جسمانی تشکیل سے پہلے تک قائم رہتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا پہلا مرحلہ ہے۔

۲۔ عالمِ شہادت (جب انسان کو حیات عنصری سے آشنا کر دیا گیا)

یہ دور ہر انسان کی دنیوی زندگی کے اختتام تک قائم رہتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا دوسرا مرحلہ ہے۔

۳۔ عالمِ برزخ (موت سے شروع ہو کر انعقاد قیامت تک قائم رہے گا)

یہاں انسانی زندگی کا تیسرا مرحلہ اس "حالت موت" کا ہے جو اس کا رشتہ عالم شہادت کی زندگی سے توڑ کر عالم برزخ کی زندگی سے جوڑتی ہے اور چوتھا مرحلہ خود "حیات برزخی" کا ہے جو ہر انسان کی دنیوی زندگی کا فوری نتیجہ ہے اور عالم آخرت کی جزاو سزا، نتائج وثمرات اور احوال وعلامات کا آئینہ دار بھی ہے۔

۴۔ عالمِ آخرت (اس کا آغاز روزِ قیامت سے ہوگا)

روز محشر کا حساب وکتاب اور اس کے نتیجے میں جنت وجہنم کی ابدی زندگی اسی عالم کے عنوانات ہیں۔ انسان کا سفرِ حیات اس آخری اور پانچویں مرحلے پر اختتام پذیر ہوگا۔
قرآن مجید نے بعد از مرگ، قیامت سے پہلے بھی عذاب وثواب کی کئی صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہی ذکر حیات برزخی کا قرآنی ثبوت ہے۔ آل فرعون کے ضمن میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ○ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ" (المومن ۴۵:۔۴۶) (آل فرعون کو سخت ترین عذاب نے گھیر لیا۔ وہ ایک آگ ہے جس میں صبح وشام جلائے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی۔ اس دن بھی حکم ہوگا کہ انہیں

انتہائی شدید عذاب میں داخل کر دو) وہ عذابِ نار جس میں آلِ فرعون ہزاروں سال سے صبح و شام مبتلا ہیں اور انعقاد قیامت تک مبتلا رہیں گے۔ عذابِ قبر ہی ہے جو حیاتِ برزخی سے عبارت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس حکمِ قرآنی کی تصریح نبی اکرم ﷺ کی اس حدیثِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے آپ نے فرمایا۔ "ہر مرنے والے پر اس کا مقامِ آخرت، قیامت کے دن تک صبح و شام پیش کیا جاتا ہے۔ جنتی پر جنت کا اور جہنمی پر جہنم کا"۔ (بخاری و مسلم)

امام قرطبیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"الجمهور على ان هذا العرض يكون فى البرزخ وهذا حجة فى تثبيت عذاب القبر" (فتح الباری لامام ابن حجر عسقلانیؒ ۵: ۷۰۳)

(جمہور علماء کا مذہب ہے کہ اس آیت میں آگ پر پیشی سے مراد عالم برزخ کی پیشی ہے۔ اور یہ آیت عذاب قبر کے ثبوت میں حجت ہے)

اس آیت کی مزید تحقیق تفسیر کبیر لامام فخر الدین رازیؒ (۷: ۳۱۷)۔ عینی (۴: ۲۲۲)۔ قسطلانی (۴: ۳۷۷)۔ نول کشور۔ کتاب الروح لابن قیم (۱۲۰) پر ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر منافقین کیلئے ارشاد فرمایا گیا۔ **"سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ"** (التوبہ: ۱۰۱) (ہم عنقریب انہیں دو بار عذاب دیں گے۔ پھر انہیں (آخرت کے) عذابِ عظیم کی طرف لوٹایا جائیگا) طبرانیؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حکمِ الٰہی سے کئی منافقین کو چن چن کر بے نقاب کیا اور ان کے نام لے لے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ یہ واقعہ ان کے لیے سخت ذلت و رسوائی کا باعث ہوا۔ اس پر عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ **"فهذا العذاب الاول حين اخرجهم من المسجد والعذاب الثانى عذاب القبر"** تفسیر ابن کثیر ۲: ۳۸۴، عمدۃ القاری ۴: ۲۲۱، فتح الباری ۵: ۷۰۳ (یہ منافقین کیلئے پہلا عذاب تھا جب انہیں ذلت و رسوائی کے ساتھ مسجد نبوی سے نکالا گیا اور دوسرا عذاب، عذاب قبر ہے)۔

مذکورہ بالا آیات میں "حیاتِ برزخی" پر استدلال عذابِ قبر کے حوالے سے تھا۔ اب ثواب قبر کے حوالے سے بھی حیات برزخی پر استدلال ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے۔ **"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ**

فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" (آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰) (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے انہیں ہرگز مردہ گمان نہ کرنا' وہ یقیناً زندہ ہیں۔ انہیں اپنے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے اور وہ ان بے پایاں انعامات پر خوش ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائے ہیں اور وہ اپنے ان پچھلے متعلقین کو دنیا میں بے خوف و خطر اور پر سکون دیکھ کر خوشیاں مناتے ہیں جو ابھی ان تک نہیں پہنچے) اس آیت میں حیاتِ برزخی مراد لینے کی دو وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والے اور دیگر مرنے والے دنیوی زندگی سے تو محروم ہو گئے اور اخروی زندگی بھی بلا امتیاز ہر ایک کو حاصل ہو گی۔ اس میں شہید یا غیر شہید کا اصلاً کوئی فرق نہیں ہو گا۔ شہداء کی جس حیات کا اس مقام پر بصراحت ذکر کیا گیا ہے وہ یقیناً برزخی زندگی ہی ہے کیونکہ دارِ آخرت کا ابھی آغاز نہیں ہوا اور برزخی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا قرینہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کے خوشیاں منانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے ساتھیوں کو دنیا میں بے خوف و خطر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس جگہ اگر عالمِ آخرت کی زندگی مراد ہوتی تو "یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ" (جو ابھی تک ان سے آکر نہیں ملے' ان کی وجہ سے خوشیاں مناتے ہیں) کے بیان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انعقادِ آخرت کے بعد کسی کے پیچھے دنیا میں رہ جانے کا تصور ہی باطل ہے۔ اس دن تو ہر کوئی اخروی زندگی اور اس کے احوال و نتائج میں سے گزر رہا ہو گا۔ واضح ہوا کہ یہاں برزخی زندگی کا ہی ذکر ہے۔ جب کہ شہداء شہادت کے بعد عالمِ برزخ میں پہنچ چکے ہیں اور ان کے باقی ساتھی پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں۔ اب شہداء ان کے نیک احوال و اعمال پر مطمئن اور خوش ہو رہے ہیں۔ زندگی کا ثبوت بھی دو طرح فراہم کیا گیا ہے۔ ایک انہیں مردہ کہنے سے منع کر کے، صریحاً زندہ کہہ کر اور یہ کہہ کر کہ انہیں باقاعدہ رزق دیا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں دوسرے ان کی خوشیوں کا ذکر کر کے۔ کیونکہ خوشی اور غم دونوں احساسات و تاثرات میں سے ہیں۔ اسی احساس اور تاثر کے باقی رہنے کا نام حیات ہے اور اس کے زائل ہو جانے کا نام موت۔ اگر وہ حیات سے آشنا نہ ہوں تو

نہ ان کیلئے کسی قسم کا احساس اور علم ممکن ہے اور نہ ان کا کوئی تاثر واقع ہو سکتا ہے۔

ہم نے صرف قرآنی استدلال کے چند پہلوؤں پر اکتفا کیا ہے ورنہ ان کے علاوہ کئی آیات میں اور بیشمار احادیثِ صحیحہ میں حیاتِ برزخی کا مضمون بڑی تفصیل سے درج ہے۔

ایک مغالطے کا ازالہ۔

اس زندگی اور اس کے عذاب وثواب کے لئے ضروری نہیں کہ معروف معنوں میں قبر ہی ہو۔ کوئی شخص سمندر میں ڈوب کر ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی آگ میں جل جاتا ہے اور اسی طرح کوئی کسی اور طریقے سے بظاہر ختم ہو جاتا ہے اسے زمینی قبر میں دفن کیے جانے کا موقع ہی میسر نہیں آتا۔ لہذا اندریں صورت کسی قسم کے شبہ اور مغالطہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ حقیقی قبر' ہر شخص کیلئے عالم برزخ ہے۔ جیسے کہ پہلے قرآنی آیت سے ثابت ہو چکا ہے جو شخص جس حال میں مرگیا اس کے مرنے کے بعد ہر ایک کو یکساں طور پر برزخی زندگی نصیب ہو جاتی ہے اور اس کا حساب وکتاب یا عذاب وثواب برزخی زندگی پر مترتب ہوتا ہے۔ اس کے لئے زمینی قبر کا ہونا شرط نہیں۔

موت وحیات کا معنیٰ۔

امام راغب اصفہانیؒ نے المفردات میں "حیات" کے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔ لیکن فی الواقع حیات تین صفات سے عبارت ہے:۔

۱۔ قوت نامیہ۔ اگر کسی چیز میں نشو ونما پانے کی قوت پیدا ہو جائے تو اسے زندہ کہا جائے گا۔ مثلاً نباتات اور اگر وہ چیز صفت نمو سے خالی ہو تو وہ مردہ کہلائے گی مثلاً جمادات۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا" (الحدید: ۱۷) (بیشک اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی عطا کرتا ہے)۔ "وَاَحْیَیْنَا بِہٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا" (ق: ۱۱) (اور ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی عطا کی) اور "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ" (الانبیاء: ۳۰) (اور ہم نے ہر زندہ چیز کو ابتداءً پانی میں سے تخلیق کیا)۔ اس لحاظ سے (Organic Substance) کو زندہ اور (Inorganic Substance) کو مردہ کہا جائے گا۔

۲۔ قوتِ حاسہ۔ اگر کسی چیز میں حس اور ادراک کی قوت ہو۔ یعنی وہ کسی شے کو محسوس اور معلوم کر سکے تو اس کی یہ خوبی حیات کے وجود پر دلالت کرے گی اور اگر اس میں کسی چیز کو بھی محسوس کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو یہ حالت اس کی موت کی نشاندہی کرے گی۔ مثلاً حیوانات' قوت حاسہ کے باعث زندہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "**وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ**" (فاطر: ۲۲) (زندہ اور مردہ' دونوں برابر نہیں ہو سکتے) اسی بناء پر عالمِ آخرت کو عالمِ حیات تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں افراد کو مکمل طور پر احساس و ادراک کی صفت حاصل ہو گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "**وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ**" (العنکبوت: ۶۴) (اور بے شک آخرت کا گھر حقیقی زندگی ہے)۔ علماءِ متکلمین نے حیات کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ "جس صفت کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے' اسے حیات کہتے ہیں"۔ (روح المعانی پ ۲۹ ص ۴-۵) علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں "**الحیوۃ ما یصح بوجودہ الاحساس والموت ضدہ**"۔ (تفسیر مدارک' جلد ۴ ص ۲۰۶) (حیات وہ صفت ہے جس کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے اور موت اس کی ضد ہے)۔ اس تعریف کو امام جلال الدینؒ یوں بیان کرتے ہیں۔ "**الحیوۃ وهی ما به الاحساس الموت ضدها او عدمه**" (جلالین ص ۴۶۴) (حیات وہ صفت ہے جس کے باعث احساس موجود ہو اور موت اس کی ضد ہے یا اس احساس کا فقدان) لہٰذا حیات فی الحقیقت ایسی صفت ہے جو احساس و ادراک' علم و قدرت اور سمع و بصر کا سبب ہوتی ہے اور موت اس صفت کے فقدان کا نام ہے۔

قوتِ عاقلہ و عاملہ:۔ اگر کسی چیز میں عقل و فہم یعنی شعور اور قوتِ عمل پائی جائے تو اسے زندہ کہیں گے' ورنہ مردہ۔ گویا حیات' شعور اور عمل کے موجود ہونے کا نام ہے اور اس کا فقدان موت ہے۔ جن علماء نے موت کو "روح کا جسم سے جدا ہونا" قرار دیا ہے۔ ان کا مدعا بھی یہی ہے کیونکہ روح کا بدن میں پایا جانا صفتِ حیات کی دلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ روح اور بدن کے تعلق سے مذکورہ بالا خواص و صفات ظاہر ہوتے ہیں اور اس تعلق کے کٹ جانے سے ظاہر نہیں ہوتے۔ تو یہ موت و حیات کی علامتی یا دلالتی تعریف ہے حقیقی نہیں۔ کیونکہ مطلقاً نہ روح اور بدن کے تعلق کو حیات کہتے ہیں اور نہ مجرّداً روح کے بدن سے نکل جانے کو موت کہتے ہیں۔ موت و حیات کا وجود ان دونوں

صورتوں کے علاوہ بھی ثابت ہے۔

فیضِ رسالت مآب ﷺ سے موت کا حیات میں بدل جانا۔

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ منبر بننے سے پہلے کھجور کے ایک خشک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر بن گیا تو آپ ؐ اس تنے کو چھوڑ کر منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ وہ خشک لکڑی کا تنا حضور ﷺ کے فراق اور جدائی کے غم میں اس طرح رویا جیسے کسی اونٹنی کا بچہ گم ہو جائے اور وہ دردناک آواز سے روئے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ "**فلما وضع له المنبر سمعنا للجذع مثل اصوات العشار حتی نزل النبی ﷺ فوضع یده علیه**"۔ (بخاری '۱: ۱۲۵) (جب حضور ﷺ کیلئے منبر رکھا گیا (اور آپ کھجور کے تنے کو چھوڑ کر منبر پر تشریف فرما ہوئے تو ہم نے اس لکڑی کی ایسی دردناک آواز سنی جیسے اولاد گم کردہ اونٹنیوں کی آواز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ حضور علیہ السلام منبر سے اترے اور اس پر اپنا دست شفقت رکھ دیا) پھر وہ سسکیاں لیتا لیتا خاموش ہو گیا۔ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ کرام ؓ نے فرمایا۔ "کھجور کا وہ خشک تنا ایسی دردناک آواز سے رویا جسے سن کر قریب تھا کہ ہمارے جگر پھٹ جاتے۔ یہاں معجزۂ نبویؐ کا یہی پہلو مذکور ہے کہ ایک بے جان خشک جسم میں بغیر روح کے حیات پیدا ہو گئی اور اس میں احساس و ادراک کا وجود بدرجہ اتم ثابت ہو گیا۔ لہٰذا حیات فی نفسہ روح اور بدن کے تعلق کا نام نہیں بلکہ کسی جسم میں احساس و ادراک کی صفت کے پائے جانے کا نام ہے۔ یہ صفتِ حاسہ و عاقلہ (احساس کرنے والی اور سمجھنے والی) پائی جائے تو بغیر روح کے بھی زندگی ممکن ہے اور اگر یہ صفت موجود نہ ہو تو روح کے ہوتے ہوئے بھی کیفیت موت وارد ہو سکتی ہے۔

انسانی زندگی کا حیاتیاتی پہلو۔

زیر مطالعہ آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ بعض آئمہ کا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے عدد کا حصر مقصود نہیں۔ یعنی دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں مراد نہیں کیونکہ احادیث میں اس سے زیادہ مرتبہ موت و حیات کا تکرار بھی ثابت ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت انسانی زندگی کے حیاتیاتی پہلو (Biological Aspect) پر

روشنی ڈالتی ہے اور اس بیان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا غیر نامی مادے (Inorganic Matter) سے ہوئی۔ "کنتم امواتا" کی وضاحت اس آیت میں کی گئی ہے۔ **"هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ"** (المومن : ٦٧) (وہی ہے جس نے تمہیں بے جان مٹی (غیر نامی مادے) سے پیدا کیا) یہ انسان کی حالتِ موت کا ذکر ہے۔ ابتداءً زمین محض غیر نامی مادہ تھا۔ جس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ پھر اسے بارش کے پانی کے ذریعے صفتِ نمو یعنی حیات دی گئی۔ یہ خلق انسانی کے ارتقاء میں دوسرا مرحلہ تھا۔ ارشاد فرمایا گیا۔ **"وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا"** (النحل : ٦٥) (اور اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی عطا کی) اور ادھر انسان کی تخلیق کے ضمن میں فرمایا گیا۔ **"وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا"** (الفرقان : ۵۴) (اور وہی ہے جس نے پانی سے آدمی کو تخلیق کیا)۔ یہ حقیقت **"فَاَحْيَاكُمْ"** کے حصہ آیت کی تفسیر بیان کر رہی ہے۔ الغرض زمین پر انسانی تخلیق (Human Creation) اور اس کے کیمیائی وحیاتیاتی ارتقاء (Chemical and Biological Evolution) کے احوال کو متعدد بار موت وحیات کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ باری تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ **"تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَیِّ"** (آل عمران : ٢٧) (اے اللہ! تو ہی موت سے حیات کو اور حیات سے موت کو تخلیق کرتا ہے)۔ رحم مادر میں بھی انسان انہی ارتقائی منازل کو طے کرتا ہے۔ **"ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا"** (المومن : ٦٧) (بے جان مادے سے تخلیق کرنے کے بعد۔ پھر وہ تمہیں تولیدی پانی کی بوند سے تخلیق کرتا ہے پھر رحم مادر میں معلق وجود کے مرحلے سے گزارتا ہے پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتا ہے) اس جگہ (Pattren Of Production) یعنی انسان کی تخلیق ثانی کا انداز بیان کیا جا رہا ہے اور یہی ارتقائی انداز انسانی زندگی کے اختتام کا بھی ہوگا۔ یہاں اس پورے نظامِ حیات کو باری تعالیٰ نے اپنی ہستی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ کیونکہ مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔ **"كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ"** تم جانتے ہو کہ تمہارا رب تمہیں موت وحیات، عدم ووجود، نمو وغیر نمو اور حرکت وسکون کے بیشمار مراحل سے گزارتا ہے اور اسی طویل ارتقائی سفر کے بعد تمہیں اپنے انجام تک

پہنچاتا ہے۔ سب کچھ جاننے کے بعد تم اس کی ہستی اور اس کی خلاقیت و ربوبیت کا کس طرح انکار کرتے ہو؟ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد تو تمہیں اس کی قدرتِ کاملہ کا اور بھی پختہ یقین ہو جانا چاہیے۔

آیت ۲۹: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠

۲۰۔ تخلیقِ کائنات کا مقصود انسان ہے اور کمالِ انسانیت کا مرقع مصطفیٰ ﷺ ہیں

اگلے رکوع میں انسان کی تخلیق اور اس کے نیابت و خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز کیے جانے کا ذکر آ رہا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے انسانی شرف و تکریم کا اجمالی بیان کر دیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ کائناتِ ارضی کی تخلیق کا مقصود انسان ہے۔ زمین اور اس کے اندر جو کچھ بھی موجود ہے انسان ہی کی خدمت و اطاعت کیلئے ہے۔ انسان ہر شے کا مخدوم و مطاع ہے۔ یہیں سے انسان کے لئے تسخیرِ کائنات کا مفہوم اخذ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے کئی مقامات پر اجرامِ فلکی، موجوداتِ ارضی اور جملہ مظاہرِ فطرت کے نام گن گن کر انہیں انسان کے تابع کیے جانے کا مضمون بیان فرمایا ہے۔ کبھی ارشاد فرمایا گیا۔ "**سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ**" (ابراہیم: ۳۳) (اور اس نے سورج اور چاند بھی تمہارے لیے مسخر کر دیے ہیں کہ ایک خاص ڈگر پر گردش میں ہیں)۔ کبھی ارشاد فرمایا۔ "**وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ**" "النحل: ۱۲" (اور ستارے بھی تمہارے ہی لیے اسکے حکم کے تابع ہیں)۔ کبھی ارشاد فرمایا۔ **وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ**" "ابراہیم: ۳۳) (اور اس نے رات اور دن بھی تمہارے لیے مسخر کر دیئے) کبھی ارشاد ہوا۔ "**هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا**" (النحل: ۱۴) (وہی ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے سمندروں اور دریاؤں کو بھی مسخر کر دیا تاکہ ان میں سے تازہ گوشت کھاؤ)۔ "**وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ**" (ابراہیم: ۳۲) (اور اس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جہازوں کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے سمندروں اور دریاؤں میں چلتے ہیں) کبھی فرمایا۔ "**وَ سَخَّرَ لَكُمُ**

الْاَنْهَارَ" (ابراہیم: ۳۲) (اور اس نے تمہارے لیے نہریں اور ندیاں بھی مسخر کردیں) الغرض جو کچھ بھی زمین میں ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ" (الحج: ۶۵) (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ بھی زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کردیا ہے) اسی طرح بادل' بارش' ہوائیں' سرسبز کھیت' مہکتے باغات' ہرے بھرے درخت اور پودے' لذیذ پھل' رنگ برنگے پھول' مختلف میوے' جانور' پرندے' فلک بوس پہاڑ' خوبصورت آبشاریں' ٹھنڈے پانی کے چشمے' کانیں اور معدنی ذخائر۔ علیٰ ھٰذا القیاس زمین کے سینے میں قدرت کے کتنے قیمتی خزانے اور فطرت کے بیش بہا مظاہر ہیں۔ ان کا شمار واحصاء بھی ناممکن ہے مگر قدرت نے نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ انسان ہی کیلئے پیدا کیا ہے بلکہ یہ سارے مادی وسائل اور ان سے جنم لینے والی توانائیاں انسان کے دستِ عقل ودانش کے تابع اور اسکے استعمال وتصرف میں کردی ہیں۔ انسان ان سب پر غالب ومتصرف ہے۔ صرف کائنات ارضی پر ہی کیا موقوف ہے۔ ارشاد ایزدی ہے۔ "وَسَخَّرَ لَکُمْ مَافِی السَّمَاوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ" (الجاثیہ ۱۳) (اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ تمہارے تابع کردیا) اس طبیعی کائنات کے عناصر اور ان کے جملہ موالید سب پر انسان ہی قوی ہے۔ عناصر اپنی کارگزاری میں انسان کے محتاج ہیں۔ ان عناصر کی باہمی اور نسبتی قوتیں بھی اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہیں۔ انسان نے زمین کا قلب وجگر چاک کیا۔ کنوئیں بنائے' راستے نکالے' تہہ خانے تیار کیے' معدنیات کے ذخائر اور ارضی خزائن ودفائن کے راز افشا کیے۔ انہیں اثقالِ ارض سے نکال کر عالم آشکارا بنادیا۔ سمندر کی بے کراں وسعتیں اور ہولناک گہرائیاں بھی اس کی دستبرد سے نہ بچ سکیں۔ انسان نے سمندروں کے جگر بھی چیڑ ڈالے کبھی لاکھوں من وزنی جہاز ان کی تہہ پر چلائے اور کبھی ان کا روپ بدل کر انہیں ہواوں بلکہ خلاؤں میں محو پرواز کردیا۔ کبھی اس نے سورج کی بکھری ہوئی تمازت کو شیشوں میں گرفتار کرلیا اور کبھی پانی کو پانی سے ٹکرا کر بجلی تخلیق کردی۔ وہ بجلی جو پوری دنیائے ہست وبود کو زندگی بخش رہی ہے اور زمین وآسمان کی وسعتیں اس کی جولانیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسے چاہا تو تانبے کی ایک پتلی سی تار میں محبوس کردیا۔ گویا بحروبر' خشکی وتری اور عالم پست وبالا کی ساری کائنات

انسان ہی کے اشارۂ چشم و ابرو کے تابع دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب قدرت و تصرف اور مخدومیت کی شان تو صرف انسان کی مشتِ استخوان کو ہی حاصل ہے۔ کائنات کی یہ آفاقی تابعیت تو محض مادی انسان کیلئے ہے۔ رہ گیا روحانی انسان' جو خود جسد خاکی کو زندگی اور تازگی بخشنے والا ہے۔ جس کے دم سے مذکورہ بالا مادی انسان حیات آشنا ہے۔ اور جو انسان کے جسم اور اس کے تمام ظاہری و باطنی اعضاء کا حکمران ہے۔ اس کی طاقتوں' قوتوں اور تصرفات و کمالات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کمالات و تصرفات کی جو نسبت پوری کائنات کے مظاہر اور حضرت انسان میں ہے اس سے کروڑہا درجے زیادہ متفاوت نسبت حضرتِ انسان کے جسم اور روح کے درمیان ہے۔ کیونکہ وہ انسان جس نے کائنات کی تمام دیدہ و نادیدہ طاقتوں کو اپنا زیرِ دست اور غلام بنا رکھا ہے۔ اگر خود ایک لمحہ کے لئے روح کی صحبت اور فیض سے محروم ہو جائے تو مٹی جیسی بے جان اور ارذل شے کے ہاتھوں ہی ختم ہو جائے۔ جو محیر العقول کارنامے مادی انسان' مادی ذرائع اور اسباب کی وساطت سے سرانجام دیتا ہے۔ ان سے ہزارہا گنا بڑھ کر تصرفات کا مظاہرہ ایک روحانی انسان کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا سرچشمہ اس کا مادی جسم نہیں ہے اس کی قوتوں کا سرچشمہ اس کی نورانی روح ہے۔ جسم کو عالمِ خلق سے مناسبت ہے اور روح کو عالمِ امر سے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روحانی انسان (حضرت عمرؓ) مدینہ میں ممبرِ نبوی ﷺ سے "یا ساریۃ الجبل" کی آواز بلند کرتا ہے تو بغیر سپیکر اور ٹیلیفون کے عراق میں نہاوند کی پہاڑیاں اس صدا سے گونج اٹھتی ہیں۔

جب روحانی انسان (حضرت ابراہیمؑ) وادی مکہ میں کھڑے ہو کر اعلانِ حج کی ندا دیتا ہے تو عالمِ انسانیت کا ایک ایک گوشہ بلکہ ماؤں کے رحموں میں زیرِ تکمیل بچوں کے کان بھی اس صدا سے گونج اٹھتے ہیں۔ جب روحانی انسان (حضرت بلالؓ) زمین مدینہ پر چلتا ہے تو اس کے قدموں کی آہٹ سے جنت کی فضائیں بھی شبِ معراج گونج اٹھتی ہیں۔ جب روحانی انسان (حضرت سلیمانؑ) توجہ کرتا ہے تو بغیر جہازوں کے تختِ سلیمانی فضاؤں اور خلاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے تو ہواوں کے رخ بدلنے لگتے ہیں۔ جب روحانی انسان (سرور کائنات ﷺ) نظر اٹھاتا ہے تو بغیر ٹیلی ویژن کے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر غزوۂ موتہ کے احوال بیان کرتا ہے۔ حرم مکہ سے مسجدِ اقصیٰ کی

محرابیں اور طاق بھی گن گن کرتا ہے اور جب صلوٰۃ الکسوف کے لئے جائے نماز پر قدم رکھتا ہے تو جنت میں انگوروں کے خوشوں اور دوزخ میں عذاب کے مناظر تک بیان کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ منبر پر قیام فرما ہو کر خطبہ ارشاد فرماتا ہے تو ابتداءِ کائنات سے انتہائے کائنات تک حشر و نشر سمیت ایک ایک حقیقت کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اگر وہ روحانی انسان عازمِ سفر ہوتا ہے تو چشم زدن میں مکان و لامکاں کی طویل مسافتوں کو چیر کر "مقامِ قاب قوسین" کی سیر کر کے واپس لوٹ آتا ہے۔ اگر روحانی انسان لکڑی کے خشک تنے اور پتھر کی کنکریوں پر توجہ کرتا ہے تو انہیں بغیر روح کے زندگی بخش دیتا ہے۔ اگر لوحِ محفوظ کی طرف اپنی سماعت کو متوجہ کرتا ہے تو "حرکتِ قلم" کی آواز سنتا ہے۔ اگر انگشتِ شہادت کو آسمان کی طرف متوجہ کرتا ہے تو سینۂ ماہتاب کو دولخت کر دیتا ہے۔ اگر ہاتھوں کو سمتِ مغرب میں متوجہ کرتا ہے تو ڈوبے ہوئے سورج کو واپس لوٹا دیتا ہے۔

الغرض پوری کائنات کی وسعتیں اس کے سامنے رائی کے دانے سے بھی کم وسعت رکھتی ہیں۔ پورے مظاہرِ کائنات کی طاقتیں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر کائناتِ طبیعی کی ہر شے باری تعالٰی نے اسی کی خاطر پیدا کی ہے' اسی کے تابع کر دی ہے اور اسی کے زیرِ تصرف و زیرِ خدمت رہنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اقبالؒ نے بجاطور پر کہا ہے کہ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰی ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسی وجہ سے "انسان" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

جب سب کچھ انسان کی اطاعت اور غلامی کے لئے بنایا گیا ہے تو کتنا ناداں ہے انسان کہ وہ اپنی عظمت اور شرف و تکریم کا تاج اتار کر ذلت و رسوائی کا لباس اوڑھے ہوئے ہے۔ اسے تو ہر شے سے مستغنی ہو کر اپنے رب کا محتاج ہونا تھا' لیکن شومئی قسمت کہ وہ اپنے رب سے مستغنی ہو کر باقی ہر شے کا محتاج ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ دنیا

و مافیہا اس کی غلامی اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہوتی وہ خود دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ منفعت اور دولت کے لئے بھی حریص اور سرگرداں ہے۔ اس طلبِ دنیا' حرصِ جاہ و منصب اور غلامئ اسباب نے اسے بارگاہِ مسبب الاسباب سے دور اور بے نیاز کر دیا اور نتیجتاً دربدر کی ٹھوکریں کھانا اس کا شعارِ حیات بن گیا۔

مذکورہ بالا آیت اسے اس کی حقیقت کی یاد دلا رہی ہے کہ اے انسان! تو دنیا کا غلام نہ بن تاکہ دنیا تیری غلامی کر سکے اور تو دنیا کی تلاش میں گم نہ ہو' تاکہ دنیا تیری تلاش میں گم ہو سکے۔

؎ کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق
اقبالؒ

آیت: ۳۰۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

۲۱۔ کلمہ اذ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانی تخلیق کا حضرت آدم سے پہلے ہونا

۳۔ عربی زبان میں اذ بمعنی "جب" ظرف زمان کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور یہ زمانہ ماضی کے بیان سے عبارت ہے۔ جب کہ اذا' زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔ اذ کے معنی میں ہمیشہ اذکر کا مفہوم محذوفاً" موجود ہوتا ہے جس کے معنی ہیں "وہ وقت' وہ موقع' وہ بات' یا وہ واقعہ یاد کرو"۔ عربی ادب میں اذ کے استعمال کا صحیح محل یہ ہے کہ جب مخاطب کو کوئی ایسی بات یا واقعہ یاد دلانا مقصود ہو جو پہلے اس کے مشاہدہ سے گزر چکا ہو یا پہلے سے اس کے علم میں ہو تو تب کلام کا آغاز کلمہ اذ سے کرتے ہیں۔ اردو ادب کا اسلوب بھی یہی ہے۔ کوئی بات یاد تب ہی کرائی جاتی ہے جب کہ مخاطب پہلے سے اس کو اچھی طرح جانتا ہو ورنہ سلسلہ کلام کو "یاد کرو جب" کہ الفاظ سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ اذ' کے لفظ میں "یاد کرو" کے مفہوم کا پایا جانا اہل علم کے ہاں ایک متفقہ اصول ہے جس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ بعض اوقات اذ' سے پہلے اذکر خود ہی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ

اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ (یاد کیجئے ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے رب کو پکارا۔ ص : ۴۱) اور بعض اوقات صرف اذ کا بیان آتا ہے مگر اس سے پہلے اذکر حکما" مذکور تصور کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں تخلیقِ آدم اور اس کے تسلسل میں فرشتوں کے استفسار کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کے مخاطب جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔ باری تعالیٰ حضور علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ "وہ واقعہ یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں" یہ اندازِ کلام اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پہلے سے اس واقعہ کا علم تھا اور آپ اس کی تفصیلات سے باخبر تھے اسی لئے آپ کو بصورت یاد دہانی اسی واقعہ کی حکمت' افادیت اور اہمیت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ بعض علماء نے مختلف توجیہات کے ذریعے اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

○ ایک یہ کہ ممکن ہے اس سورت کے نزول سے پہلے وحی کے ذریعے یہ واقعہ آپ سے بیان کر دیا گیا ہو اور آپکو اس طرح پہلے سے اس کی تفصیلات معلوم ہوں جنہیں دوبارہ یاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ (لیکن اس امر کی شہادت موجود نہیں ہے)۔

○ دوسرے یہ کہ یہ واقعہ چونکہ وحی الٰہی کے ذریعے بیان ہو رہا تھا اور حضور علیہ السلام کے لئے وحی کی ہر بات ایک حقیقت ثابتہ تھی اس لئے علم بالوحی کی یقینی کیفیت کی بنا پر یہ انداز اختیار کیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو وحی کی حقانیت و صداقت کے باعث اس واقعے کا درست ہونا اس طرح معلوم ہے جیسے کوئی واقعہ آنکھوں کے سامنے گزر چکا ہو۔ (لیکن یہ تعبیر کلمۂ اذ کے افادہ معنوی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ مفہوم معنی کو کھینچ تان کر وضع کیا گیا ہے حالانکہ اس تاویل کی چنداں ضرورت نہیں۔

○۔۔ تیسرے یہ کہ عصرِ حاضر کے بعض علماء نے اس سرگزشت کے بیان کا اصل رخ یہود کی طرف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ چونکہ وہ تورات کے ذریعے اس واقعہ سے باخبر تھے اس لئے فی الحقیقت انہیں اس امر کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ (یہ تاویل بھی درست نہیں

کیونکہ یہاں خطاب کا رخ براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے جیسا کہ **وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ** (اور جب آپ کے رب نے فرمایا) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پھر اس آیت سے پہلے مسلسل کئی آیات مجموعی طور پر بنی نوع انسان سے خطاب پر مبنی چلی آ رہی ہیں ان کا رخ بھی بالالتزام یہود کی طرف نہیں ہے۔ ایسی تاویلات کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب حقیقت معنی کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہو)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ عالمِ ارواح میں پیش آیا جب کہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانی طور پر نہ صرف موجود تھے بلکہ شرف نبوت سے بھی بہرہ ور ہو چکے تھے اور ملائکہ و انبیاء کرام کی مقدس ارواح اس عالم میں آپ سے فیض حاصل کرتی تھیں۔ بنا بریں تخلیقِ آدم کا واقعہ اور اس سے متعلق دیگر تفصیلات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاہدہ میں تھیں۔ چنانچہ یہاں حضور علیہ السلام کو عالم ارواح کا وہی منظر یاد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو آپ دنیائے بشریت کے آغاز سے پہلے دیکھ چکے تھے۔ ہمارے نقطہ نظر کی تائید بغیر کسی شک و شبہ کے متعدد احادیث نبوی سے ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث ان الفاظ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ۔

قالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متی وجبت لک النبوۃ قال آدم بین الروح والجسد۔ (صحابہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم آپ نبوت سے کب بہرہ ور ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت سے جب حضرت آدمؑ روح اور بدن کے درمیان تھے، یعنی ان کی تخلیق ابھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ جامع ترمذی، حدیث حسن)۔

یہی حدیث حضرت میسرہ، ابن ابی الجدعا اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ان الفاظ کی ساتھ مروی ہے: **متی کنت نبیا قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنت نبیا وآدم بین الروح والجسد۔** احمد بن حنبل، حاکم، ابو نعیم، طبرانی، ابن سعد، بخاری۔ (حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم آپ کب سے نبی ہیں؟ حضور علیہ السلام نے

فرمایا اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ روح اور جسم کے مرحلے میں تھے، یعنی ان کے تن میں جان سیں آئی تھی)۔ اسی طرح امامؒ شعبی روایت کرتے ہیں: **قال رجل یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متی استنبئت قال و آدم بین الروح والجسد حین اخذمنی المیثاق۔** رواہ بن سعد من روایتہ جابر الجعفی بحوالہ قسطلانی۔ (ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ کو کب نبی بنایا گیا؟ یعنی آپ کو منصب نبوت پر کب فائز کیا گیا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا ابھی آدم روح اور جسم کے درمیانی مرحلے میں تھے جب مجھ سے حلف نبوت لے لیا گیا تھا)۔

ان احادیث کی وضاحت اور مذکورہ بالا مفہوم کی تصریح و تائید بیشمار ائمۂ حدیث اور اکابر علماءِ امت نے کی ہے جن میں سے صرف دو کا بیان ملاحظہ ہو۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں میں نے اسی حدیث کے مفہوم کی بابت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی طور پر سوال کیا **ففاض علی روحی من جمالہ کریمۃ الصورۃ المثالیۃ التی کانت قبل ان یوجد فی عالم الاجسام وان لیضانہا فی الحضرۃ المثالیۃ کان عند کون آدم منجد لا بین الماء والطین وان لہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ظھورا تاما فی تلک الحضرۃ وھو المعبر عنہ بالنبوۃ فی ھذا الحدیث۔** (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح طیبہ میری روح پر اس صورت مثالی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی جس میں عالم اجسام میں آنے سے پہلے موجود تھی۔ اس کا فیضان عالم مثال میں تخلیق آدم سے بھی پہلے جاری تھا اور حضور علیہ السلام کو اس عالم میں بھی ظہور تم کی شان حاصل تھی جس کو اس حدیث میں نبوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ التفہیمات الالہیہ)۔ اسی حدیث کے ضمن میں علامہ انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں: **کان النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نبیا وجرت علیہ احکام النبوۃ من ذالک الحین بخلاف الانبیاء السابقین فان الاحکام جرت علیھم بعد البعثۃ۔**

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بھی نبی تھے اور آپ پر احکام نبوت اسی وقت جاری ہو چکے تھے بخلاف دیگر انبیاء سابقین کے، کہ ان پر احکام نبوت کا اجراء بعثت کے

بعد ہوا۔ العرف الشذی علیٰ جامع الترمذی)۔

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں جب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ حضور علیہ السلام عالمِ ارواح میں تخلیق آدم علیہ السلام کے واقعہ کے وقت نہ صرف اپنی نورانی حالت میں موجود تھے بلکہ بحالتِ نبوت جلوہ گر تھے اور تمام مخلوق اس وقت بھی آپ ہی کے فیضان سے مستفید ہو رہی تھی تو اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے علم اور مشاہدے میں پہلے سے تھا لیکن وہ روحانی تھا اب یاد کروا کر اس کی تشریعی اور تکوینی حکمتوں اور مصلحتوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے اس لئے حضور علیہ السلام سے اس خطاب کا آغاز اس طرح کیا گیا: **وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ**۔ (اور اے نبی! یاد کیجئے وہ وقت جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا تھا میں زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں)۔

آیت: ۳۰ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ

۲۲۔ فرشتوں کی حقیقت اور ان سے باری تعالیٰ کی گفتگو کی حکمت

ملائکہ۔ مَلْاَکٌ کی جمع ہے۔ اس سے مفاعل کے وزن پر "ملائک" ہے۔ جیسے مطلع کی جمع مطالع آتی ہے۔ ملائک کے بعد "ۃ" تانیث کے طور پر آئی ہے۔ ملائکہ کا واحد "مَلَکٌ" بھی بتایا گیا ہے۔ اس کا مادہ "اَلَکَ" ہے۔ جس کے معنیٰ ارسل (اس نے بھیجا) کے ہیں۔ اسی طرح "اَلُوْکَۃٌ" کے معنی بھی رسالت یعنی پیغام رسانی کے آتے ہیں۔ چونکہ یہ مخلوق باری تعالیٰ کے پیغامات اس کے مقبول اور مقرب بندوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اس لئے اسے "ملائکہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے علماء فرماتے ہیں۔ "**انهم وسائط بين الله تعالى وبين الناس**" (یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان واسطے اور وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ اہل علم نے ملائکہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اقوال اور تعریفات بیان کی ہیں۔ لیکن صحیح ترین اور متفقہ قول یہ ہے "**انها اجسام لطيفة قادرة على التشكل باشكال مختلفة**" (البیضاوی) (یہ لطیف اور نورانی اجسام ہیں جنہیں اپنی لطافت کے باعث مختلف شکلیں بدلنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔)

عام انسان انھیں ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ انسانی آنکھ صرف کثیف اور مادی اجسام کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ غیر مادی اور لطیف اشیاء کو نہیں۔ مگر وہ عرفاء و کاملین جنھوں نے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعے اپنی باطنی آنکھ روشن کرلی ہوتی ہے اور ان کی چشمِ بصیرت سے مادی حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ملائکہ کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ انھیں ان سے ملاقات اور اکتسابِ فیض کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرشتوں کے غیر حسی اور غیر مرئی ہونے کے باعث بعض کم فہم لوگوں نے ان کے خارجی وجود (Externality) کا ہی انکار کردیا ہے۔ اور چونکہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر بصراحت فرشتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے ان آیاتِ قرآنی کی تاویلِ فاسد کرتے ہوئے فرشتوں کو مجرد انسانی قوتوں' نیک انسانی روحوں' قوائے عالم یا صفاتِ باری تعالٰی سے تعبیر کردیا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے جبرئیلِ امین کو عین ملکۂ نبوت قرار دے دیا ہے۔ یہ سب تصورات گمراہی پر مبنی ہیں اور فلسفہ حسیّت کی پیداوار ہیں۔ خود قرآن مجید کی بیسیوں آیات اور احادیثِ نبوی ﷺ فرشتوں کے جس تصور کی تائید ہوتی ہے۔ وہ وہی ہے جس کو جمہور اہلِ اسلام اوائلِ تاریخ سے آج تک اپنائے ہوئے ہیں۔ فرشتے انسانی روحیں' قوتیں یا صفاتِ الٰہیہ ہرگز نہیں بلکہ انسانوں اور جنوں سے الگ ایک مستقل نوع کی لطیف مخلوق ہیں۔ جن کا مسکن آسمان ہے۔ انہیں باری تعالٰی نے اپنے خصوصی امور کی انجام دہی اور احکامِ قدرت کی تدبیر' تعمیل اور تنفیذ کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔ گویا یہ ذاتِ حق کے وہ کارکن ہیں جن سے خلقی طور پر نافرمانی اور گناہ صادر ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ اپنے خمیر اور ہیئتِ تخلیق کے اعتبار سے ہی "معصوم" ہیں۔ ان کا وجود سراسر نور ہے۔ ان میں جنات اور انسانوں کی طرح شر و فساد اور فتنہ و ظلم کا نہ کوئی ملکہ ہے اور نہ استعداد۔ اس لیے روزِ قیامت یہ جواب دہی اور مواخذے سے بھی مستثنٰی ہوں گے۔ بعض اقوام نے انھیں غلطی سے خدا کی بیٹیاں تصور کیا' بعض نے ان کے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر انھیں خدائی میں شریک بنادیا۔ جب کہ بعض نے ان کی پرستش بھی کی۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر ان تمام باطل تصورات کی تردید کی ہے اور ان کے بارے میں صحیح تصوریوں واضح کیا ہے "**وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ**

الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا" (الزخرف،۴۳: ۱۹) (اور انھوں نے ان فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس کی بیٹیاں بنادیا) ان کی بندگی کا عالم یہ ہے کہ "یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَایَفْتُرُوْنَ" (الانبیاء: ۲۰) (فرشتے رات دن خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ہرگز نہیں تھکتے)۔ ایک اور مقام پر مذکور ہے۔ "وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ" (الزمر :۷۵) (اور آپ فرشتوں کو عرش کے ارد گرد خدا کی تسبیح کرتے دیکھیں گے)۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا۔ "لَایَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ" (فرشتے خدا سے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔) (الانبیاء، ۲۷)

جہاں باری تعالیٰ چاہتا ہے۔ ان کے ذریعے اپنے مقبول بندوں اور دوستوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ جیساکہ جنگِ بدر میں فرشتوں نے مسلح ہو کر مجاہدین اسلام کی مدد کی۔ ارشاد قرآنی ہے۔ "یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ"

(آلِ عمران،۳: ۱۲۵)

(تمہارے رب نے پانچ ہزار مسلح فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کی)۔

ان تمام آیات کے مطالعہ سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو بحیثیت مخلوق باقاعدہ وجود اور تشخص حاصل ہے۔ وہ مستقل ہستیاں ہیں۔ مجرد قوتیں یا نظام عالم کے اسباب (Causes Of Physical Phenomena) نہیں ہیں۔ جیساکہ بعض ان تجدد پسند لوگوں کا خیال ہے۔ جنہوں نے بلاجواز انہیں سائنسی تحقیق کا موضوع بنالیا ہے۔ انھوں نے آیات قرآنی کی فاسد تاویلات اور احادیثِ نبوی ﷺ کے انکار کی بناء پر فرشتوں کے تصور کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی نہ کسی سائنسی اصول اور معیار کے تابع ہو جائے۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کردیتے ہیں کہ فرشتے جس نوعِ تخلیق سے تعلق رکھتے ہیں وہ سائنس کے دائرۂ تحقیق (Scope Of Research) سے ہی خارج ہے۔ سائنس صرف عالمِ حسیات ومادیات (Physical and Material World) کے حقائق سے بحث کرتی ہے۔ اسے مابعد الطبیعی اور روحانی حقیقتوں (Meta-Physical and Spiritual Realities) سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اس لیے سائنس کا یہ کام نہیں کہ

اپنے موضوعِ تحقیق سے ہٹ کر کسی غیر متعلقہ حقیقت سے بحث کرے۔ اس کی ماہیت اور وجود کے بارے میں رائے زنی کرے یا جو شے اس کی حدِ جستجو سے ماوراء ہو اس کا انکار کر دے۔ سائنس کے نام پر ایسی نام نہاد تحقیق خود غیر سائنسی (Unscientific) بات ہے۔

اگر ہماری عقل اپنی محدود وسعت کی بناء پر فرشتوں کا صحیح ادراک نہ کر سکتی ہو تو اس وجہ سے ہم فرشتوں کے تصور کو "خلافِ عقل" قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ اسے "ورائے عقل" کہیں گے۔ کسی چیز کا خلافِ عقل ہونا اور بات ہے اور وراءِ عقل ہونا اور بات۔ عقل و خرد کے ادراک کا تمام تر انحصار حواسِ خمسہ (Perception Of Five Senses) پر ہوتا ہے۔ جو چیز آنکھ، کان، ناک، زبان یا ہاتھ کے ادراک میں آسکے۔ عقل صرف اسی کو سمجھ سکتی ہے اور اسی کے بارے میں کوئی رائے وضع کر سکتی ہے۔ لیکن جس شے کا وجود ہی سرے سے غیر حسی اور غیر مادی ہو اسے نہ دیکھا جا سکتا ہو اور نہ سونگھا جا سکتا ہو، نہ سنا جا سکتا ہو، نہ چکھا جا سکتا ہو، نہ چھونا ممکن ہو۔ گویا حواس ظاہری جس حقیقت کے بارے میں کوئی خام مواد اور ابتدائی معلومات ہی فراہم نہ کر سکیں تو آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ عقل اس کے بارے میں کوئی تصور کس طرح قائم کر سکے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ عقل اس معاملے میں خاموش ہی رہے گی۔ عقل کا خاموش رہنا اس کی اپنی حدود (Limitation) کی وجہ سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کبھی بھی اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس حقیقت کا ہی سرے سے کوئی وجود نہیں۔ آخر ہر چیز کو عقل اور سائنس کے حیطۂ ادراک (Scope Of Perception) میں کھینچ لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا عقل اور سائنس کی حدِ جستجو سے اوپر یا خارج، کوئی حقیقت موجود نہیں؟ یہ انداز فکر ہمیں خدا اور رسول ﷺ وحی و آخرت بلکہ جملہ اجزائے ایمان سے انکار پر لا کھڑا کرے گا اور "ایمان بالغیب" کا تصور ہی بالکل معدوم ہو جائے گا۔

جس طرح ہر چیز کو جاننے کا ایک خاص ذریعہ ہوتا ہے۔ مثلاً آواز کو جاننے کا ذریعہ کان ہیں، ذائقے کو جاننے کا ذریعہ زبان ہے اور خوشبو کو جاننے کا ذریعہ ناک ہے۔ اس مخصوص ذریعے کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے اس مخصوص حقیقت کو نہیں جانا جا سکتا۔ اسی طرح محسوسات اور معقولات سے ماوراء حقیقتوں کو جاننے کے بھی کچھ

مخصوص ذرائع ہیں۔ جنہیں صرف انہی کی مدد سے جانا جاسکتا ہے ان کے بغیر نہیں اور وہ ہیں نورِ باطن یا وحیِ الٰہی۔ نورِ باطن ایسا ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی قلبی اور روحانی استعداد کے طور پر ان کے اندر رکھا ہے۔ اس سے بھی ادراک ہوتا ہے اور جن مابعد الطبیعی حقیقتوں کے کامل ادراک سے یہ باطنی ذریعہ بھی قاصر ہو، انہیں صرف وحیِ الٰہی اور واسطۂ نبوت سے جانا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر کسی اور صورت ممکن نہیں۔ لہٰذا فرشتوں کے وجود اور ماہیت یا ایسی ہی دیگر عالمِ امر کی حقیقتوں کے بارے میں خود صاحبِ نبوت کا قول سند ہوسکتا ہے۔ کسی اور محقق، فلسفی یا سائنسدان کا نہیں۔

فرشتوں سے گفتگو کی حکمت۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ ونائب پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جس پر فرشتوں نے بھی بارگاہِ الوہیت میں چند گزارشات پیش کیں۔ اس واقعے پر بعض ذہنوں میں دو طرح کے شبہات پیدا ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ باری تعالیٰ کی فرشتوں سے یہ گفتگو کس غرض سے تھی؟ اگر مشورہ طلب کرنے کے خیال سے تھی تو آخر اس امر کی ضرورت باری تعالیٰ کو کیوں پیش آئی؟

دوسرے یہ کہ فرشتوں کا جواب جو اس سے اگلی آیت میں مذکور ہے کیا مشیتِ ایزدی پر اعتراض نہیں تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو باری تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ گفتگو مشورہ طلب کرنے کے لئے کی اور نہ ہی وہ ذات اس امر کی محتاج ہے اور نہ فرشتوں کا جواب ارادۂ الٰہی پر اعتراض تھا بلکہ وہ تو جنابِ الوہیت میں ایسی جرأت کے مرتکب ہو ہی نہیں سکتے۔ فرشتوں کی حیثیت باری تعالیٰ کے نظامِ قدرت میں نہ شریک کی ہے اور نہ مشیر کی۔ وہ تو مشیتِ الٰہی اور احکامِ ایزدی کی تعمیل کے لئے ایسے اہلکار ہیں جو سراسر پیکرِ تسلیم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی خلافت ونیابت عطا کرنے کا ارادہ ان کے سامنے اس لیے ظاہر فرمایا کہ چونکہ یہ عظیم شرف وامتیاز فرشتوں کی بجائے ایک نئی مخلوق کو دیا جارہا تھا۔ حالانکہ فرشتے احکامِ الٰہی کی بجا آوری، خدا کی بندگی اور اس کی بارگاہ میں نیازمندی کے اعتبار سے کم درجات کے حامل نہ تھے۔ باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ بالخصوص بنی نوع انسان کو اس فضیلت ومنزلت سے نوازنے کا اقدام فرشتوں کے

لئے باعث حیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر میرے فیصلے کی حکمت سے عدمِ واقفیت کی بناء پر ان کو حیرت ہو بھی، تو اس کے باوجود یہ ادبِ الوہیت بجالاتے ہوئے مجھ سے کوئی سوال نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنی حیرت کا اظہار کریں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ان اطاعت گزار بندوں اور اہلکاروں پر کمال شفقت سے خود ہی اپنے ارادے اور مشیت کا اظہار فرمایا۔ تاکہ انہیں اپنی حیرت اور نقطۂ نظر کے بیان کا موقع فراہم ہو سکے۔ ورنہ فرشتے فعلِ الٰہی کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے بھی ادباً خاموش رہتے اور دربارِ الٰہی میں ہمتِ تکلم نہ کرتے۔ بناء بریں ممکن تھا کہ وہ آدمؑ و بنی آدم کے مقام و منصب اور عزت و عظمت سے بخوبی آگاہ ہوئے بغیر محض حکمِ الٰہی کی اطاعت میں ان کی تعظیم و تکریم بجا لاتے رہتے۔ اس طرح تعظیمِ آدمؑ کا حق ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا باری تعالیٰ نے اپنے فعل سے پہلے ارادۂ فعل کو ظاہر فرما کر خود ہی فرشتوں کو دعوتِ تکلم دی تاکہ ان کے دل و دماغ میں اگر کوئی سوال یا خیال موجود ہے تو بلا جھجک میرے حضور عرض کر دیں اور اپنے مدعائے دل کو برملا بیان کریں تاکہ انہیں عظمتِ آدم کی حقیقی بنیاد کا بلاواسطہ مشاہدہ کرایا جاسکے اور اس مشاہداتی تصدیق کے نتیجے میں وہ خود مطمئن ہو سکیں کہ ہمارے پیکرِ تسبیح و تہلیل ہونے کے باوجود حضرتِ انسان کو بالخصوص شرفِ نیابت کے لئے کیوں منتخب کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ جب اس علم و آگہی کے بعد انہیں بنی نوع انسان کے پیشواؤں یعنی انبیاء کی طرف بھیجا جائے گا تو پھر ان کی تعظیم و تکریم کا انداز کچھ اور ہو گا۔ گویا باری تعالیٰ کی فرشتوں سے یہ گفتگو حضرت آدمؑ اور پیشوایانِ بنی آدم کی عظمت و برتری کے اظہار کی غرض سے تھی۔ تاکہ انہیں تاجِ خلافت پہنانے سے پہلے ہی ان کے استحقاق اور اہلیت کی بنیاد کو ظاہر کر دیا جائے۔

آیت کا تربیتی پہلو۔

اس آیت مبارکہ میں "بڑے لوگوں" کے لئے خصوصی تعلیم و تربیت کا ایک پہلو مضمر ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے قائدین اور سربراہ اپنے رفقاءِ کار اور مخلص کارکنوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امور کا فیصلہ کرنا اور حکم صادر کرنا ہمارا حق ہے اور باقی ساتھیوں کا کام تو صرف ہمارے احکام کی تعمیل ہے خواہ ان کے دل و دماغ ان فیصلوں سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں۔ اگر

بعض رفقاءِ کار اپنے اخلاص، نیک نیتی اور حقیقی ہمدردی کی بناء پر اپنا نقطۂ نظر یا مدعائے دل بیان کر دیں تو اس اقدام کو گستاخی، بے ضابطگی، عدمِ وفاداری یا سازش و بغاوت کا نام دے کر انہیں تحریک یا جماعت سے نکال دیا جاتا ہے عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ان کے بولنے یا ان کا موقف سنے جانے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے تو رفتہ رفتہ وہ مایوس اور متنفر ہو کر خود ہی تنظیم سے الگ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قائدین کے غیر جمہوری تحکمانہ اور دل ناپذیر رویے سے مشن کو نقصان پہنچتا ہے۔ مگر وہ اپنی شخصیت وانانیت کے بت کے تحفظ کے نشے میں اسی طرح بہکے چلے جاتے ہیں۔

اس آیت میں ان کی اصلاح کا پہلو یہ کہ ذاتِ حق نہ تو کسی کی ضرورت مند تھی اور نہ ہی وہ کسی کی دلپذیرائی کی محتاج تھی۔ فرشتے اس ہستی کے نظامِ قدرت کے چلانے والے ایسے وفادار اور اطاعت شعار کارکن تھے کہ ان کے کبھی مایوس یا غیر مطمئن ہونے کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود باری تعالیٰ نے ان کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار فرمایا۔ پھر انہیں بولنے کا موقع دیا اور خود ان کا نقطۂ نظر سنا۔ اس پر انہیں نہ جھڑکا نہ ان سے خفا ہوا۔ انہیں مکمل طور پر مطمئن کیا۔ یہ اطمینان بھی تحکمانہ طریقے سے نہیں بلکہ نہایت رحیمانہ اور مشفقانہ طور پر۔ مشاہداتی استدلال سے حضرت آدم کی بنائے فضیلت اور بنائے استحقاق کو واضح کیا۔ جب فرشتوں نے خود اپنی لاعلمی اور حضرت آدم کی برتری اور استحقاق کا اعتراف کر لیا۔ تو تب انہیں اس قولی اعتراف کی عملی تصدیق کے طور پر حضورِ آدمؑ میں تعظیمی سجدہ بجا لانے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ انداز ہماری اصطلاح اور ہمارے فہم کے مطابق کس قدر جمہوری، غیر تحکمانہ، فطری اور دلپذیر تھا۔ اسے بیان کرنے کی غرض بھی یہی ہے کہ ہماری تحریکوں اور جماعتوں کے قائدین میں سے تو کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ مشورے کا کلیتاً محتاج ہی نہ ہو اور اس کی ہر بات کی حکمت کو جانے بغیر اس کے کارکن اور رفقاء اس کے فیصلوں سے مکمل طور پر مطمئن بھی رہیں۔ اس لیے قیادت و رہنمائی کا منصب سنبھالنے والوں کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کے لئے خوف و وحشت کا پیکر بن کر نہ رہیں۔ انہیں مختلف امور کے فیصلوں میں شریکِ مشورہ کریں۔ انہیں ہمیشہ اپنا اپنا نقطہ نظر کھل کر بیان کرنے کا موقع دیں۔ انکے لبوں پر مہر سکوت نہ لگائیں۔ اگر وہ کسی مسئلے پر آپ سے اختلاف کریں تو اسے بھی حوصلے سے سنیں اور گوارا کریں۔ تحمل

اور بردباری سے انہیں مطمئن کریں۔ الغرض ہر قدم پر انہیں پورے اعتماد میں رکھیں تاکہ وہ آپ کے صحیح جاں نثار ساتھی ثابت ہو سکیں۔ یہ "قیادت" کے لئے کتنا زریں سبق ہے۔ یاد رکھیے کہ اسے بھول کر دوسروں سے اپنے احکام کی سچی تعمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

آیت ۳۰:- اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

۲۲- خلافتِ الٰہیہ، شانِ مظہریت اور عظمتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خلافت کا معنی

یہ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی "پیچھے آنا" کے ہیں۔ فرعون کی موت پر اس کے بدن کو آئندہ محفوظ رکھنے کا وعدہ ان الفاظ میں کیا گیا: **فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً**۔ (پس آج ہم تیرے بدن کو محفوظ رکھیں گے تاکہ یہ تیرے پیچھے آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت بن سکے)۔ اسی سے خلفہ نکلا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً**۔ (وہی ذات ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بنایا)۔ اس سے "خلافت" کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی "نیابت" اور "قائم مقام" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: **خلف فلان فلانا ای قام بالامر عنه اما معه واما بعده**۔ (یعنی فلاں شخص اس کا نائب اور قائم مقام ہوا خواہ اس کی ہمراہی میں خواہ اس کے بعد)۔ بنا بریں خلافت کا معنی یہ کیا جاتا ہے: **الخلافة النیابة عن الغیر اما لغیبة المنوب عنه واما لموته ولعجزه واما لتشریف المستخلف**۔ (خلافت کسی دوسرے کے نائب اور قائم مقام ہونے کو کہتے ہیں خواہ بوجہ اس کی عاجزی اور نااہلیت کے یا محض نائب بنانے والے کی عزت افزائی کے لئے)۔ باری تعالیٰ کی خلافت و نیابت پہلے تینوں اسباب سے پاک ہے، وہ صرف چوتھے سبب کے لئے ہے۔ اس ذات نے بنی نوع انسان میں سے انبیاء و رسل کی مقدس ہستیوں کو محض ان کی قدر و منزلت اور شرف و عظمت بڑھانے کی خاطر اپنی خلافت و نیابت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔

اس لئے یہ پاکیزہ نفوس روئے زمین پر باری تعالیٰ کے خلیفے اور نائب ہیں۔ یہ ان معنوں میں خدا کے قائم مقام ہوتے ہیں کہ یہ باری تعالیٰ کے امر و نہی پر مبنی احکام وصول کرتے ہیں اور بنی نوع انسان تک پہنچا کر انہیں عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ پھر یہ مقدس نفوس خود اپنے قول و عمل کے اعتبار سے احکامِ الٰہی کی تعمیل کا نمونہ کامل اور مشیت ایزدی کے اظہار کا واسطہ اتم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی اطاعت خود باری تعالیٰ کی اطاعت تصور ہوتی ہے اور ان کی نافرمانی باری تعالیٰ کی نافرمانی۔ ان کے بغیر نہ کسی کو خدا کی ذات و صفات کی کامل معرفت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی کو بارگاہ الوہیت تک رسائی۔ انہی کی پیروی رضائے الٰہی کا موجب اور ان سے منہ موڑنا غضب الٰہی کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ خالق کائنات اپنے ہر حکم اور ہر منشا کو انہی کے واسطے سے بنی نوع انسان تک پہنچاتا ہے اور اس کی اطاعت یا انحراف کی صورت میں ثواب و عذاب کی بشارت بھی انہی کی زبان سے دیتا ہے اس وجہ سے انہیں خلقِ خدا کے لئے اس کا نائب اور قائم مقام ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی اس آیت قرآنی کا ماحصل ہے: **وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔** (اور ہم نے کوئی رسول بھی نہیں بھیجا مگر اس حیثیت سے کہ اذن الٰہی کے باعث اس کی اطاعت کی جائے۔ سورہ نساء)۔ یعنی اسے حکم الٰہی کی بناء پر مطاع مطلق سمجھا جائے۔ اس تصور کی وضاحت ان دو آیات سے ہوتی ہے: ۲۔ **مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔** (جو کوئی رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ سورہ نساء)' ۲۔ **وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔** (اور رسول جس چیز کی اجازت دے اسے اپنا لو اور جس چیز سے بھی منع فرمائے اس سے رک جاؤ۔ سورہ حشر)۔ اگر کوئی بھی شخصیت ان اختیارات اور اوصاف سے محروم ہو تو اسے کس طرح خدا کا خلیفہ و نائب تصور کیا جا سکتا ہے۔

منصب خلافت کی صحیح تعبیر

یہاں خلافت سے انسان کی دو شانیں مراد ہو سکتی ہیں:

۱- نیابت سیاسی

۲- مظہریت الٰہیہ

"نیابت سیاسی" روئے زمین پر احکام الٰہی کے اجراء و نفاذ سے عبارت ہے۔ یہ مقام و منصب اصلاً" صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے بنی نوع انسان کی امامت اور پیشوائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اگر ان کی مساعی سے روئے زمین پر کسی باقاعدہ ریاست کی تشکیل ہوتی ہے تو وہ خود ہی اس کے حاکم و سربراہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی باضابطہ ریاست تشکیل پذیر نہ بھی ہو تو بھی اپنی امت کی امامت و پیشوائی کا منصب انہی کے سپرد ہوتا ہے اور ان کی امت کے حکام و امراء ہمیشہ ان کے خلیفے ہوتے ہیں۔ بنا بریں امت مسلمہ کے لئے ہر ہر دور میں سیاسی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGN) کا منصب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے کیونکہ روئے زمین پر علی الاطلاق خلیفۃ اللہ آپ ہی کی ذات گرامی ہے اور قیامت تک تمام اسلامی حکومتوں اور ریاستوں کے سربراہ آئینی حیثیت سے' حاکمیت کا نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت و نیابت کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی حکومتوں کے صحیح نمائندہ سربراہ' براہ راست خدا کے خلیفے اور نائب نہیں بلکہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفے اور نائب ہیں اور اسلامی حکومت کی اپنی آئینی حیثیت بھی خلافت الٰہی کی نہیں بلکہ خلافت نبوی کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو لوگوں نے آپ کو "خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا' جس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: **لست خلیفۃ اللہ ولکنی خلیفۃ رسول اللہ** (میں خدا کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ مقدمہ ابن خلدون' ص: ۱۳۴) طبرانی' حاکم' ابن عساکر اور دیگر کتب

حدیث و سیر میں بالاتفاق مذکور ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ خود کو "خلیفۃ رسول اللہ" کہتے اور دیگر تمام صحابہ و مسلمین بھی آپ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔ ابن خلدون اسی تصور کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **انہا نیابۃ عن صاحب الشریعۃ فی حفظ الدین و سیاسۃ الدنیا** (منصب خلافت دینی اور دنیوی امور کی حفاظت میں صاحب شریعت یعنی نبی کی نیابت کا نام ہے۔ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۱۳۴، ۱۵۴)۔ اور اسلامی ریاست کے سربراہ و خلیفہ کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **واما تسمیتہ خلیفۃ فلکونہ یخلف النبی فی امتہ** (اور اسے خلیفہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں آپ کی نیابت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے)۔

چنانچہ آدم علیہ السلام کو اس معنی میں خلیفہ اس لئے کہا گیا کہ باری تعالیٰ ان کی وساطت سے روئے زمین پر پیدا ہونے والے انسانوں تک اپنے احکام پہنچانا اور ان پر انہیں جاری و نافذ کرنا چاہتے تھے بعد ازاں یہی کام دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کی نیابت میں امت مسلمہ کے باقی افراد سے بھی لیا جانے والا تھا، اس لئے انہیں خلافت و نیابت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

یہاں خلافت کا لفظ اپنے اندر مظہریتِ الٰہیہ کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ باری تعالیٰ نے فرشتوں کو آگاہ کیا کہ میں بنی نوع انسان کو اپنی صفات کا مظہر اور اپنے کمالات کا آئینہ دار بنانا چاہتا ہوں۔ اس تصور کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسانی شخصیت کا ایک بھرپور جائزہ لیا جائے۔

انسانی شخصیت - بشریت، ملکیت اور حقیقت : کے تین پہلوؤں سے عبارت ہے۔ بشریت کی سطح پر انسانی زندگی کے ظاہری، جسمانی اور حسی احوال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ وہ گوشۂ شخصیت ہے جس کا تعلق عالم آب و گل سے ہے۔ وہ اسی عالم ناسوت کے ضابطوں سے تشکیل پاتا اور اسی کے تقاضوں کے مطابق بسر ہوتا ہے۔ انسان کا پیدا ہونا، کھانا، پینا، پہننا، سونا، جاگنا، کمانا، شادی بیاہ کرنا۔ الغرض تمام طبعی خواہشات و عوارضات

اور نفسانی داعیات و لوازمات کا وجود شخصیت کے اسی حصے کی ضرورت اور نمود و نمائش کے لئے ہے۔ گویا بشریت انسانی زندگی کا ظاہر ہے جب کہ اس کا باطن ملکیت سے عبارت ہے۔ ملکیت سے مراد فرشتوں جیسی خصوصیات کا حامل ہونا ہے۔ طبیعت میں زہد و عبادت' محبت و خشیتِ الٰہی' زیادہ کھانے' پینے' بولنے اور سونے سے پرہیز' نفس کا فواحش و محرمات سے اجتناب اور مجموعی طور پر اطاعت و بندگی کا میلان' سب شخصیت کے گوشہ ملکیت کا تقاضا اور ظہور ہے۔ انہی صفات کے غلبے سے باطن ظلمت کی بجائے نور سے آراستہ ہوتا ہے۔ ان کے فروغ سے انسان کی روح کو تازگی اور تابندگی نصیب ہوتی ہے اور وہ بشریت کے باوجود نورانیت کا حامل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اوصاف ملکوتی اور شخصیت روحانی ہو جاتی ہے۔ یہ چیز تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن سے میسر آتی ہے۔ یہاں وہ انسان ہو کر بھی فرشتوں کے کئی خصائص کا حامل بن جاتا ہے۔ اسے حجابات بشریت اور ظلمات نفس سے چھٹکارا حاصل ہونے لگتا ہے۔ جوں جوں اس کی روحانیت فروغ پاتی ہے اس کی شخصیت کثافتوں سے نجات پاکر لطافتوں سے مزین ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ انسان کے اوصافِ بشریت' کئی معاملات میں خصائصِ نورانیت سے بدل جاتے ہیں۔ پھر اس ملکوتی صفت انسان کے لئے جسمانی اور مادی دنیا کے کئی ضابطے اور پابندیاں نرم پڑ جاتی ہیں۔ زمان و مکان کی قیود اور قرب و بعد کی حدود اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ وہ باطنی آنکھ سے دور و نزدیک کا مشاہدہ کرتا ہے اور باطنی کان سے پست و بلند آواز کو سنتا ہے۔ وہ روحانی قوت سے مختلف مقامات پر آتا جاتا ہے۔ جسمانی کثافت اس کی روحانی لطافت کے سامنے اس قدر ماند پڑ جاتی ہے کہ وہ کسی رکاوٹ کا باعث نہیں بن سکتی۔ انسانی شخصیت کے اسی ملکوتی پہلو کا فروغ بزرگوں کی حسی کرامات کی بنیاد ہوتا ہے۔ جسے بعض اوقات نہ سمجھ سکنے کے باعث ذہنوں میں اعتراضات جنم لیتے ہیں۔ جس طرح لوہا اپنی ذات میں ایک ٹھوس' جامد اور ٹھنڈا مادہ ہے۔ جو فی نفسہ جلنے یا جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اسی کو آگ میں جلا کر سرخ کرلیا جائے یا پگھلا لیا جائے تو یہی لوہا آگ کی طرح جلنے بھی لگتا ہے اور جلانے بھی گویا آگ کے اوصاف

ایک مخصوص مشقت اور آگ کی شدت قرب کے باعث اس پر اتنے غالب آجاتے ہیں کہ اس میں آگ ہی کی بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر یاد رکھیے اس پورے تغیر کے باوجود اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔ اسی طرح انسان کبھی غلبہ بشریت کا شکار ہو کر مادی اور نفسانی دنیا کے ضابطوں میں قید رہتا ہے اور کبھی غلبہ ملکیت کے باعث روحانی اور نورانی دنیا کے احوال و آداب سے آشنا ہوتا ہے۔ مگر نہ تو بشریت ہی اس کی حقیقت ہے اور نہ نورانیت' یہ دونوں اس کے احوال و اوصاف ہیں۔ انسانی شخصیت کی اصل حقیقت تو اس کی شان مظہریت و نیابت ہے۔ جو اس کے باطن میں بھی مخفی ہے اور اس کے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں پنہاں ہے۔ یہی اس کی ہستی کی اصل متاع ہے۔ حواس اس حالت کا ادراک نہیں کرسکتے۔ عقل کبھی کبھی دور سے اس کی نشاندہی کرتی ہے اور لطائف اکثر و بیشتر اس کی کیفیات کو محسوس کرتے ہیں۔ انسانی شخصیت کا یہ گوشہ جو مظہریت حق سے عبارت ہے۔ صرف نور حق سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا صحیح فہم انسان کی کسبی استعدادوں سے نہیں بلکہ خدا کی وہبی صلاحیتوں سے ممکن ہے۔ اس مقام کے نظروں سے اوجھل رہنے کا ذکر اقبالؒ یوں کرتے ہیں

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی | کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی' جز خود نہ بینی | تلاش خود کنی' جز او نیابی

اسی مضمون کو انہوں نے یوں بھی واضح کیا ہے۔

اگر خواہی خدارا فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیآموز

یہ وہ حقیقت انسانی ہے جہاں سے انسان کے سفر حیات کا آغاز ہوا تھا اور یہی اس کا نقطہ کمال بھی ہے۔ وہ اپنی حقیقت کے گوشے سے ذات باری تعالیٰ کے فیضان کمال کو وصول کرتا اور جذب کرتا ہے اور ملکیت اور بشریت کے سوتوں سے اسے ظاہر کرتا ہے۔ گویا انسانی حقیقت توجہاتِ الٰہی کے اثرات کی تحصیل کرتی ہے اور بشریت و ملکیت ان کی تقسیم۔ اس بنا

پر انسانی شخصیت کا ایک پہلو خالق سے وابستہ ہے اور دوسرا پہلو مخلوق سے۔ بقول

ادھر اللہ سے واصل ادھر بندوں میں بھی شامل
خواص اس برزخِ کبریٰ کو ہے حرف مشدد کا

درحقیقت انسان کی اسی حیثیت کا نام "خلافت و نیابت الٰہی" ہے۔ جہاں وہ مظہر حق ہونے کی شان سے بہرہ ور دکھائی دیتا ہے۔ جب انسان کے گوشۂ حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے اور پہلو مظہریت کو فروغ ملتا ہے تو اس کا پرتو اس کے روحانی اور بشری گوشوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی کمال کے باعث وہ عالم جن و ملک سب پر فوقیت لے جاتا ہے اور ظاہراً" ایک مشت خاک دکھائی دینے کے باوجود اشرف المخلوقات قرار پاتا ہے۔ اس قدر جامع اور ہمہ پہلو شخصیت نہ جنات کی تھی اور نہ فرشتوں کی۔ اس لئے خلافت و نیابت کے شرف کا حقدار حضرت انسان کو بنایا گیا۔ خلافت و نبوت کی استعداد اصلاً" ہر وجود انسانی میں رکھی گئی ہے لیکن اس کا ظہور صرف وجود ولایت میں ہوتا ہے وجود نبوت میں اس استعداد کو کمال نصیب ہوتا ہے۔ لیکن اس کا منتہائے کمال صرف وجود مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا شان مظہریت اور خلافت و نیابت الٰہی جس کا نقطہ آغاز حقیقت انسانی ہے۔ اس کی آخری حدِ کمال حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عرفاء کاملین کے نزدیک باری تعالیٰ کی یہ نیابت و مظہریت چار اقسام پر مشتمل ہے:۔

۱۔ نیابت و مظہریت فعلی

۲۔ نیابت و مظہریت اسمی

۳۔ نیابت و مظہریت صفاتی

۴۔ نیابت و مظہریت ذاتی

نیابت کی پہلی تین صورتیں ہر ایک کے حسب حال جملہ انسانوں، صلحاء، اولیاء اور انبیاء کو حاصل ہیں۔ جب کہ آخری صورت صرف ذات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ہے۔ اس لئے آج تک دنیا کا کوئی عارف اور ولی بھی حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

کا کامل ادراک نہیں کرسکا اور نہ ہی ذاتِ الٰہی کی طرح حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل معرفت کسی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ذات الٰہی کے فیضان سے مستفید و مستنیر ہے اور اسی کی جملہ ذاتی و صفاتی تجلیات کی مظہر اتم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابو یزیدؒ فرماتے ہیں:

"غصت لجة المعارف طالباً للوقوف علی عین حقیقة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذا بینی و بینها الف حجاب من نور لو دنوت من الحجاب الاول لا احترقت به کما تحترق الشعرة اذا القیت فی النار"

جواہر البحار ـــــ از امام النبہانیؒ جلد ۳، ۵۱ (میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت سے واقفیت کے لئے بحرِ معرفت میں غوطہ زن ہوا۔ تو میں نے اپنے اور اس کے درمیان ایک ہزار نورانی پردے حائل پائے۔ اگر میں پہلے پردے کی طرف بڑھتا تو اس طرح جل کر راکھ ہو جاتا جیسے بال آگ میں ڈالنے سے جل جاتا ہے)۔

شیخ عبدالعزیز الدباغؒ فرماتے ہیں:۔ **لو عاش سیدنا جبریل مائة الف عام الی مائة الف عام الی ما لا نهایة له ما ادرک ربعًا من معرفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم"**
جواہر البحار ۲ : ۲۸۶ (اگر حضرت جبرئیل ایک لاکھ سال زندہ رہیں۔ پھر مزید ایک لاکھ سال زندہ رہیں اور اسی طرح ان کی عمر کبھی بھی ختم نہ ہونے پائے تب بھی وہ حضور علیہ السلام کی معرفت کی چوتھائی کو بھی نہیں پاسکتے)۔ اس کی وجہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوب نمبر ۱۲۲ میں یہ بیان کی ہے۔ "حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کائنات میں سب سے پہلا ظہور اور تمام حقائق کی اصل ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے کہ تمام حقائق خواہ وہ انبیائے کرام کی حقیقتیں ہوں یا ملائکہ عظام کی، وہ سب حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہیں اور آپ کی حقیقت تمام حقیقتوں کی اصل اور سرچشمہ ہے"۔ (مکتوبات)

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ تخلیقِ آدم کے وقت چونکہ حضرت انسان کی شان نیابت و مظہریت کا ذکر ہوا جو اپنے نقطہ کمال پر حقیقت نبوی صلی اللہ

علیہ وسلم اور وجود مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر و عیاں تھی۔ اس لئے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی یاد دلائی جا رہی ہے کہ "یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب و مظہر بنانے والا ہوں"۔

علامہ آلوسیؒ اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "**فهو صلى الله عليه وسلم على الحقيقة الخليفة الاعظم فى الخلقة والا مام المقدم فى الارض والسموات العلى ولولاه ما خلق آدم ولا ولا**" (روح المعانی جلد ا ص ۱۲۸) (پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فی الحقیقت خلیفہ اعظم ہیں اور آپ ہی زمین و آسمان میں مقتدا ہیں۔ اگر آپ کی ذات اقدس نہ ہوتی تو نہ آدم علیہ السلام ہی پیدا ہوئے اور نہ کچھ اور ہوتا)

لہٰذا خلافت عظمیٰ کے اعلیٰ منصب سے اس خصوصی تعلق کی بناء پر خطاب براہ راست حضور علیہ السلام سے کیا گیا ہے۔ ورنہ بشری اور انسانی زندگی کی تاریخ میں سب سے پہلے خلیفہ تو بلا شک و شبہ حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اس مقام پر رقم طراز ہیں۔ "**والمراد بالخليفة آدم عليه السلام فانه خليفة الله فى ارضه لاقامة احكامه و تنفيذ قضاياه و هدايته عباده و جذبهم الى الله واعطائهم مراتب قربه تعالى و ذالك لا لاحتياج من الله تعالى الى الخليفة بل لقصور المستخلف عليهم عن قبول فيضه و تلقى امره بغير وسط وكذالك كل نبى بعده خليفة الله**"۔ المظہری جلد ا ص ۴۹ (اور یہاں خلیفہ سے مراد حضرت آدمؑ ہیں۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں ان مقاصد کے لئے اس کے نائب ہیں کہ وہ اس کے احکام کو قائم کریں۔ اس کے فیصلے نافذ کریں اور اس کے بندوں کو ہدایت پہنچائیں۔ انہیں اس تک رسائی مہیا کریں اور انہیں اس کے قرب کے مراتب ہمکنار کریں۔ خلیفہ و نائب مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کی کسی حاجت کے پیش نظر نہ تھا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ باقی مخلوق یعنی بنی نوع انسان کے واسطے کے بغیر نہ اس کے فیض کو براہ راست جذب کر سکتے تھے اور نہ اس کے حکم کو پا سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت

آدم علیہ السلام کے بعد ہر نبی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ و نائب تھا)۔

لہٰذا انبیائے کرام کو مخلوقاتِ عالم تک فیضِ ربانی پہنچانے اور ان کو بارگاہ الوہیت کے قرب و وصال کی لذات و آداب سے آشنا کرنے کے لئے بطور واسطہ و وسیلہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ان سے کنارہ کش ہو کر خدا تک رسائی کا تصور بالکل ناممکن ہے۔

آیت ۳۰: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ●

۲۴۔ بارگہِ الٰہی میں فرشتوں کے سوال کی حکمت۔

بعض لوگوں کو فرشتوں کے سوال سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ شاید یہ سوال (معاذ اللہ) باری تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق پر اعتراض تھا یا اس کا سبب بنی آدم سے حسد اور ان کے مقابلے میں اپنے استحقاقِ خلافت کا احساس تھا۔ حقیقت میں ان دونوں تصورات کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ ہی ان کا یہ قول باری تعالیٰ کو مشورے کی غرض سے تھا۔ کیونکہ نہ تو ذاتِ حق کسی کے مشورے کی محتاج ہے اور نہ ہی فرشتے خلافِ ادب ایسا کوئی کام کر سکتے ہیں۔ یہ سوال صرف بغرضِ استعلام و استکشاف تھا۔ یعنی فرشتے اپنی معلومات کی روشنی میں جو کچھ سمجھ رہے تھے اسے بارگاہِ ایزدی میں عرض کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے فعل کی اصل حکمت اور مصلحت و غایت سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں" اپنے استحقاقِ خلافت کا اظہار نہ تھا بلکہ محض اس لئے تھا کہ اے باری تعالیٰ! اگر تجھے اپنی تسبیح و تحمید اور تقدیس کیلئے کوئی خلیفہ و نائب بنانا مقصود ہے تو ہم پہلے ہی اس کام کو بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں پھر اس غرض کے لئے کسی نئی مخلوق کی کیا ضرورت ہے اور خاص طور پر جب کہ اس سے فساد انگیزی اور خونریزی کا بھی اندیشہ ہو۔ گویا وہ یہ عرض کر رہے تھے کہ مقصودِ خلافت تیرا ذکر و عبادت ہے تو وہ تو پہلے ہی انجام پا رہا ہے اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور مقصود ہے تو ہم پر بھی وہ مصلحت و حکمت آشکار کی جائے۔ اسی نقطۂ نظر کو اکثر آئمۂ تفسیر نے اپنایا ہے۔ جیسا کہ امام ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے۔

"یقولون یا ربنا ما الحکمۃ فی خلق ھولاء مع ان منھم من یفسد فی

الارض و یسفک الدماء فان کان المراد عبادتک فنحن نسبح بحمدک و نقدس لک" (تفسیر ابن کثیر، ۱:۶۹)

فرشتوں کے علم کی بنیاد کیا تھی؟

اسی موقع پر ایک اور سوال کیا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی تو ابھی تخلیق بھی معرضِ عمل میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی فرشتوں کو بنی آدم کے اعمالِ خیر و شر دیکھنے کا کوئی موقع ملا تھا تو انھوں نے قبل از وقت یہ کس طرح کہہ دیا کہ بنی آدم سے فساد انگیزی اور خونریزی کا صدور ہوگا حالانکہ یہ بات بھی درست تھی اور باری تعالیٰ نے جواباً انسانوں کی اس صفت کی نفی بھی نہیں فرمائی۔ اس موضوع پر غور و خوض کے نتیجے میں چند امکانات سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ ممکن ہے تخلیقِ آدم سے پہلے ہی باری تعالیٰ نے فرشتوں کو انسانی خصائص اور معمولات کا علم عطا کر دیا ہو جس کا ذکر بصراحت بیان نہیں کیا گیا اور فرشتوں نے یہ بات خود اعلانِ الٰہی کی بناء پر کی ہو۔ یہ سبب حضرت عبد اللہ عباس؄، عبد اللہ بن مسعود؄ اور چند دیگر صحابہ سے منقول ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر یہ مذکور ہے کہ باری تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اس ارادے کا بھی اظہار فرمادیا تھا کہ میں انسان کا خمیر ایسی سوکھی ہوئی مٹی سے تیار کرنے والا ہوں جو بدبودار سیاہ گارے سے بنی ہے جیسا کہ ارشادِ ایزدی ہے۔ "**وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ**" (الحجر: ۲۸) (اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدمی کو ایسی بجتی (سوکھی ہوئی) مٹی سے بنانے والا ہوں جو بدبودار سیاہ گارے سے تیار ہوئی ہے) **لہٰذا** ممکن ہے فرشتوں نے اس ہیئتِ تخلیق سے بشری طبیعت اور اس کے خواص کا اندازہ لگا لیا ہو کہ ایسے ارضی عناصر سے تشکیل اور ترتیب پانے والا وجود اپنے اندر یقیناً تخریب و فساد کا ملکہ رکھتا ہوگا۔ کیونکہ جن اخلاط سے یہ بشری طبیعت مرکب ہے۔ ان کے اندر یہ خصائص لازمی اور لابدی ہیں۔

۳۔ امام ابنِ جریر؅ نے بطریقِ ضحاک؅ حضرت ابنِ عباس؄ سے روایت کیا ہے کہ باری تعالیٰ نے سب سے پہلے زمین پر جنّات کو سکونت عطا کی۔ انھوں نے یہاں کثیر فساد انگیزی

اور خونریزی کی۔ فرشتوں کے سامنے بنی آدم کی تخلیق سے قبل زمینی مخلوق کا ایک مشاہدہ موجود تھا۔ لہٰذا انھوں نے اب بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے انسانی خونریزیوں کا اندازہ لگالیا ہوگا۔ امام قرطبیؒ اور دیگر کئی مفسرین نے اس موقف کو اپنایا ہے۔ اس کی تائید بھی ایک قرآنی آیت سے یوں ہوتی ہے۔ "**وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ**" الحجر، ۲۷ (اور جنّات کو ہم نے تخلیقِ آدم سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا) سموم کا لفظ سم سے نکلا ہے جس کے معنی زہر، آگ کا شعلہ، سخت تیز آگ اور ایسی گرم ہوا کے آتے ہیں جو جانداروں کو مار دے۔ جنّات کی سرشت میں بھی تخریب و فساد کی صفت اور قدرت کا پایا جانا ان کے طبعی اور خلقی خصائص میں سے تھا۔ اسی طرح طبیعتِ بشری میں بھی اس صفت کا موجود ہونا ان کی خلقت کا تقاضا تھا۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں بنی آدم کی فساد انگیزی کا قیاس عین ممکن امر تھا۔

۴۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں کو "منصبِ خلافت" کے تصور سے اس کا اندازہ ہوگیا ہو۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ جس کو زمین پر خلیفہ بنایا جارہا ہے وہ زمینی مخلوق کے باہمی اختلافات، نزاعات اور مظالم و فسادات کا فیصلہ کرے گا اور ان پر حکمرانی کرے گا۔ لہٰذا ایسی مخلوق پر حکمرانی کی صلاحیت و استعداد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اپنی طبیعت میں بھی خیر و شر اور نیکی و بدی کا ملکہ اور قدرت موجود ہو۔ تبھی تو اسے ان کیفیات اور احوال کا صحیح علم ہوسکے گا اور وہ ایسے معاملات کو نبٹانے کا اہل ہوگا۔ کیونکہ کسی ایسے شخص کو کسی مخلوق پر حکمرانی کا حق اور اختیار دینا جو خود اس مخلوق کے جبلی تقاضوں اور خلقی و طبعی خصائص سے نا آشنا ہو۔ کسی طور پر بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ فرشتوں نے منصبِ خلافت کے فرائض ضرورت، نوعیّت اور اس کے تقاضوں سے یہ اندازہ لگالیا کہ زمین پر قائم کئے جانے والے نئے نظام میں یقیناً فساد انگیزی اور خونریزی کا عنصر موجود ہوگا۔

۵۔ مذکورہ بالا امکاناتِ علم سارے قیاس و استنباط کی نوعیت کے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں کو یہ سب کچھ محض کشف کی بناء پر معلوم ہوگیا ہو۔ کیونکہ یہ نہایت لطیف نورانی مخلوق ہیں۔ جو کلیتاً کثافت سے پاک ہیں۔ ایسی مخلوق کو باری تعالیٰ آئندہ پیش آنے والے واقعات کو بصورت کشف جاننے کی استعداد عطا فرما دیتے ہیں۔ اولیاءِ کرام کے کشف و کرامات میں بھی یہی اصولِ لطافت و روحانیت کارفرما ہوتا ہے۔ وہ بھی تزکیہ و تصفیہ کے ذریعے اپنی بشری کثافتوں کو کم کرکے روحانی لطافت کو

اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ مستقبل کو پردۂ غیب میں رکھنے والے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور وہ باوجود بشری طبائع کے محض غلبۂ روحانیت کے باعث کشف کی استعداد سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ فرشتے پہلے ہی نورانی اور لطیف مخلوق ہوتے ہوئے ہر قسم کی کثافت سے پاک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے آئندہ کے احوال و واقعات کا مشاہدہ اور کشف کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے۔

سراسر تسبیح و تقدیس مقصودِ خلافت نہیں

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ فرشتوں کو فساد انگیزی اور خونریزی کی انسانی سرشت کا علم کس طرح ہوا۔ یہ بحث تو بعض ذہنوں میں اٹھنے والے سوال کے جواب کے طور پر قلمبند کی گئی ہے۔ فی الحقیقت توجہ طلب امر یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے فرشتوں کو سراسر تسبیح و تقدیس کا پیکر ہونے کے باوجود شرفِ خلافت و نیابت سے نہیں نوازا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے محض نور کی تخلیق ہونے کی بناء پر صرف ذکر و عبادت، تسبیح و تحمید اور نیکی و اطاعت پر قادر ہیں۔ ان میں صرف خیر کا پہلو ہے۔ وہ شر کے ارتکاب پر قدرت نہیں رکھتے۔ یعنی ان سے معاصی، نافرمانی، پیرویِٔ نفس اور راہِ حق سے عدول و انحراف کا کام سرے سے نہیں ہو سکتا۔ انکی سرشت میں سوائے اطاعتِ حق کے اور کوئی منفی صلاحیت، قوت اور استعداد رکھی ہی نہیں گئی۔ اس لئے وہ اخلاقی کمال جو زندگی میں خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان تضاد اور تصادم کے نتیجے میں خیر اور نیکی کو غالب کرنے سے عبارت ہوتا ہے، ان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اگر کسی شخص کو بدی کے ارتکاب کے مواقع اور حالات ہی میسر نہ ہوں یا اس میں وہ قوت، ہمت اور صلاحیت ہی نہ ہو جس سے وہ کوئی برائی کر سکے اور وہ اس وجہ گناہوں سے بچا رہے تو یقیناً اس کی نیکی کے مقابلے میں اس شخص کی نیکی زیادہ فضیلت کی حامل ہوگی، جسے بدی کے ارتکاب کے سارے مواقع حالات اور اختیارات میسر ہوں۔ مگر اس نے اپنے اختیار اور عزم و ارادے سے محض رضائے الٰہی کے لئے بدی کو چھوڑ رکھا ہو اور نیکی کو اپنا لیا ہو۔

یوں سمجھ لیجئے کہ فرشتوں کی مثال پہلے شخص جیسی ہے اور بنی آدم کی مثال دوسرے شخص جیسی۔ فرشتے سراسر نیکی و اطاعت کے پیکر تھے۔ چونکہ وہ بدی، گناہ اور فتنہ و فساد کے ارتکاب پر قدرت ہی نہ رکھتے تھے۔ اس لیے اخلاقی کشمکش اور اس کے

نتیجے میں اخلاقی کمال کے حصول کی صورت حال سے محروم تھے۔

بنابریں انھیں خلافت و نیابتِ الٰہی کی عظیم آزمائشی مسند عطا نہ کی گئی۔ جب کہ انسان دونوں صفات کا حامل اور دونوں قسم کے کاموں پر قادر تھا۔ اس لیے اسے آزمائش و امتحان کی عظیم مسند پر فائز کیا گیا۔ لہٰذا انسانی سرشت میں خیر و اطاعت کے ساتھ ساتھ شر و فساد کی قدرت کا پایا جانا اس کے استحقاق خلافت کے منافی نہیں بلکہ اس کی اصل بنیاد بن گیا۔ کیونکہ تمام متضاد قوتوں کا وجود ہی انسان کے حقیقی کمال کا مقتضی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بیان کرتے ہیں۔ **"الانسان لما کان مرکبا من اللطائف العشرة التی ھی اجزاء العالم الکبیر ولم یجتمع فی شئی من افرادھا الا بعضھا کان ھو اھلا للخلافۃ" و حاملا للامانۃ"** "المظہری۔ (جب انسان ان دس لطائف سے مرکب ہوا جو اس پوری کائنات اکبر کے اجزائے ترکیبی ہیں تو یہی چیز فی الحقیقت انسان کے مستحقِ خلافت اور حاملِ امانت ہونے کی بنیاد قرار پائی)

آخر میں فرشتوں کے سوال کے جواب میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہو رہا ہے۔ "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" (میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اجمالی جواب مرحمت فرمایا۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے کہ اس وجودِ خاکی میں جسے فساد انگیزی اور خونریزی کا پیکر سمجھ رہے ہو۔ ہم نے کیا کیا لطائف و خصائص اور اوصاف و کمالات رکھے ہیں، تمہیں ان کی خبر نہیں مزید یہ کہ اسکی طبیعت کے جس پہلو کو تم منافئِ شانِ خلافت سمجھ رہے ہو، درحقیقت وہی پہلو اس کے شرف و کمال اور نیابت و خلافت کی بنائے استحقاق ہے۔

اس ارشادِ الٰہی میں اس امر کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ مسندِ خلافت کا اصل مقصود، ضرورت اور اس کی حکمت و مصلحت کو میں جانتا ہوں۔ کیونکہ تمہیں اس کا علم نہیں ہے اس لیے تم صحیح طور پر اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس منصب کا اہل کون ہو سکتا ہے اور کون نہیں اور اس کی اہلیت و استحقاق کی کیا شرائط ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

آیت ۳۱-۳۲ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ●

۲۵۔ حضرت آدم علیہ السلام اور علم الاسماء کی حقیقت۔

اسماء' اسم کی جمع ہے' اس کا معنیٰ اور مفہوم سمجھنے کے لئے جلد اوّل میں تفسیر **بسم اللہ الرحمان الرحیم** (بعنوان تسمیۃ القرآن) کے تحت باب "لفظِ اسم کی معنوی حکمت" کا مطالعہ فرمایئے' اس آیتِ کریمہ میں حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔

بعض علماء نے یہاں علم الاسماء سے ملائکہ کے ناموں کا علم' بعض نے نسلِ بنی آدم کے ناموں کا علم' بعض نے لغات کا علم اور بعض نے اسماءِ الٰہیہ کا علم مراد لیا ہے' لیکن "**اَلْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**" کے الفاظ سے کسی خاص جنس یا نوع تک علم کو محدود اور مختص کرنا ثابت نہیں ہوتا' بلکہ الفاظ قرآنی سے جو کہ عموم اور اطلاق پر دلالت کر رہے ہیں' یہی ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء کا علم عطا کیا گیا تھا' جیسا کہ اکثر آئمۂ تفسیر نے بیان کیا ہے' "**المراد اسماء الخلائق**" المظہری (علم الاسماء سے مراد تمام مخلوقات کے اسماء کا علم ہے) مفسرین نے یہی مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے' "**اسم ما کان و ما یکون الی یوم القیامۃ**" بغوی' مظہری (حضرت آدم کو ان تمام اشیاء کے اسماء بتا دیئے گئے جو اس وقت تک کائنات میں معرضِ وجود میں آچکی تھیں اور قیامت تک آنے والی تھیں) حضرت عبد اللہ بن عباس' مجاہد' قتادہ' عکرمہ اور ابنِ جبیر رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ میں اس آیتِ کریمہ کے یہ معنیٰ منقول ہیں' "**علمہ اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا**"۔ القرطبی (اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء و موجودات کے نام سکھا دیئے خواہ بڑی تھیں یا چھوٹی) یہی معنیٰ خود نبی اکرم ﷺ سے مروی حدیثِ شفاعت سے بھی ثابت ہے' لہٰذا تفسیر القرآن بالحدیث کے اصول پر جب خود ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کیے گئے علم الاسماء سے مراد بلا امتیاز و تخصیص ہر شے کا علم ہے تو آخر ہمیں اسے کسی خاص جنس یا نوع سے مختص کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب اہل ایمان اکٹھے ہو کر کہیں گے' آؤ ہم بارگاہ الوہیت میں کوئی شفاعت اور سفارش کرنے والا ڈھونڈیں' چنانچہ وہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے' **"انت ابو الناس خلقک اللہ بیدہ واسجد لک ملائکتہ وعلمک اسماء کل شئی فاشفع لنا الی ربک"** (صحیح البخاری 'کتاب التفسیر) (آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں' باری تعالیٰ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو تمام اشیائے کائنات کے اسماء کا علم عطا کیا' (آپ اتنی فضیلتوں کے حامل ہیں) اس لیے آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کریں) اس وضاحت کے بعد دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ کیا حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء و موجوداتِ عالم کے صرف نام ہی بتائے گئے ہیں یا ان کی صفات اور خواص و افعال کی معرفت بھی عطا کی گئی؟ اس کا اجمالاً جواب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ارشاد "اَلْاَسْمَاءَ كُلَّهَا" سے مراد صرف اشیاء کے نام نہیں بلکہ ان تمام اشیاء کی صفات' خواص' افعال' ماہیت اور حقیقت وغیرہ سے متعلق وہ سارا ضروری علم مہیا کیا گیا' جو کسی چیز کو صحیح طور پر جاننے کے لئے مطلوب ہوتا ہے' کیونکہ جب قرآن مجید "علم" کو بنائے فضیلتِ آدمؑ اور وجہِ استحقاقِ خلافت کے طور پر بیان کر رہا ہے' تو معمولی سا فہم رکھنے والا شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ اشیاء و حقائقِ عالم کی ماہیت کو ماننے بغیر صرف ان کے خالی نام جان لینا کسی ٹھوس فضیلت اور منصبِ خلافت کی اہلیت کا باعث نہیں ہو سکتا' صرف ایسا علم ہی اس منشاءِ الٰہی کی تکمیل کا باعث ہو سکتا ہے' جس کی مدد سے روئے زمین پر خلافت و نیابتِ الٰہی کے فرائض کی کماحقہ' بجا آوری ہو سکے' اور وہ موجودات کے جملہ خصائص' احوال اور عادات کا علم ہے' اسی حقیقت کو مفسرین نے بلا اختلاف بیان کیا ہے' اس کے لئے ملاحظہ ہو "تسمیۃ القرآن" کے باب "لفظ اسم کی معنوی حکمت" کے ذیل میں عنوان "حضرت آدمؑ اور تعلیمِ اسماء کی حکمت" اور دیگر متعلقہ مباحث۔ امام راغب اصفہانیؒ نے مادہ "سماء" کے ذیل میں "الاسم" کے تحت نہایت عمدہ بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا جو علم عطا ہوا وہ اشیاء کے الفاظ و معانی اور مفردات و مرکبات سب کو حاوی تھا۔ کیونکہ کوئی شخص مسمی کو یعنی چیز اور اس کی ذات و صفات کو جانے بغیر اس کے نام کو بھی نہیں سمجھ سکتا' اس لئے

کہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے کسی چیز کا نام لے تو سننے والا فی الواقع ایک آواز ہی سن رہا ہوتا ہے' اگر سامع اس چیز سے صحیح طور پر واقف نہ ہو گا تو اس کا ذہن وہ نام یعنی آواز سن کر اس چیز کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کوئی نام سن کر یا پڑھ کر ذہن اس شئے کی طرف متوجہ نہ ہو جس کا نام لیا جا رہا ہے اور اس شئے کا نقشہ اس کی شکل و صورت' اس کی ماہیت اور اس کی خاصیت وافادیت ذہن میں نہ آئے تو نہ اس نام کے بتانے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کے سننے کا' اور نہ ہی اسے "علم الاسماء" قرار دیا جا سکتا ہے' علم الاسماء سے تو مراد ہی یہ ہے کہ کسی شے کا نام سنتے ہی اس شے کی حقیقت اور خواص وصفات سب سامنے آ جائیں' تب ہی وہ علم مفید ہے' لہٰذا اسماء کا علم' اشیاء کے کامل شعور اور معرفت کے بغیر ممکن نہیں' علم الاسماء کی حقیقت کے بیان سے ایک اور نکتہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ اگر تو یہ علم حضرت آدم علیہ السلام کو محض ایک واقعہ کے طور پر صرف اسی لمحہ کے لئے عطا ہوا تھا' جس کا ذکر فرشتوں کے حوالے سے یہاں کیا جا رہا ہے تو پھر یہ فضیلت' صحیح معنوں میں علمی فضیلت قرار ہی نہیں پا سکتی' یہ علم' بنائے فضیلت تب ہو سکتا ہے اگر یہ دائمی اور مستقل نوعیت کا ہو' عارضی' وقتی اور ہنگامی نہیں اور کسی علم کو دائمی اور مستقل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان یعنی صاحبِ علم کی ذات میں ایسا ملکہ اور نفسی صلاحیت واستعداد ودیعت کر دی جائے کہ وہ اس کی مدد سے جس وقت چاہے اشیاء وموجودات کا علم اور شعور حاصل کر سکے' اسے ایسے حسی' ذہنی اور باطنی ذرائع عطا کر دیئے جائیں کہ وہ ان کے ذریعے حقائقِ عالم کی نقاب کشائی کر سکے' اسی استعدادِ علم کی بناء پر اسے دوسری مخلوقات پر شرف وکرامت نصیب ہو سکتی ہے' درحقیقت انسان کو اسی استعدادِ علم ومعرفت کے عطا کیے جانے کا یہاں بیان ہو رہا ہے۔

علم الاسماء کی اسی حقیقت کا ذکر قاضی بیضاوی" ان الفاظ میں کرتے ہیں: "انہ تعالٰی خلقہ من اجزاء مختلفۃ وقوی متباینۃ مستعدا لادراک انواع المدرکات من المعقولات' والمحسوسات' والمتخیلات والموھومات' والھمہ ذوات الاشیاء وخواصھا واسمائھا واصول العلوم وقوانین الصناعات وکیفیۃ آلاتھا" (البیضاوی) (اور اللہ تعالٰی نے نفس انسانی کو مختلف اجزاء اور متفرق قوی سے پیدا کیا' اور اس میں یہ صلاحیت واستعداد رکھی کہ وہ طرح طرح کے

مدرکات کو، خواہ وہ عقل سے جانے جاسکتے ہوں یا حواس سے، تخیل سے یا قوت واہمہ سے، اپنے علم میں لاسکے۔

مزید بر آں اللہ تعالیٰ نے مختلف اشیاء کی ماہیت، ان کے خواص وصفات، ان کے اسماء، علم وادراک کے اصول وضوابط، مختلف صنعتوں کے قوانین اور آلات وذرائع کی کیفیات وغیرہ کی معرفت اس کے دل میں القاء کردی۔

فرشتوں سے اشیاء کے اسماء کی نسبت سوال کرنا

ان الفاظ سے مذکورہ بالا گفتگو کی خوب تشریح ہو جاتی ہے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں کے سامنے باری تعالیٰ نے اشیاء کو ہی پیش کرکے سوال کیا کہ ان کے نام بتا دو، اشیاء کے اسماء پیش کرنے کا تو کوئی معنی ہی نہیں "**اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ**" میں مشار الیہ، مسمیات یعنی اشیاءِ عالم ہیں کہ ان اشیاء کے، جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں، نام بتا دو، جس پر انھوں نے عجز کا اظہار کیا، اس حصہ آیت نے وضاحت کر دی کہ یہاں "علم الاسماء" سے مراد قطعی طور پر "علم المسمیات" یعنی علم الاشیاء ہے، نہ کہ محض ناموں کا علم، کیونکہ وہ نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ کوئی افادیت۔

دوسرا غور طلب پہلو یہ ہے کہ فرشتوں کے سامنے اشیاء عالم کو کس طرح پیش کیا گیا، اس کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ تمام اشیاء کی صورتوں کو ان کے سامنے منکشف کردیا۔

باری تعالیٰ نے اپنی قدرت سے قرب وبعد، ماضی ومستقبل اور حضور وغیب کے سب پردوں کو اٹھا دیا اور فرشتوں نے سب اشیاء وموجودات کو اپنی آنکھوں کے سامنے عیاں دیکھ لیا۔

دوسرے یہ کہ فرشتوں نے تمام اشیاء کو چشمِ تصور سے تمثالِ ذہنی کی مانند دیکھا، جیسے کسی کے دل پر کسی چیز کا خیال گزرتا ہے اور وہ اسے تصوراتی طور پر دیکھ اور پہچان لیتا ہے، یہ بھی باری تعالیٰ کا تصرف تھا کہ اس نے گزشتہ اور آئندہ حقائق کو ملائکہ کی چشم تصور میں موجود کردیا۔

تیسرے یہ کہ تمام اشیاء کا فرشتوں پر پیش کیا جانا ان کی مثالی صورت میں تھا، یعنی عالمِ مثال میں اشیاء وموجودات کی جو شکل وصورت عطا کی گئی تھی یا کی جانے والی

تھی' فرشتوں پر ظاہر کر دی گئی' صورت مثالی یا تمثل کا ثبوت کئی احادیث مبارکہ سے ملتا ہے' صوفیاء و عرفاء نے بڑی کثرت سے اس کا ذکر کیا ہے اور علماء و مفسرین نے اس تصور کا ثبوت بعض قرآنی آیات و واقعات سے بھی فراہم کیا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا تینوں صورتیں ممکن اور درست ہیں' ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے کونسی صورت کو اپنایا گیا' قابل توجہ بات صرف یہ ہے کہ تمام اشیاء ملائکہ پر پیش کی گئیں اور انہیں یہ حکم ہوا کہ اگر تمہارا خیال اور استعجاب درست ہے کہ بنی آدم کو کس طرح شرف خلافت سے سرفراز کیا جا رہا ہے تو ہم تم دونوں سے ایک ہی امتحان لیتے ہیں۔ پہلے فرشتو تم ہی بتاؤ کہ ان اشیاء و موجودات کی حقیقت و ماہیت' خواص و صفات اور ضوابط و افعال کیا ہیں؟

پھر ہم یہی سوال آدم سے بھی کریں گے جسے محض ایسی مشت خاک تصور کر رہے ہو جس سے صرف فتنہ و فساد کا ظہور ہو گا تاکہ تم پر یہ حقیقت اور حکمت و مصلحت از خود آشکار ہو جائے کہ منصب خلافت کی اہلیت کیا ہے اور آدم میں وہ کونسی امتیازی خوبی رکھی گئی ہے' جس کے باعث اسے خلافت و نیابت کا مسند نشیں بنایا جا رہا ہے۔

فرشتوں کا جواب اور اس کی تعلیمی اہمیت ۔

اس پر فرشتوں نے یہ کہتے ہوئے اعترافِ عجز کر لیا کہ "باری تعالیٰ ہم ان اشیاء کے علم سے بہرہ ور نہیں ہیں' ہمیں تو مختلف امور میں اسی قدر علم حاصل ہے' جو تو ہمیں اپنے اپنے امور کی انجام دہی کے لئے عطا کرتا ہے' کیونکہ علم کا مالک بھی تو ہے اور کسی کو دینے یا نہ دینے کی حکمت سے آگاہ بھی تو ہی ہے' نہ تیرا کوئی کام بے عملی کے باعث ہو سکتا ہے اور نہ خالی از حکمت' تو اس بات سے بالکل پاک اور بلند تر ہے کہ کوئی تیرے فعل میں شک کر سکے"۔

اگر آپ فرشتوں کے اس جواب پر غور کریں تو آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ بارگاہِ الوہیت میں کس قدر پیکرِ ادب بن کر رہتے ہیں' ان کے جواب کا ایک ایک لفظ ہمیں حضورِ باری تعالیٰ میں گفتگو کا ادب اور قرینہ سکھا رہا ہے۔

در حقیقت اس آیت کی یہی تعلیمی اور تربیتی اہمیت ہے' جس کی طرف ہم نے بہت کم توجہ کی ہے' یہاں فرشتوں کے طرزِ عمل سے ایک اور تربیتی پہلو کی بھی نشاندہی

کی گئی ہے کہ اگر کسی چیز کا علم نہ ہو تو بجائے ظن و تخمین سے جواب دینے کے صاف لفظوں میں اعترافِ عجز کر لینا عظمت و شرافت کی دلیل ہوتی ہے۔

اس لاعلمی کے اعتراف سے انسان کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر اپنی تکمیل کا جذبہ و داعیہ مزید بیدار ہوتا ہے، بعض لوگ لاعلمی کے باوجود انکل پچو سے بات کر کے اپنی علمیت کا مصنوعی بھرم قائم رکھنا چاہتے ہیں، یہ عادت آدابِ علم کے خلاف ہے۔

درحقیقت اپنی لاعلمی اور عجز کا شعور و ادراک بھی علم ہے، کیونکہ مخلوق کا کمالِ علم بے خبری ہی ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا

آدابِ علم کا یہی اصول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، **"العجز عن درک الادراک ادراک"** (مکتوبات مجدد الف ثانیؒ ۳: ۷: ۲۴) (علم کو پالینے سے عاجزی کا اعتراف ہی حقیقی علم ہے)

آیت ۳۳: قَالَ يٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ●

۲۶- حضرت آدمؑ کی علمی عظمت اور فلسفہ تضاد و جدال کی قرآنی اصل۔

جب فرشتے بارگاہ ایزدی میں اپنے عجز کا اعتراف کر چکے تو باری تعالیٰ نے انھیں حضرت آدم علیہ السلام کی علمی برتری کا اس طرح مشاہدہ کرایا۔ یہ مشاہدہ فرشتوں کے لئے ایک ایسی تجربی توثیق (Experimental Verification) کا درجہ رکھتا تھا جس کے بعد حضرت آدم کی علمی فضیلت اور اس کی بناء پر ان کے استحقاقِ خلافت کی نسبت کسی شک وشبہ اور حیرت واستعجاب کی گنجائش نہ رہی۔ اس واقعے کے ذریعے فرشتوں پر اس حقیقت کو آشکار کرنا مقصود تھا کہ بنی آدم کے اندر صرف خونریزی اور فساد انگیزی کا ہی ملکہ موجود نہیں ہے بلکہ اسے علم و شعور کی وہ استعداد بھی عطا کی گئی

ہے جس کے باعث وہ کائنات کی تکوینی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اچھائی اور برائی میں واضح امتیاز کر سکتا ہے اور اشیاءِ عالم کو اپنے تصرف میں لا کر ان کے خواص وافعال کو جاننے کی وجہ سے انہیں نیک وبد مقاصد کے حصول کے لئے استعمال بھی کر سکتا ہے اس کے اسی علم و آگہی اور شعور و معرفت کی بناء پر ہم نے اسے کرۂ ارضی کی خلافت عطا کی ہے۔ کیونکہ وہ خیر و شر کی دونوں قوتوں اور ان کی خاصیتوں سے شناسا ہے۔ اس لیے وہ ان سے نہایت کامیابی کے ساتھ نمٹ سکتا ہے۔

جنگ و جدال کی استعداد اور علم و آگہی کی خوبی۔

اگر انسان اپنے اندر صرف جنگ و فساد کا ملکہ اور قدرت رکھتا، علم و شعور اور عالم انفس و آفاق کے تکوینی اسرار سے بہرہ ور نہ ہوتا، تو پھر اسے فتنہ و ظلم کا منبع قرار دیا جا سکتا تھا۔

بنا بریں اسے خلعتِ نیابت سے بھی ہرگز نہ نوازا جاتا۔ مگر اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے علم و آگہی اور کمالِ عرفان نے اس کی جنگ وجدال کی استعداد کو مطلقاً منفی استعداد نہیں رہنے دیا۔ یہ استعداد، علم کے زیرِ سایہ نہ صرف ایک مثبت خوبی بلکہ شخصیت کے استحکام کی بنیاد بن گئی ہے۔ اسی استعداد کے باعث انسان دنیا میں شر کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوگا، اسی کے باعث وہ دنیا سے فتنہ و ظلم کے استیصال کے لئے انقلابی جدوجہد کرے گا اور اسی کے باعث وہ اعلائے کلمۂ حق کے لئے تمام باطل طاغوتی طاقتوں کے خلاف جان کی بازی لگائے گا۔

خون ہمیشہ باطل مقصد کے لئے تو نہیں بہا کرتا۔ یہ دنیا کے اندھیروں میں شمعِ حق روشن کرنے کے لئے بھی بہا کرتا ہے اور پھر کارگہِ حیات میں انسانی اقدار کی حفاظت اور فروغ کی کونسی جدوجہد ایسی ہے جو جان کی قربانی کے بغیر منزلِ مقصود کو پالے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر خون، حق و باطل کی تمیز کے بغیر بہے تو وہ خون ریزی میں شمار ہوگا اور اگر اس تمیز کی بناء پر بہے تو "جہاد فی سبیل اللہ" کہلائے گا۔

اسی لئے باری تعالیٰ نے یہ فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ" (النساء ۴:۷۶)

(اہل ایمان، اللہ کی راہ میں خون بہاتے ہیں اور اہل کفر طاغوت کی راہ میں خون

بہاتے ہیں)۔

چنانچہ طبیعت میں یہ خوبی اصلاً موجود ہو تو وہ کسی بھی سمت میں استعمال ہو سکتی ہے۔ لیکن سرے سے یہ خوبی اور ہمت موجود ہی نہ ہو تو شخصیت دائمی طور پر ناقص رہ جاتی ہے اور جن مقاصد کا حصول یا اقدار کا تحفظ' شجاعت' قربانی اور جان کی بازی پر منحصر ہوتا ہے' وہ سب کام تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس جوہر کا وجود شجاعت سے عبارت ہے اور فقدان بزدلی سے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت جو عالمگیر سطح پر غلبۂ حق کی جدوجہد سے عبارت تھی' عرب کی اس قوم میں ہوئی جو خونریزی اور جنگ وجدال میں تاریخی اور مثالی شہرت کی حامل تھی۔ کیونکہ شجاعت' قربانی اور جان کی بازی لگانے کا جوہر تو فی الواقع ان میں پہلے ہی سے بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اب انہیں صرف حق وباطل اور خیر وشر کے امتیاز کا شعور عطا کر کے اعلیٰ مقصد کی سمت لگانے کی ضرورت تھی۔ جو ہدایتِ مصطفوی ﷺ سے کماحقہ پوری ہو گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحرائے عرب کے ان جاں نثارانِ اسلام نے حق کی خاطر جس سرفروشی ووفاداری' اخلاص ومحبت اور کیف ومستی کے عالم میں جامہائے شہادت نوش کیے۔ اس کی مثال چشمِ فلک نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ یہ انہی قربانیوں کا ثمر ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود' آج کے دور کا گیا گزرا مسلمان بھی خدا اور رسول کے نام پر سر کٹوانے کو تیار ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ موت سے ڈرنا اصل موت ہے اور اسے بے خطر قبول کرنا اصل زندگی ہے۔ جب تک اہلِ اسلام اس فلسفہ زندگی پر کامل ایمان کے ساتھ جئیں گے وہ عزت سے زندہ رہیں گے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کردیں گے تو ذلت کی موت پائیں گے۔ باری تعالیٰ نے فرشتوں کو انسانی علم و آگہی کا ایک نظارا کرا کے یہ باور کرا دیا کہ کرۂ ارض کی خلافت کا سزاوار انسان ہی ہے اور اس کے اندر خونریزی کی جو صفت تمہیں ایک منفی استعداد دکھائی دے رہی ہے۔ اس میں بہت سی عظمتیں اور راز پنہاں ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ جو کچھ تم پر ظاہر ہے مجھے بھی وہ تو بہرحال معلوم ہی ہے لیکن میری نظر اس کے علاوہ ان حقیقتوں اور حکمتوں پر ہے جو تم سے مخفی ہیں۔ اس پر فرشتوں نے اپنا سرِ تسلیم بارگاہِ ایزدی میں خم کر دیا۔

فلسفہ تضاد و جدال کی اصل قرآن ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ انسانی زندگی اور اس کی تاریخ میں تضاد و جدلیات کے فلسفے کا کتنا دخل ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے۔ جس کی نشاندہی کائناتِ انسانی کے آغاز پر فرشتوں نے سب سے پہلے کلام کے طور پر کی۔ ان کے پیشِ نظر اس حقیقت کی منفی توجیہہ تھی اور اسی کو باری تعالیٰ نے علم و شعور کے حوالے سے مثبت توجیہہ کے ساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اس قرآنی فلسفے پر باقاعدہ گفتگو تو انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ فلسفۂ تضاد وجدلیات، اس کی فکری و عملی اہمیت اور ماحولِ حیات کے ارتقاء میں اس کے کردار وافادیت کا سب سے پہلا تعارف قرآن نے کرایا ہے۔ کسی اشتراکی فلسفی نے ہرگز نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تفصیلات کے درجے میں "فلسفۂ تضاد" کی قرآنی توجیہہ اور ہے، اور اشتراکی توجیہہ اور۔

آیت ۳۴ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ●

۲۷۔ حضرت آدمؑ کے لئے سجدہ کی حقیقت اور تکریم نبوت کی اہمیت

سجدہ کے لغوی معانی عاجزی، تواضع، خضوع، تذلل، فرمانبرداری اور جھکنا کے ہیں۔ مفرداتِ امام راغبؒ، قاموس، لسان العرب اور تفسیر القرطبی وغیرہ میں قرآنی ادب اور کلامِ عرب کے حوالے سے اس کی خاصی وضاحت موجود ہے۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس کا معنیٰ **"وضع الجبهة علی الأرضِ"** (پیشانی کا زمین پر رکھ دینا) ہے۔ سجدے کی شرعی نقطۂ نظر سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ سجدۂ عبادت۔ کسی کو معبود جان کر عبادت کی نیت سے سجدہ کرنا۔

۲۔ سجدۂ تحیۃ (تعظیمی)۔ کسی کو معبود نہ سمجھا جائے مگر صرف اس کی تعظیم و تکریم کے خیال سے سجدہ کرنا۔

۳۔ سجدۂ توجہ۔ کسی کو صرف قبلہ تصور کرتے ہوئے، اس کی طرف منہ کر کے، باری تعالیٰ کو سجدہ کرنا۔ جیسے خانہ کعبہ کی طرف سجدہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ سجدۂ توسل۔ کسی کو صرف اس خیال سے سجدہ کرنا کہ اس کی وساطت سے یہ سجدہ بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گا اور اس طرح قربِ الٰہی حاصل ہو گا۔ جیسا کہ کفار و مشرکینِ مکہ خود بھی بتوں کی عبادت کے نامعقول فعل پر اندر سے نادم و شرمندہ تھے۔ مگر اپنے اس کفر و شرک کو چھپانے کے لئے توجیہہ اور صفائی کے طور پر مسلمانوں سے یہ کہتے تھے۔ "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" (الزمر: ۳) (ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔)

گویا وہ اپنے سجدوں کو "سجدۂ توسل" سے تعبیر کرتے تھے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو پہلی قسم کا سجدہ شروع سے آج تک ہر شریعت میں کفر اور شرک رہا ہے۔ اس کا جواز کبھی بھی موجود نہ تھا۔ اس لیے عبادت کی نیت سے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے سے انسان کافر و مشرک ہو جاتا ہے۔ بقیہ تینوں قسموں کے سجدے شریعتِ محمدی ﷺ میں حرام ہیں۔ مگر کفر و شرک نہیں۔ لہٰذا کسی کو محض تعظیم، توجہ یا توسل کی نیت سے بھی سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں توجہ کے لئے صرف کعبۃ اللہ کو مخصوص کیا گیا ہے۔

پہلی بعض شریعتوں میں کسی کو تعظیم یا توجہ کی نیت سے سجدہ کرنا جائز تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے بھی منع فرما دیا۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ سجدے کے لئے مواضع سجود یعنی "پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں" کا بغیر کسی عذر کے زمین پر لگنا ضروری ہے۔ ورنہ عملِ سجدہ مکمل نہیں ہوتا۔ محض کسی مقدس مقام کا بوسہ لینے کے لئے جھکنا ہرگز سجدہ نہیں کہلاتا۔ کیونکہ بوسے میں نہ مواضع سجود زمین پر لگتے ہیں اور نہ سجدے کی نیت ہی ہوتی ہے اور حدیثِ رسول ﷺ کے مطابق اعمال کا اعتبار صرف نیت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا بلاجواز ایسے عمل کو جو کہ محبت، تبرک اور ہر خیال سے جائز اور مشروع ہے، کفر و شرک ٹھہرانا بہت بڑی جسارت اور زیادتی ہے۔ آئمۂ شرع نے سجدہ کی تعریف بھی یوں کی ہے۔ "**وضع الجبهة على الارض قصد العبادة والمامور به**" (البیضاوی) (عبادت اور تعمیلِ حکم کی نیت سے پیشانی زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے)۔ البتہ کسی مقام کا بوسہ بھی اس ہیئت سے نہ کیا جائے کہ تمام مواضع سجود زمین پر لگ جائیں۔ ہرچند کہ نیتِ سجدہ نہ ہونے کی بنا پر، یہ عمل "**سجدة للغير**" بالکل تصور نہ ہو گا۔ اس لیے شرعاً تو اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی۔ مگر ظاہراً شکل

وصورت اور ہیئت وکیفیت میں سجدے سے مماثلت ضرور ہوجائے گی۔ جس سے عوام میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی احتیاط بہتر ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کس غرض سے کیا گیا؟

جب اشیاء عالم کے اسماء وخواص کے علم ومعرفت کی وجہ سے فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی برتری' شرف وعظمت اور فضیلت مسلم ہوگئی تو اس کے اعتراف اور اظہار کے لئے باری تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم صادر فرمایا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔

مفسرین نے عام طور پر اس سجدے کی تین توجیہات کی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ حکم سجدے کے معروف شرعی معنی میں نہ تھا۔ بلکہ لغوی معنی کے لحاظ سے تھا۔ جس سے مراد یہ تھی کہ تم آدم کی تعظیم وتکریم بجالاؤ۔ اس کے سامنے اپنی عاجزی اور تواضع کے اظہار کے لئے جھک جاؤ اور اس کی خدمت وفرمانبرداری اختیار کرو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے "**کان ذالک انحناء ولم یکن خرورا علی الذقن**" (المدارک) (یہ صرف جھکنا تھا' پیشانی کو زمین پر رکھنا نہ تھا) امام آلوسیؒ نے بھی لکھا ہے۔ "**ولم یکن فیہ وضع الجباہ بل کان مجرد تذلل وانقیاد**" (روح المعانی) (اس میں پیشانی زمین پر نہ رکھی گئی تھی۔ بلکہ صرف جھکنا اور اطاعت مراد لی گئی تھی)

دوسرے یہ کہ یہ حکم معروف شرعی معنی کے لحاظ سے باقاعدہ سجدے کا تھا۔ جس میں پیشانی بھی زمین پر لگائی گئی۔ لیکن یہ سجدہ توجہ تھا۔ کیونکہ سجدہ عبادت تو ذات باری کے سوا کسی اور کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی حیثیت قبلہ کی تھی اور فرشتوں نے حکم الٰہی کی تعمیل میں حضرت آدمؑ کی طرف منہ کرکے باری تعالیٰ کا سجدہ ادا کیا۔ اس لحاظ سے "**اسجدوا لآدم**" کے حکم کا معنی یہ ہوا کہ "**اسجدوا الی مستقبلین وجہ اٰدم**" (القرطبی) (اے فرشتو! آدمؑ کی طرف چہرہ کرکے' مجھے سجدہ کرو) اور یہ اس لیے کہا گیا کہ "**کان اٰدم کالقبلۃ**" اور آدمؑ اس سجدہ میں فرشتوں کے قبلے کی مانند تھے)

اس موقف کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اگر حضرت آدمؑ کی طرف قبلہ توجہ کے طور پر سجدہ کیا جانا مان لیا جائے تو پھر فرشتوں کا اعترافِ فضیلتِ آدم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ مسجود الیہ' ساجد سے افضل ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ قبلہ

توجہ (جسے مسجود الیہ کہتے ہیں) کے مقابلے میں سجدہ کرنے والا خود زیادہ فضیلت اور بزرگی کا حامل ہو جیسا کہ کعبۃ اللہ مسجود الیہ تھا اور نبی اکرم ﷺ خود اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے تھے حالانکہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تو درکنار آپ کے مزارِ اقدس میں جسد اطہر سے مس ہونے والی خاک کے ذرات بھی کعبۃ اللہ سے افضل اور اشرف ہیں۔ بلکہ حضور علیہ السلام نے اپنی امت کے مومنین کا درجہ بھی عند اللہ کعبہ مکرمہ سے بلند قرار دیا ہے لہٰذا سجدہ توجہ کی دلیل سے فرشتوں پر آدم علیہ السلام کی فضیلت متحقق نہیں ہوتی۔ صرف حکم الٰہی کی تعمیل ہوتی ہے جبکہ سجدے کا حکم ہی سرے سے حضرت آدم کی علمی فضیلت و کرامت کے اعتراف کے طور پر دیا گیا تھا۔ آئمہ تفسیر نے یہ صراحت سے لکھا ہے "**ان ادم افضل من ہولاء الملائکۃ" لانہ اعلم منہم والا علم افضل لقولہ تعالٰی ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون لما انباء ہم بالاسماء وعلمہم مالم یعلموا امرہم بالسجود لہ اعترافا بفضلہ واداء حقہ اعتذارا عما قالوا فیہ**" (البیضاوی) (بیشک آدمؑ ان تمام فرشتوں سے افضل تھے کیونکہ وہ ان سے زیادہ صاحبِ علم تھے اور زیادہ صاحبِ علم باری تعالٰی کے ارشاد کے مطابق دوسرے سے افضل ہوتا ہے فرمایا "کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟" چنانچہ جب آدمؑ نے فرشتوں کو اشیاء کائنات کے اسماء بتا دیئے اور اس طرح انہیں وہ کچھ بتا دیا جو وہ نہ جانتے تھے تو باری تعالٰی نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرتِ آدمؑ کو ان کی فضیلت کے اعتراف ، ان کے حقِ بزرگی کی ادائیگی اور جو کچھ انہوں نے تخلیقِ آدمؑ کی نسبت کہا تھا' اس کی معذرت کے طور پر' سجدہ کریں)

بنا بریں یہ خیال درست نہیں کہ سجدہ فی الحقیقت باری تعالٰی کو کیا گیا اور حضرت آدم کی حیثیت درمیان میں محض قبلے کی تھی۔ اس سے محض منشاءِ ایزدی' جو کہ اظہارِ فضیلت آدمؑ سے عبارت تھی' کی تکمیل نہیں ہوتی۔

تیسرے یہ کہ یہ سجدۂ تعظیم تھا اس سے واضح طور پر منشاءِ ایزدی کی تکمیل ہو جاتی ہے کیونکہ تعظیمی سجدہ کا معنی ہی یہ ہے کہ سجدہ کرنے والا مسجود لہ کی فضیلت و کرامت کا اعتراف کر رہا ہے امام قرطبیؒ نے اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کیا ہے "**کان ذالک السجود تکریما لادم واظہارا لفضلہ**" (یہ سجدہ حضرت آدمؑ کی تکریم و تعظیم اور اظہارِ فضیلت کے لیے تھا)۔ امام ابن جریرؒ نے لکھا ہے "**تکرمۃ لادم**" کہ حضرت

آدم کی تکریم بجالانے کے لئے سجدہ کیا گیا۔ اسی طرح صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں۔ "کان ذالک سجود تعظیم و تحیۃ لاسجود عبادۃ" (یہ سجدہ تعظیم تھا' سجدہ عبادت نہ تھا)

یہی موقف درست ہے۔ قرآن مجید کا سیاق وسباق بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ مزید برآں جب باری تعالیٰ نے شیطان سے آدم کو سجدہ نہ کرنے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ"۔ (الاعراف: ۱۲) (میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا)۔ شیطان کا یہ جواب' حضرت آدمؑ کی فضیلت اور برتری کے انکار پر مبنی ہے اس کا منشاء یہ تھا کہ جب میں اسے اپنے مقابلے میں افضل اور بزرگ وبرتر تسلیم نہیں کرتا' تو سجدہ کیسے کروں؟ اس سے واضح ہو گیا کہ حکمِ سجدہ' حضرت آدمؑ کی فضیلت وبرتری کے اعتراف اور انکی تعظیم وتکریم کے اعلان کے طور پر تھا۔ مقصود اس حقیقت کا اظہار تھا کہ قیامت تک جو لوگ شانِ نبوت کی تعظیم وتکریم بجالانے میں فرشتوں کی طرح کوئی پس وپیش نہیں کریں گے اور ہمیشہ دہلیزِ نبوت ورسالت پر ادباً واکراماً جھکے رہیں گے انہیں بارگاہِ الٰہی میں قرب ومنزلت عطا کی جائے گی۔ اور جو لوگ شانِ نبوت کی تعظیم وتکریم بجالانے میں شیطان کی طرح پس وپیش کریں گے اور اعتراض وتنقید کی راہ اپنائیں گے وہ ہمیشہ کے لئے بارگاہ الٰہی سے دھتکار دیے جائیں گے تنقیصِ رسالت کے بعد نہ ان کا عقیدۂ توحید مقبول رہے گا اور نہ ان کی عبادات وطاعات مقبول ہونگی۔

آیت: ۳۷۔ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡهِ

۲۸۔ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسل سے قبول ہوئی

اس مقام پر معروف قول تو یہی ہے کہ وہ کلمات یہ تھے۔ "رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ" (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے) مگر طبرانی' حاکم' ابو نعیم اور بیہقی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے مرفوعاً" مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی فکر توبہ میں ہی تھے کہ اس عالم اضطراب میں آپ کو یاد آیا کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت عرشِ مُعلّی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا دیکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں جو مقام حضرت محمدؐ کو حاصل ہے کسی اور کو میسر نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے عرش پر اپنے نام کے ساتھ ان کا اسم گرامی لکھا ہوا ہے اس پر آپ نے دعا میں مذکورہ بالا کلمات توبہ کے ساتھ ان کلمات توسل کا اضافہ کرکے عرض کیا "اسئلک بحق محمد ان یغفرلی" (اے اللہ میں حضرت محمدؐ کے واسطے سے اپنی معافی کا تجھ سے سوال کرتا ہوں) ابن منذر کی روایت میں یہ کلمات درج ہیں۔ اللّٰھم انی اسئلک بجاہ محمد عبدک و کرامتہ علیک ان تغفرلی خطیئتی" (اے اللہ میں تجھ سے تیرے محبوب بندے حضرت محمدؐ کی عزت و مرتبت کے واسطے سے اور اس بزرگی کے وسیلے سے جو انہیں تیری بارگاہ میں حاصل ہے، معافی چاہتا ہوں) چنانچہ ان کلمات کے عرض کرنے سے آپ کی توبہ قبول ہوگئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "واقعتہ" "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے تمام مخلوق سے زیادہ محبوب ہیں تم نے ان کے واسطہ سے مجھ سے درخواست کی ہے میں نے تمہاری مغفرت کی اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں تمہیں بھی پیدا نہ کرتا' اور طبرانی کی روایت میں مزید یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ تمہاری اولاد میں سب انبیاء سے آخری نبی ہیں"

بیہقی نے اسے دلائل میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی روایت سے لیا ہے امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ بہت سے علماء مفسرین اور محدثین نے اپنی کتب میں اس واقعے کو اور ان کلمات توسل کو بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ ان میں اور پہلے بیان کئے گئے کلمات پر مبنی روایات میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ یہ کلمات بھی اسی دعا کا اضافی حصہ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ اور واسطہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنا سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور یہ وسیلہ قبولیت دعا

کے لئے نہایت مبارک ہے۔

امام قسطلانی نے حضرت آدمؑ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسل سے دعا کرنا المواہب میں احادیث سے ثابت کیا ہے محدث ابن جوزی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الوفا باحوال المصطفیٰ کے پہلے باب میں انہیں جمع کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی نے نشر الطیب کی دوسری فصل کا آغاز ہی انہی احادیث کے بیان سے کیا ہے حتی کہ حضرت آدمؑ کو حضرت حوا سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے وقت بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھنے کا حکم دیا گیا اور اسی کو اس عقد میں وسیلہ بنایا گیا۔ اسے امام جوزی رحمتہ اللہ علیہ نے "صلوۃ الاحزان" میں بیان کیا ہے اور امام صاوی نے اپنی تفسیر "حاشیہ الجلالین" میں لکھا ہے کہ "**انما هو ليظهر قدر محمد صلى الله عليه وسلم لادم من اول قدم اذ لولا ما تمتع بزوجته فهو الواسطة لكل واسطة حتى آدم** "یہ حکم اس لئے تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت پہلے ہی قدم پر حضرت آدم پر آشکار ہو جائے اور وہ جان لیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ ہوتے تو انہیں نعمت زوجیت بھی نہ ملتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہر واسطہ کے لئے حقیقی واسطہ ہیں حتی کہ آدم علیہ السلام کا بھی۔"

آیت : ۴۰۔ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ

۲۹۔ بنی اسرائیل سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے وعدہ پر جنت کا وعدہ کیا گیا۔

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کے ایفاء کا حکم دیا جا رہا ہے' تم میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا' یہ وعدہ بالعموم تو ایمان و اطاعت کا وعدہ ہے۔ مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد حضور پر ایمان لانے اور آپ کی تصدیق و اتباع اختیار کرنے کا وعدہ ہے۔ اسے امام

ابن جریر نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے کلبی سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے نبی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ وعدہ لیا تھا اور اس کے جواب میں ان سے بخشش و جنت کا وعدہ فرمایا تھا۔ یہ درحقیقت اس وعدۂ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا بیان تفصیل سے سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۶، ۱۵۷ میں موجود ہے۔ (اس مقام کا بغور مطالعہ فرمائیں تمام ائمہ تفسیر نے یہاں وعدۂ الٰہی کو شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق قرار دیا ہے۔ مدارک، بیضاوی اور دیگر کتب تفسیر اس امر پر شاہد ہیں۔ اکثر نے تو وعدے سے مراد فقط حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ایمان ہی لیا ہے جیسا کہ جلالین وغیرہ میں ہے۔

آیت: ۴۱- وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا

۳۴- یہود کی کمالاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انکار پر سرزنش

"اس حکم میں کہ میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے نہ بیچو"

آیات سے مراد بھی صفات و کمالات محمدی کا بیان لیا گیا ہے جو تورات میں تھا۔ بغوی، خازن اور جلالین سب میں اس امر کی تصریح ہے، حتی کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنَ" میں بھی یہی حکم ہے کہ "میرے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے معاملے میں مجھ سے ڈرا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی شان کے بیان میں کمی یا بخل کرو اور میں تمہیں اپنے غضب کا نشانہ بنا ڈالوں"

یہاں سے معلوم ہوا کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت سے معاملات میں اپنے بندوں سے درگزر فرمالیتے ہیں مگر اپنے حبیب سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان اقدس میں بے ادبی، گستاخی حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے بیان میں کمی بھی ہرگز گوارا نہیں فرماتے یہ اللہ تعالیٰ کی غیرت محبت کے منافی ہے۔

آیت : ۴۲ ۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

۴۱۔ شانِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حق سے اور چھپانے کو کتمانِ حق سے تعبیر کیا گیا

اس آیت مبارکہ میں تعلیم عمومی کے لئے تو حق سے مراد ہر قسم کی سچائی ہے ہی مگر سیاق و سباق اور اس بیان کے خصوصی پس منظر کے حوالے سے یہاں بھی حق کا معنی شان محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا گیا ہے۔

اور یہود کو ان کے مخصوص طرز عمل کی بنا پر کہا جا رہا ہے کہ نہ تو حق کو غیر حق سے خلط ملط کیا کرو اور نہ ہی حق یعنی شان محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کو جو کمال وضاحت و صراحت کے ساتھ خود تمہاری کتابوں میں آیا ہے' چھپایا کرو' تفسیر ابن عباس' بغوی' قرطبی' خازن' مدارک' روح المعانی' جلالین' المظہری وغیرہ الغرض تمام کتب تفسیر میں اس امر کی تصریح ہے۔ گویا یہاں شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باری تعالیٰ نے حق کے لقب سے نوازا ہے اور اسے نظر انداز کرنے کو کتمان حق سے تعبیر فرمایا ہے۔

آیت : ۷۶ ۔ قَالُوٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

۴۲۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت اور شان کو چھپانا یہودی ذہنیت کا خاصہ ہے

اس مقام پر شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پہلو کا ذکر ہے جس کا بیان آیات ۴۰،۴۱،۴۲ کے تحت پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور شان اقدس کے بیان کو مسلمانوں سے چھپانے والے یہودیوں کو یہ بھی علم تھا کہ قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کے حوالے سے پوچھا جائے گا۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اگر ہم آج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس کا برملا بیان کر بیٹھے تو پھر قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے پائیں گے۔ یہاں علماء یہود کی

خاص ذہنیت اور طرز عمل کو بیان کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اہل علم بھی قرآن و حدیث اور کتب سیر و فضائل میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس اور عظمت و فضیلت کے بیان میں خود تو مطالعہ کے دوران بہت کچھ پڑھیں مگر عامتہ المسلمین کے سامنے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہوئے بخل اور طبیعت کی گھٹن کا ثبوت دیں یا شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کو اس قدر اہمیت ہی نہ دیں' خبردار یہ یہودی ذہنیت کا خاصہ اور یہودیانہ طرز عمل ہے اس سے مسلمانوں کے ایمان کو بھی ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرز عمل سے ان کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محض عقلی اور ظاہری اطاعت کا تو رہ جائے گا مگر قلبی و روحانی تعلق کمزور پڑ جائے گا اور یہ چیز رفتہ رفتہ ان کے ایمان کو نفاق سے بدل دے گی۔

آیت ، ۸۹- وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا

۲۳ - حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگنا پہلی امتوں میں بھی رائج تھا

زمانہء قدیم سے آج تک مفسرین کی اکثریت نے یہی معنی بیان کیا ہے اور یہ اصلاً" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔ یہاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ و وسیلہ سے دعا کرنے کی برکت کا ذکر ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ خود اہل کتاب' حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے کفار و مشرکین عرب سے جنگوں کے دوران اللہ تعالی سے اپنے کامیابی و کامرانی کی دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے مانگا کرتے تھے ان کی دعا کے کلمات یہ تھے۔ "**اللهم انصرنا عليهم بالنبی المبعوث فی اخر الزمان الذی نجد صفته فی التوراة**" (اے اللہ ہمیں ان کافروں پر اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے فتح عطا فرما جس کی شان کا بیان ہم تورات میں دیکھتے ہیں) بعض روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی کے

ساتھ قرآن مجید کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہاں یہود کی مذمت اسی حوالے سے کی گئی ہے کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہ ہوئی تھی تو کامیابی کی دعائیں بھی انہی کے وسیلے سے مانگتے تھے مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے تو یہ ان کے منکر ہو گئے۔

دوسرا پہلو جو اس مقام سے واضح ہوا وہ اعتقادی ہے۔ بعض لوگ کم علمی کے باعث حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا مانگنے میں تامّل کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وسیلے سے دعا مانگنا' اللہ سے براہ راست مانگنے کے منافی ہے' وہ قرآن مجید کی ان آیات کا جن میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانے کا حکم ہے' صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی بنا پر خیال کرتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا' (معاذ اللہ) کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کے مترادف ہے۔ یہ تصور بہت بڑی جہالت اور غلطی ہے۔ ہمیں اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ واضح رہے کہ انبیاء و رسل میں سے کسی کو' یا اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب اور صالح بندے کو یا کسی بھی عمل صالح کو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہوئے اس کی بارگاہ میں بطور وسیلہ پیش کرنا نہ کسی قسم کا شرک ہے اور نہ براہ راست اللہ سے مانگنے کے خلاف۔ وسیلے کے باوجود براہ راست اللہ ہی سے مانگا جاتا ہے' صاحب وسیلہ سے نہیں اور شرک تو تب ہو کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی اور کو دعائیں سننے والا سمجھا جائے' یہاں سرے سے ایسا معاملہ ہی نہیں۔ دعا فقط اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاتی ہے اور اس سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کا یا کسی ایسے مقرب بندے یا نیک عمل کا واسطہ دیا جاتا ہے جس سے خود اللہ تعالیٰ کو محبت ہو اور جس کا وہ عام مخلوق سے کہیں بڑھ کر حیا اور لحاظ فرماتا ہو۔ سو ایسا وسیلہ پیش کرنے سے جہاں خود کلمات دعا کی برکت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے وہاں اس کے بارگاہ الٰہی میں شرف باریابی پانے کے امکانات پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں کیونکہ اب بندے کی التجا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی اپنی محبت بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہونا

چاہیے کہ دعاؤں کی اجابت و قبولیت میں وسیلہ شرط نہیں مگر مفید اور کارگر ضرور ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے اس عمل کا ذکر کرکے اس کی نفی یا تردید نہیں کی، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ کو بھی اس کی تعلیم و اجازت دی گئی ہے خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو اپنے وسیلہ جلیلہ سے دعا مانگنے کی تعلیم فرمائی تھی جیسا کہ سنن ابن ماجہ میں حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث صحیح سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دعا کے یہ کلمات تلقین فرمائے۔ **"اللهم انی اسئلک واتوجہ الیک بمحمد نبی الرحمۃ یا محمد انی قدتوجهت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی اللھم فشفعہ فی"** (باب ما جاء فی صلوٰۃ الحاجۃ) (اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی رحمت کے وسیلے سے متوجہ ہوتا ہوں یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کے وسیلہ سے اپنی اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ پوری ہو جائے، اے اللہ میرے حق میں آپ کی شفاعت قبول فرما) انجاح الحاجہ میں ہے کہ اس حدیث کو نسائی اور ترمذی نے کتاب الدعوات میں نقل کیا ہے ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ بیہقی نے اسے صحیح لکھا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ دعا کرنے والا نابینا شخص جب یہ دعا کرکے اٹھا تو بینا ہوگیا تھا خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے بارش کی دعا مانگتے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بخاری میں مروی ہے اور ایک مرتبہ جب مدینہ طیبہ میں سخت قحط پڑگیا تھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے صحابہ کرام اور دیگر اہل مدینہ کو توسلاً حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور کی طرف بھیجا اور اس کی برکت سے موسلا دھار بارش ہوئی (مشکوۃ باب الکرامات) اسے دارمی نے ابوالجوزاء سے روایت کیا ہے الغرض یہ مبارک عمل حضرت آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام سے لے کر خود عہد رسالت مآب تک اور پھر عہد صحابہ و تابعین سے لے کر تاحال امت میں مقبول اور متداول چلا آرہا ہے اب بعض لوگ دین کی

صحیح معرفت نہ ہونے کے باعث اس پر اعتراض کرنے لگے ہیں اور اسے (معاذ اللہ) توحید کے منافی سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ احکام شریعت کو ان کی حقیقی روح کے ساتھ سمجھا جائے تاکہ ہم اپنی کم علمی اور عدم واقفیت کے باعث دینی تصورات پر ظلم نہ کرتے رہیں۔ (اس پر مزید روشنی سورۂ نساء کی آیت: ۶۴ کے تحت ڈالی گئی ہے)

آیت: ۱۰۱- كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ

۴۴- یہود نے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کے باعث اپنی کتاب تورات کو بھی پس پشت ڈال دیا۔

یہاں بھی حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس اور آپ کے اوصاف و کمالات کا تورات اور پچھلی آسمانی کتابوں میں بیان کیا جانا مذکور ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے کئی آیات میں گزر چکا ہے۔ امام ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں ابونملہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے **"کانت یهود بنی قریظة یدرسون ذکر رسول اللّٰہ (صلی اللہ علیه وسلم) فی کتبهم ویعلمون الولدان بصفته واسمه و مهاجره الی المدینة فلما ظهر حسدوا بغوا وانکروا"** (بنو قریظہ کے یہودی اپنی کتابوں سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر مبارک کا درس دیتے تھے اور اپنے بچوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی، آپ کے اوصاف و کمالات اور آپ کی مدینہ کی طرف ہجرت جیسے احوال کی تعلیم دیتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کرنے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باغی اور منکر ہوگئے) اس وقت انہوں نے اپنی کتاب تورات کے سارے درس اور بیان بھی پس پشت پھینک دیئے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بھی پہلے انبیاء کرام کی طرح بنی اسرائیل یعنی انہیں کے قبائل میں سے ہوگی اور یہ ان کے لئے بہت بڑا اعزاز اور فخر ہوگا وہ اسی انتظار میں صدیوں سے شہر یثرب (مدینہ طیبہ) میں

آکر آباد ہوئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت مبارکہ بنی اسماعیلؑ میں سے ہوئی (یعنی حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد کے بجائے حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے ہوئی) یوں ان کے خیال میں نبوت بنی اسرائیل میں سے نکل گئی جبکہ وہ اسے اپنا استحقاق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان میں حسد و عناد پیدا ہوگیا۔ اور جب کسی کے خلاف دل میں حسد پیدا ہو جائے تو اپنی مقدس کتاب کا بھی حیا نہیں رہتا۔

آیت ۱۰۴- يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا

۲۵- حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں معمولی سی لفظی گستاخی بھی کفر ہے

اس آیت کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ادب و احترام اور تعظیم و تکریم کا ایک اصولی ضابطہ امت مسلمہ کو عطا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں گفتگو کے آداب کیا ہونے چاہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب اپنے صحابہ سے کلام فرماتے تو اگر انہیں کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دوبارہ سننے کے لئے عرض کرتے رَاعِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (یا رسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمایئے) یعنی ہمیں سمجھانے کے لئے یہ بات دوبارہ ارشاد فرما دیجئے۔ یہ کلمہ فی نفسہ گستاخانہ نہ تھا، مگر یہودیوں نے اپنے خبث باطن کے طور پر اسے غلط معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا جس سے دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بے ادبی اور گستاخی کا پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس لفظ کے استعمال کی بھی کلیتہً پابندی لگادی گئی۔

حالانکہ صحابہ کرام اس لفظ کو بے ادبی اور گستاخی کے معنی میں بولنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ چونکہ اس میں معنوی طور پر گستاخی اور بے ادبی کا مفہوم پیدا ہونے یا پیدا

کرلئے جانے کا احتمال تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ ایسا لفظ بھی میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے ۔ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کا ادب۔ کہ اگر کوئی کلمہ' لفظ یا جملہ فی نفسہٖ بے ادبی اور گستاخی کا نہ بھی ہو' مگر اس میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کا فقط احتمال پایا جائے' تو اسے استعمال کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس کے بجائے ایسے الفاظ (جیسے **انظرنا** کا حکم دیا گیا) بولے جائیں جن میں سرے سے اہانت' تنقیص یا سوء ادب کا احتمال ہی نہ ہو بلکہ وہ الفاظ ہی سراسر ادب کا پیکر ہوں۔

اس مقام پر دوسری اہم بات جو "**وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ**" کے کلمات کے ذریعے واضح کی گئی ہے یہ ہے کہ تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ صراحۃً "یا کنایۃً" معمولی سی گستاخی بھی کفر ہے اور باعث عذاب الیم ہے۔

راعنا کے لفظ میں گستاخی کے احتمالات کیا تھے؟

باوجود اس کے کہ اس لفظ کے اپنے معنی میں کوئی بے ادبی اور گستاخی نہ تھی اور نہ اس کے بولنے والے صحابہ کرام کی طرف (معاذ اللہ) ایسی نیت کا منسوب کرنا ممکن تھا۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں گستاخی کے احتمالات کیا تھے جن کے باعث اس قدر سختی سے منع کردیا گیا اس منع کا سبب نزول یہ آیا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض روایات میں سعد بن عبادۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہود سے یہ لفظ غلط معنی میں استعمال کرتے ہوئے سنا تو کہا "**یا اعداء اللّٰہ علیکم لعنۃ اللّٰہ والذی نفسی بیدہ لئن سمعتہا من رجل منکم یقولہا لرسول اللّٰہ لا ضربن عنقہ فقالوا اولستم تقولونہا فنزلت ھذہ الاٰیۃ**"

(تفسیر کبیر' کشاف' قرطبی' روح المعانی وغیرہ)

(اے اللہ کے دشمنو تم پر اللہ کی لعنت ہو' اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری

جان ہے اگر میں نے تم میں سے کسی سے یہ لفظ راعنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بولتے ہوئے سن لیا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اس پر انہوں نے کہا کہ تم بھی تو یہ لفظ بولتے ہو چنانچہ اس لفظ کے استعمال کی منع پر یہ آیت نازل ہوگئی)

اس لفظ میں شان رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی اور بے ادبی کے درج ذیل احتمالات تھے۔

۱ ۔ یہود کی زبان میں یہ لفظ کلمہء تحقیر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ اسے بطور گالی استعمال کرتے تھے۔

۲ ۔ عبرانی اور سریانی زبان میں اسی سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے تو بہرہ ہو جائے۔

۳ ۔ عربی زبان میں لفظ راعن کا ایک معنی صاحب رعونت یعنی متکبر کا تھا اور ایک معنی جاہل اور احمق کا بھی تھا۔ گو "راعن" اور لفظ تھا جو رعونت سے تھا اور راعنا مراعات سے تھا اس کا معنی تھا۔ "ہمارے حال کی رعایت فرمایئے" مگر راعن اور راعنا بولتے وقت کوئی بدطینت شخص اضافت کا تعلق بنا سکتا تھا۔ اور اس طرح لفظ راعن کا منفی مفہوم ادھر منسوب کئے جانے کا امکان تھا۔

۴ ۔ یہود اپنی گستاخانہ ذہنیت کے باعث آپس میں راعنا کے لفظ کو دبا کر راعینا کہتے تھے جس کا معنی "ہمارے چرواہے" کا بن جاتا اس طرح وہ اپنے مجلسوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی اور تضحیک کے ذریعے اپنے بغض و حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرتے تھے اس کا ذکر قرآن مجید میں ایک اور مقام پر یوں آیا ہے "رَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ" (کہ راعنا کو اپنی زبانیں مروڑ کر بولتے ہیں)

۵ ۔ قطرب نے بیان کیا ہے کہ یہ لفظ بعض اوقات اہل حجاز تضحیک اور تمسخر کے وقت بھی استعمال کرتے تھے۔

۶ - یہاں امام رازی رحمتہ اللہ نے ایک اور اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ عربی زبان میں الرعی بین اثنین میں دو بولنے والوں کے درمیان برابری اور مساوات کا مفہوم پایا جاتا ہے لہٰذا اس لفظی مناسبت کی بنا پر راعنا میں بوقت مخاطبہ مفہوما" لوگوں کی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مساوات اور برابری کا گمان ہو سکتا تھا۔

۷ - قاضی عیاض نے الشفا میں بیان کیا ہے کہ لغت انصار کے مطابق اس لفظ راعنا کے استعمال میں قلت ادب اور عدم توقیر و تعظیم کا پہلو تھا۔ کیونکہ مقامی لوگ اس لفظ کو اس جگہ استعمال کرتے تھے جہاں خاص ادب و تعظیم ملحوظ نہ ہوتا اور بلااہتمام خاص گفتگو کرنا مقصود ہوتی۔

ان احتمالات کے پیش نظر نہ صرف اس لفظ کو شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں بے ادبی قرار دے کر اس کے استعمال کی سخت ممانعت کر دی گئی بلکہ امام ابونعیم دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "جو شخص اس آیت کے نزول کے بعد یہ لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بولے مسلمانوں کو اس کی گردن اڑا دینے کا اذن عام دے دیا گیا" (ملاحظہ ہو فتح القدیر از شوکانی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵) تاکہ بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں کسی طور پر بھی کوئی گستاخی کی جسارت نہ کر سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں درج ذیل احکام آیت متذکرہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) جن الفاظ و کلمات کا استعمال دوسری زبانوں میں غلط اور حقارت انگیز معنی میں ہوتا ہو' خواہ ہماری زبان میں وہ الفاظ صحیح المعنی ہی ہوں۔ ان کا استعمال بھی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی تصور کیا جائے گا کیونکہ دشمن اسی لفظ کو اپنے بغض و حسد کی بنا پر عام حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی گستاخی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

(۲) جن کلمات سے ملتے جلتے معروف الفاظ کسی دوسری یا اپنی زبان میں واضح طور پر اہانت و

تنقیص کا معنی رکھتے ہوں ان کا استعمال بھی لفظی مناسبت و مشارات کی بنا پر گستاخی پر محمول ہو گا۔

(۳) جس لفظ میں معمولی سے لہجے کی تبدیلی کے ساتھ بولنے سے واضح اہانت اور گستاخی کا معنی پیدا ہو جائے اس کا استعمال بھی شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بے ادبی تصور ہو گا۔

(۴) جن کلمات کا استعمال مختلف معانی میں ہوتا ہو یعنی وہ ایسے ذو معنی لفظ ہوں کہ ان میں اچھے مفہوم کے علاوہ بُرا مفہوم بھی معلوم اور متعارف ہو' ان کا استعمال بھی صریح گستاخی ہو گا۔

(۵) ایسے الفاظ و کلمات جن سے کسی بھی امتی کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مساوات اور برابری کا پہلو نکلتا ہو' ان کا استعمال بھی شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں صریح حکم ہے **لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا** "جس طرح تم ایک دوسرے کو آپس میں پکارتے ہو خبردار اس طرح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ بلایا کرو"۔

(۶) ایسے الفاظ و کلمات ________ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معناً" ادب اور تعظیم و توقیر کا فقدان یا کمی ہو اور ان میں مخاطب کی عظمت کا لحاظ نہ پایا جاتا ہو' خواہ ان میں ظاہراً" کوئی اہانت اور بے ادبی کا معنی بھی موجود نہ ہو' ان کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں استعمال کرنا بھی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

(۷) ایسے الفاظ و کلمات جو خود گستاخانہ نہ ہوں مگر ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی بے ادبی اور اہانت کا دروازہ کھلتا ہو راہ ہموار ہوتی ہو ان کا استعمال بھی فی نفسہٖ گستاخی کے حکم میں تصور کیا جائے گا۔

سو ایسے تمام الفاظ و کلمات جو خود تو گستاخانہ اور اہانت انگیز نہیں مگر موہم تحقیرو

اھانت (اھانت و تحقیر کا گمان پیدا کرنے والے) اور موہم مساوات (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برابری کا گمان پیدا کرنے والے) ہیں ان کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بولنا اور لکھنا بھی منع ہے' اسے بھی گستاخی قرار دیا گیا ہے۔

(۸) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں معمولی سی گستاخی بھی خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ صریح ہو یا کنایہ حتی کہ وہ کلمہ خواہ فی نفسہٖ ظاہراً" مبنی بر اھانت ہو یا فقط مبہم اھانت' شریعت اسلامی میں کفر ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ موہم اھانت کلمہ گستاخی و اھانت کی نیت کے بغیر بولنا بھی صریح حرام ہے اور اس پر مطلع ہو جانے کے بعد اسے ارادۃً" یا تکراراً" بولنا یا قائم رکھنا صریح کفر ہے۔

(۹) اس آیت کریمہ اور دیگر قرآنی احکام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کا مرتکب کافر اور مرتد ہے اور شرعاً" واجب القتل ہے۔

(۱۰) ایک نکتہ خود اس آیت اور اس کے ماقبل کے اسلوبِ خطاب سے متعلق ہے۔ وہ یہ کہ آیت زیر مطالعہ ۱۰۴ ہے اور اس سے پہلے آیت : ۴۷ (چھٹے رکوع) سے مسلسل یہود کا مضمون شروع ہے۔ بیشتر جگہ خطاب بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی سے کیا گیا ہے اور انہی کے گمراہانہ عقائد' فاسقانہ و ظالمانہ اعمال اور ان کی عیاریوں اور شرارتوں کا ذکر چلا آرہا ہے۔ مگر یہاں ۶ رکوعات کے بعد اچانک خطاب کا رخ بدل کر اہل ایمان کی طرف کردیا گیا۔ حالانکہ ذکر یہاں بھی یہود ہی کی شرارت اور بغض و حسد کا ہے اور اس حکم کے پس منظر میں بھی یہود ہی ہیں مضمون ماقبل اور ظاہر اسلوب خطاب کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہاں بھی اس گستاخی کو ان کی شرارت قرار دے کر انہیں تنبیہہ کی جاتی ان کی حسب سابق مذمت کی جاتی اور بعد ازاں مسلمانوں کو اس لفظ کے استعمال سے روک دیا جاتا مگر اس آیت میں خطاب کا رخ ان کی طرف سرے سے کیا ہی نہیں گیا صرف اہل ایمان سے بات کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی اور اھانت و

تحقیر اتنا بڑا جرم اور بدبختی ہے کہ اس پر تنبیہہ کے لئے بھی ان گستاخان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب تک کے لائق نہیں سمجھا اور ان کی اس گستاخی پر اپنے خطاب کا رخ بھی ان سے موڑ لیا۔ خطاب اہل ایمان سے فرمایا' حکم ادب انہیں دیا مگر اسی آیت کے اختتام پر کفار کو دردناک عذاب کی وعید سنا دی' یہ انداز انتہائی نفرت' بیزاری اور غضب کے اظہار کے لئے اپنایا گیا ہے۔ لہٰذا جان لینا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی اتنا بڑا جرم ہے جو کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جاتا علامہ ابن تیمیہ نے اسے کفر ابلیس سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا ہے کیونکہ کفر ابلیس شرک پر مبنی نہ تھا وہ تو خود کو دنیا کا سب سے بڑا بلکہ ملائکہ سے بھی بڑا موحد سمجھتا تھا' اس کا کفر حضرت آدم علیہ السلام کی گستاخی تھا یعنی حکم الٰہی کا ایسا انکار جو دربار نبوت میں تکبر اور اھانت پر مبنی تھا۔ اس پر وہ قیامت کے لئے راندۂ درگاہ الٰہی ہوگیا اور جو شخص بارگاہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی قسم کی گستاخی کا مرتکب ہوگا تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ (اللہ تعالیٰ سب کو اس بدبختی سے محفوظ رکھے آمین)

مگر افسوس کہ ہم آج ادب و تعظیم رسالت جیسے اہم ترین ایمانی فرض کی صحیح معرفت سے غافل ہیں اور اس پر زور دینے کو (معاذ اللہ) شخصیت پرستی' بدعت' شرک اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ اگر بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فقط آواز بلند کرنے جیسی جسارت اور بے ادبی کا بھی ارتکاب ہو جائے تو تب بھی زندگی بھر کی ایمان و عمل کی ساری پونجی برباد ہو جاتی ہے اور توفیق توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سورۃ الحجرات کی آیت : ۲ میں صراحت ہے اس لئے ہمیں چاہیے ہر حال میں ادب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن تھامے رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی بیش از بیش توفیق طلب کرتے رہیں کیونکہ یہی اصل ایمان' عین ایمان اور کمال دین ہے۔ یہاں تک تو ادب و تعظیم کا حکم تھا' اب اسی آیت میں ایک عجیب نکتہ محبت بھی

ہے۔

ارشاد فرمایا گیا کہ تقاضائے ادب تو یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر "انظرنا یا رسول اللہ" کہا جائے (آقا ہمارے حال پہ نظر کرم فرمایئے) مگر تقاضائے محبت یہ ہے کہ ایسی نوبت ہی نہ آئے۔ فرمایا "وَاسْمَعُوْا" میرے حبیب کی بارگاہ میں ہمہ تن گوش اور سراپا سماعت بن کر بیٹھا کرو۔ اتنی توجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنا کرو کہ کسی بات کے دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ تاکہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمہاری خاطر اپنی کہی ہوئی بات دہرانے کی تکلیف ہی نہ ہو خود دہرا دیں تو الگ بات ہے کہ احساسات محبت کی بات ہے۔ اسے اہل دل محسوس تو کرسکتے ہیں مگر اہل دلیل شاید پورے طور پر سمجھ نہ سکیں "رموز سر دل بے دل چہ داند" لیکن یاد رہے کہ یہ حکم الہی ہے۔

آیت: ۱۰۸۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ

۳۶۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایذاء بے جا سوالات کرنے کی جسارت بھی کفر ہے

یہاں بھی آداب بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھائے جا رہے ہیں اور بنی اسرائیل کے ایک گستاخانہ معمول کے حوالہ سے تنبیہہ کی گئی ہے۔ ان کا طریقہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہر وقت طرح طرح کے سوالات کرتے اور اپنی سہولت کے لئے انہیں تکلیف میں مبتلا کرتے رہتے تھے۔ نتیجۃً وہ خود بھی پریشان ہوتے۔ اس کی تفصیل اسی سورۃ البقرہ میں بہت سے مقامات پر آگئی ہے۔ مسلمانوں کو یہ عمل بارگاہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری رکھنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اسے "ایمان کے بدلے کفر حاصل کرنے سے" تعبیر کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان بارگاہ نبوت میں ادنیٰ سی گستاخی اور بے ادبی سے بھی بچے رہیں خواہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے جا

سوالات کرنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو یہ بھی کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں کسی کی اس قدر جسارت بھی گوارا نہیں ہے۔

آیت : ۱۱۹ ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

۳۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بشیر و نذیر ہونا

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو شانوں کا ذکر ہے۔
بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ڈر سنانے والا) سورۃ فاتحہ میں باری تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کو دو صفات کے بیان سے اجاگر فرمایا ہے الرحمٰن الرحیم یہ شان رحمانیت ہے اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن۔ یہ شان مالکیت ہے، اسی طرح باری تعالیٰ کے غفار اور ستار ہونے کے بیان کے ساتھ اس کے جبار اور قہار ہونے کا ذکر بھی بارہا آیا ہے۔ تاکہ لوگ اس کی رحمت کی امید بھی رکھیں اور اس کے عذاب سے خوفزدہ بھی ہوں۔ اور ایمان دل میں انہی دو حالتوں کو جمع کرنے کا نام ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باری تعالیٰ نے اپنی ذات کا مظہر کامل بنایا ہے۔ اس لئے آپ کی رسالت کو بھی ان دونوں شانوں سے مزین فرما دیا گیا ہے۔ شان بشیریت اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کی آئینہ دار ہے اور شان نذیریت اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب کی کیونکہ کچھ طبیعتیں رحمت اور مغفرت کے بیان سے ہدایت اور نصیحت پاتی ہیں اور کچھ سزا اور عذاب کے بیان سے، اس لئے دونوں کو رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کردیا گیا ہے اور ایسی روحیں بھی ہیں جن کے لئے نہ اخروی نعمتوں کا شوق عبادت اور بندگی کا محرک بنتا ہے اور نہ عذاب آخرت کا خوف، بلکہ وہ صرف اللہ کے لئے اللہ کی بندگی اختیار کرتی ہیں ان طالبان حق کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا" کی شان سے بھی نوازا گیا ہے جس کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات حق پر گواہ مطلق ہیں "اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا" میں ایک اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ آپ کے ذریعے لوگوں کو ذات حق کی طرف بھی دلالت ہدایت اور

معرفت نصیب ہوتی ہے اور یہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال ہے۔

آیت : ۱۲۹۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

۳۸۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبی تعلق کے شرف کی خاطر اپنی اولاد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی دُعا مانگی۔

یہاں حضور علیہ السلام کی بعثت مبارکہ سے متعلق وہ دعا بیان کی گئی ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت مانگی تھی۔ میثاق انبیاء کے باعث یہ امر انہیں بھی معلوم تھا کہ تمام انبیاء و رسل کے مبعوث ہوچکنے کے بعد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری ہوگی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور بعثت ہماری اولاد (بنی اسماعیل) میں سے ہو تاکہ تیرے اس محبوب پیغمبر کے ساتھ نسبی تعلق کا شرف ہمیں حاصل ہو جائے ان کی دعا قبول کرلی گئی سو ولادت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرف بنی اسماعیل کو ملا۔ بنی اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد) چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل تھی' وہ توقع کرتے تھے کہ اس نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت بھی دیگر انبیاء کی طرح بنی اسرائیل میں سے ہوگی اور انہوں نے تمام انبیاء بنی اسرائیل سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی خوشخبری بھی سن رکھی تھی۔ تورات' زبور' انجیل اور دیگر صحائف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ بھی پڑھتے چلے آرہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات زندگی حتیٰ کہ مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانا بھی انہوں نے پڑھ رکھا تھا اسی لئے وہ صدیوں سے شہر یثرب (مدینہ) میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم بنی اسماعیل میں سے تشریف لائے تو وہ حسد میں مبتلا ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔

اس دعا میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائص مبارکہ کا بھی ذکر ہے۔کہ

ا - وہ امت پر آیات الٰہی تلاوت فرمائیں گے

ب - وہ امت کو کتاب الٰہی کی تعلیم دیں گے

ج - وہ امت کو حکمت و دانائی کی دولت سے نوازیں گے

د - اور وہ امت کے نفوس کا تزکیہ فرما کر انہیں صفائے باطن سے آراستہ فرمائیں گے

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اوصاف کا ذکر فرمایا ہے اس دعا سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی دیگر انبیاء کرام کی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبوی اوصاف و کمالات اور خصائص و فضائل کا علم تھا۔ جیسا کہ اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ سے ظاہر ہے کہ تمام انبیاء کرام سے عالم ارواح ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ سب نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں گے ان کی تصدیق کریں گے اور اپنی اپنی امتوں کو ان کے اوصاف و کمالات سے آگاہ کرتے رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانے میں اپنی امتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی اطلاع دیتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و کمالات بیان کرتے رہے۔

آیت ۱۴۳:- وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

۳۹ - حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُمّت کے احوال پر گواہ ہیں

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی پوری اُمت پر نگہبان اور گواہ بنایا گیا ہے آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالےٰ کے عطا کردہ علم اور نورِ نبوت سے ہر اُمتی کے اعمال واحوال اور اخلاص ونفاق سے آگاہ ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن اُمت کے حق میں آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شہادت کو قطعًا قبول کیا جائیگا اور اس کی تائید میں کسی اور کی گواہی مطلوب نہ ہوگی آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا درجہ اپنی اُمت کے حق میں معدل اور مزکی کا ہوگا اور آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی گواہی سے اُمتِ محمدیہ مقبول الشہادت قرار پائے گی۔ امام بغوی حضرت ابو سعید خُدری رضی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعد نمازِ عصر خطاب فرمایا اور قیامت تک کے تمام احوال بیان فرما دیئے یہاں تک کہ کوئی ایسی چیز نہ چھوڑی جس کا ذکر آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسی خطاب میں نہ فرما دیا ہو، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں بھی بہز بن حکیم سے اسی طرح مروی ہے اور بخاری ومسلم میں بھی اسی مضمون کی تائید میں کئی احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔

آیت ۱۴۳:- مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ

۴۰ - تحویل قبلہ کا واقعہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ تعلق عشق کا امتحان تھا۔

اس آیت کریمہ میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نسبتِ اطاعت وغلامی کو معیارِ ایمان قرار دیا گیا ہے اس واقعہ سے یہی آزمائش مقصود تھی کہ کون سابقہ قبلہ سے اپنے تعلق کو ترجیح دیتا ہے اور کون اس پر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے نسبت وتعلق کو ترجیح دیتا ہے اور آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع میں بلا تأمل اپنی سمتِ عبادت تبدیل کر لیتا ہے۔ کیونکہ ایمان اور اسلام کی پہچان نسبتِ قبلہ سے نہیں، نسبتِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے صحیح بخاری میں ہے جس نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی جس نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نافرمانی کی۔ اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی لوگوں یعنی مومنوں اور کافروں میں فرق وامتیاز پیدا کرنے والی ہے۔

پھر اسی آیتِ کریمہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس نسبتِ غلامی کی پہچان ہی کو ہدایتِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے بیشک اسی نسبت کے تحقق سے ایمان سلامت رہتا ہے اور اس کے قطع ہو جانے سے ایمان غارت ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۴۴ - قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ

۴۱ - تحویلِ قبلہ کا واقعہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ محبوبیّت کا مظہر ہے

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اظہارِ محبت فرمایا ہے حالتِ نماز میں آپ کے رُخِ انور کا قبلہ بدلنے کی آرزو کے پیشِ نظر بار بار آسمان کی طرف پلٹنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس قدر محبت بھرا انداز اپنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ محبوبیت خوب آشکار ہوتی ہے۔

اس کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حسبِ خواہش بیت المقدس کی جگہ مسجد حرام (کعبۂ معظمہ) کی طرف چہرۂ انور پھیر لینے کا حکم ہے۔ یہاں عند اللہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقام و مرتبہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ — "ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں"، یعنی اے محبوب، ہمیں آپ کی رضا ہی تو مقصود ہے اگر آپ خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانے پر خوش ہیں تو ہم اسی کو قبلۂ اسلام بنا دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تحویلِ قبلہ جیسے اہم سے اہم تر معاملات و احکام میں بھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضا اور خوشی کو ملحوظ رکھتا ہے۔

یہاں ایک وجدانی نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ تبدیلیٔ قبلہ کے لیے حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا چہرۂ اقدس کا آسمان کی طرف بار بار پلٹنے کا ذکر آیا ہے تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حالتِ نماز میں کئی بار آسمان کی طرف دیکھا اور تحویلِ قبلہ کی خواہش میں اپنی بیقراری کا اظہار فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ نے تبدیلیٔ قبلہ کا حکم فرمایا۔ اب یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت ۱۴۴ سے آیت ۱۵۰ تک اللہ تعالیٰ نے بھی پلٹ پلٹ کر پانچ مرتبہ مسجد حرام کی طرف چہرہ پھیر لینے کا حکم دُہرایا ہے کبھی انفرادی طور پر کبھی اجتماعی طور پر حالانکہ ایک مرتبہ کا حکم بھی کافی تھا مگر بار بار اس حکم کو دہرانا درحقیقت اپنے محبوب کے بار بار آسمان کی طرف چہرہ پلٹنے کا جواب معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ اظہارِ محبت کا ایسا دلنشیں اور لطیف انداز ہے کہ اس کا اندازہ اہلِ محبت ہی کر سکتا ہے۔ (اس کی تفصیل متعلقہ مطالب میں دیکھئے)

آیت ۱۴۶ - اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ

۴۲ - حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کو دل سے تسلیم نہ کرنا یہودی ذہنیت کا شیوہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کو تورات اور انجیل میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اوصاف و کمالات کی تفصیل پڑھ کر آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مکمل معرفت حاصل تھی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہلے سے نازل شدہ کتابوں کے ذریعے اس قدر پہچانتے تھے جیسے والدین اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ جس طرح انہیں اپنی اولاد کے پہچاننے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محامد و محاسن اور فضائل و کمالات کا اتنا مفصل حال وہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ انہیں آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھ کر پہچاننے میں کوئی شبہ نہ رہا کہ یہی وہ برگزیدہ اور محبوب آخرالزمان رسول ہیں جن کی تشریف آوری کا تذکرہ پہلی کتابوں میں درج ہے۔

یہاں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان و عظمت اور آپ کی معرفت کو حق قرار دیا گیا ہے اور اسے تسلیم نہ کرنے کو کتمانِ حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف اور بیان نہ کرنا حق کو چھپانا ہے یہ یہودیوں کا عمل ہے۔

آیت ۱۵۱ - یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ

۴۳ - نبوت کے فرائضِ پنجگانہ۔

اس مقام پر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ سعیدہ کا ذکر ہے اور آپ کے فرائضِ پنجگانہ کا بیان ہے جن سے آپ کے اپنی اُمت کو تعلیمی اور تربیتی جہت سے فیضیاب فرمانے کے مختلف انداز معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) - آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی اُمت پر آیاتِ الٰہی تلاوت فرماتے ہیں جس سے افرادِ ملت کو نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے اور ان میں اپنی اصلاحِ احوال اور تربیتِ روحانی کا ذوق فروغ پاتا ہے۔

(۲) - آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نگاہِ نبوت سے افرادِ ملت کے نفوس و قلوب کو ہر قسم کی باطنی آلائشوں سے پاک

صاف فرماتے ہیں جس سے ان کے نفس اعلےٰ مقامات پر فائز ہوتے ہیں اور دل انوارِ قدسیہ کے نزول کے قابل ہوتے ہیں۔

(۳)۔ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم افرادِ ملت کو کتابِ الٰہی کے احکام و ہدایات کی تعلیم فرماتے ہیں جس سے انہیں معارفِ ایمانی اور علومِ شریعت تک کامل رسائی حاصل ہوتی ہے۔

(۴)۔ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم افرادِ اُمت میں حکمت و دانائی کی دولتِ لازوال تقسیم فرماتے ہیں جس سے انہیں معارفِ دین و شریعت اور نفس و آفاق کے حقائق و دقائق کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

(۵)۔ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم افرادِ اُمت کو اپنی خصوصی توجہ اور فیضانِ نبوت سے ان اسرار و غوامض اور رموزِ حقیقت کی معرفت عطا فرماتے ہیں جو آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عنایت کے بغیر کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

آیت ۱۸۶۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ

۴۴۔ معرفت و قربِ الٰہی کا سوال حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی کیا جائے

(۱۰) اس آیتِ کریمہ میں اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ (اے حبیب جب میرے بندے میری نسبت آپ سے سوال کریں) کے الفاظ سے ایک نہایت لطیف نکتہ واضح ہوتا ہے کہ بیشک اللہ کی معرفت کا سوال حضور رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ سے ہی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کی ذات معرفتِ الٰہی کا کامل ذریعہ ہے قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔ "اَلرَّحۡمٰنُ فَاسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا" (رحمان کی معرفت کی نسبت کسی باخبر سے پُوچھ) جیسے علم کا سوال کسی عالم سے کیا جاتا ہے، حکمت کا سوال کسی حکیم سے، فلسفہ کا سوال فلسفی سے اور سائنس کا سوال سائنسدان سے، اسی طرح اللہ کی نسبت اللہ والوں سے ہی پُوچھنا بہتر ہے۔ کیونکہ وہ صاحبانِ معرفت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ تذکرۃ الاولیا میں منقول ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کثرت سے عارف باللہ حضرت بشر حافیؒ کی صُحبت میں بیٹھتے تھے۔ آپ کے شاگردوں نے پُوچھا آپ اس دیوانے کی معیت میں اتنا کیوں رہتے ہیں حالانکہ آپ خود فقہ و شریعت کے امام ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا دُرست ہے کہ شریعت میں زیادہ جانتا ہوں مگر شریعت والے رب کو وہ زیادہ جانتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو جب حضرت بشر حافی کی صُحبت میں تنہائی میسر آتی تو عرض کرتے "حضرت اللہ کی کچھ باتیں سُنایئے"۔ "اِنِّیۡ قَرِیۡبٌ" کا مفاد یہ ہے کہ جو جس قدر اللہ سے زیادہ قریب ہے اسے اسی قدر اللہ کی معرفت بھی زیادہ میسر ہے۔ چنانچہ دیگر فضائل و مراتب کی طرح قُربِ الٰہی میں بھی انبیاء و اولیاء میں سے کوئی بھی حضور نبی اکرم جیسا نہیں ہے

اس لیے سب سے زیادہ معرفتِ الٰہی کے حامل بھی آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ہیں۔ سو بالواسطہ یا بلا واسطہ اُمت کے ہر فرد کو معرفتِ الٰہی حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے ہی نصیب ہوتی ہے اس کے بغیر ممکن ہی نہیں اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اللہ کی خبر حاصل کرنے میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے خبر نہ ہوں۔ ورنہ اللہ کی خبر بھی نصیب نہیں ہوگی۔ توحید و رسالت کے تعلق کا باہمی لزوم آجکل لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے اس لیے اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔

آیت ۲۴۸۔ اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

۴۵ - تبرّکاتِ صالحین کی فضیلت

(۱۱) - یہ امر واضح ہے کہ ہم نے ترجمہ میں تبرکات کا لفظ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لیا ہے۔ اس کی تفصیل کم و بیش تفسیر کی ہر کتاب میں آئی ہے۔ بغوی، قرطبی، جلالین، تفسیر کبیر، بیضاوی، روح البیان، جمل، روح المعانی، خازن، مدارک اور المظہری وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

تاہم حضرت مولانا سید نعیم الدین مُراد آبادیؒ نے اس تابوت کا نہایت جامع بیان کیا ہے ہم اسی کو "خزائن العرفان" سے نقل کرتے ہیں۔

" یہ تابوت شمشاد کی لکڑی کا زر اندوز صندوق تھا جس کا طول تین ہاتھ اور عرض دو ہاتھ تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ اس میں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تصویریں تھیں اور آخر میں حضور سید انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سرائے اقدس کی تصویر ایک یاقوتِ سُرخ میں تھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بحالتِ نماز قیام میں ہیں اور آپ کے گرد آپ کے اصحاب ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ان تمام تصویروں کو دیکھا۔ یہ صندوق وراثتاً منتقل ہوتا ہُوا حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا۔ آپ اس میں توریت بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس میں الواحِ توریت کے ٹکڑے بھی تھے اور حضرت موسیٰؑ کا عصا اور آپ کے کپڑے اور نعلین شریف اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور ان کا عصا اور تھوڑا سا منّ جو بنی اسرائیل پر نازل ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگ کے موقعوں پر اس صندوق کو آگے رکھتے تھے اس سے بنی اسرائیل کے دلوں کو تسکین رہتی تھی۔ آپ کے بعد یہ تابوت بنی اسرائیل میں متوارث ہوتا چلا گیا۔ جب انہیں کوئی مشکل درپیش ہوتی تو اس تابوت کو سامنے رکھ کر دُعائیں کرتے اور کامیاب ہوتے۔ دُشمنوں کے مقابلہ میں اس کی برکت سے فتح پاتے۔ جب بنی اسرائیل کی حالت خراب ہوئی اور ان کی بد عملی بہت بڑھ گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کیا تو وہ ان سے تابوت چھین کر لے گئے اور اس کو نجس اور گندے مقامات

میں رکھا اور اس کی بے حرمتی کی اور ان گستاخیوں کی وجہ سے وہ طرح طرح کے امراض و مصائب میں مُبتلا ہوئے! ان کی پانچ بستیاں ہلاک ہوئیں اور انہیں یقین ہوا کہ تابوت کی اہانت ان کی بربادی کا باعث ہے تو انہوں نے تابوت ایک بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو چھوڑ دیا اور فرشتے اس کو بنی اسرائیل کے سامنے طالوت کے پاس لائے اور اس تابوت کا آنا بنی اسرائیل کے لیے طالوت کی بادشاہی کی نشانی قرار دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل یہی دیکھ کر اس کی بادشاہی کے مقر ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے تبرکات کا اعزاز و احترام لازم ہے۔ انکی برکت سے دُعائیں قبول ہوتی اور حاجتیں روا ہوتی ہیں اور تبرکات کی بے حرمتی گمراہوں کا طریقہ اور بربادی کا سبب ہے اس تابوت میں انبیاء کی جو تصویریں تھیں وہ کسی آدمی کی بنائی ہوئی نہ تھیں اللہ کی طرف سے آئی تھیں۔

اب "تفسیر ماجدی" سے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اَلتَّابُوْتُ :۔ اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی اور قومی ورثہ تھا۔ اس کے اندر اصل نسخہ توریت مع تبرکاتِ انبیاء محفوظ تھا اسرائیلی اس کو انتہائی برکت و تقدیس کی چیز سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اُسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علماء یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسب ذیل تھی۔ طول ۲ ۱/۲ فٹ عرض ۱ ۱/۲ فٹ، بلندی ۱ ۱/۲ فٹ۔ بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اس سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بدطالعی سمجھ کر اس کی واپسی کے لیے نہایت درجہ بیتاب و مضطرب تھے۔ طالوت کے وقت میں یہ تابوت واپس آ جانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام (متوفی ۹۲۳ ق م) تک رہا اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکلِ سُلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اسے رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکلِ سُلیمانی کی بنیادوں میں دفن ہے۔

سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ :۔ یعنی توریت کا نسخہ شفاء اور حضرت مُوسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کی مقدس اولاد کے آثار و تبرکات، بعض اہل طریق نے کہا ہے کہ اولیاء اللہ کے احترام کا جو طریقہ چلا آرہا ہے اس کی اصل اور سند اس قصۂ تابوت سے مل جاتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں لکھتے ہیں۔

" اور جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کی من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جاوے۔ اس وقت اُن سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق بدون تمہارے لائے ہوئے آ جاوے گا۔

جس میں تسکین اور برکت کی چیز ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے یعنی تورات۔ اور تورات کا من جانب اللہ ہونا ظاہر ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں۔ یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ۔ غرض اس صندوق کو فرشتے لے آویں گے۔ اس طرح سے صندوق کے آجانے میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے۔ اگر تم یقین لانے والے ہو۔ اس صندوق میں تبرکات تھے۔ قولہ تعالیٰ۔

"یَاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَکِیْنَةٌ"، اس میں اصل ہے آثارِ صالحین سے برکت حاصل کرنے کی۔

اس تفصیل کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جب بنی اسرائیل کو اپنے انبیاء کے تبرکات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کے دُنیوی واُخروی اور ظاہری و باطنی فوائد عطا فرمائے تھے اور قرآن مجید خود اس امر پر سند ہے۔ یہ محض خوش عقیدگی ہے توہم پرستی نہیں۔ جیسا کہ بعض لوگ بلا جواز ہر جگہ ایسا خیال کرنے لگتے ہیں تو کیا اُمتِ محمدی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے قلبی نسبت و تعلق اور سچی محبت و ادب کے ذریعے ظاہری و باطنی برکات و فیوضات نصیب نہیں ہوں گے یقیناً پہلی اُمتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر۔ مگر ہم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فقط ذہنی اور فکری تعلق تو استوار کیا ہے مگر قلبی اور باطنی تعلق کمزور کر لیا ہے۔

جو لوگ آج بھی آپ سے ایسا قلبی و روحانی رشتہ قائم رکھتے ہیں وہ اپنی زندگی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے الطافِ کریمانہ کے نظارے کرتے ہیں۔

جیسا کہ بعض لوگوں کو قصیدۂ بُردہ کے قلمی اوراق (جو مؤلفِ قصیدۂ امام شرف الدین بوصیریؒ کے زمانے میں لکھے گئے تھے) کے آنکھوں پر لگانے سے آشوبِ چشم میں شفایابی ہوئی۔ اسی طرح بزرگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلینِ مُبارک کے نقشے کی بہت سی برکات بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے رسالے "نیل الشفاء" میں نقشہ نعلِ مُبارک کے برکات و خواص تفصیل سے درج کیے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"جب صرف ان الفاظ میں جو آپ کے معنیٰ و مدح کی صورت و مثال ہیں اور پھر ان نقوش میں جو ان الفاظ پر دال ہیں اور اس ملبوس میں جو آپ کی نعال ہیں اور پھر ان نقشوں میں جو ان نعال کی تمثال ہیں (یہ اس قدر برکت ہے) سو خود آپ کی ذات مجمع الکمالات و اسماء جامع البرکات سے توسل حاصل کرنا اور اس کے وسیلے سے دعا کرنے سے کیا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

نامِ احمدؐ چوں چنیں یاری کند | تا کہ نورش چوں مددگاری کند
نامِ احمدؐ چوں حصارے شُد حصین | تا چہ باشد ذاتِ آں روح الامینؑ

(نشر الطیب صفحہ ۳۸۴)

کُتبِ احادیث و سیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے دُعا کروانے

کے علاوہ بھی بہت سی صورتوں میں آپ سے حصولِ برکت کرتے تھے۔ مثلاً آپ کے دستِ مبارک کا اپنے اوپر مسح کرواتے، خود آپ کے جسم اطہر کو تبرکاً مس کرتے۔ آپ کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے تبرک حاصل کرتے۔ جس پانی سے آپ دستِ مبارک دھوتے اس سے تبرک حاصل کرتے۔ آپ کے بچے ہوئے کھانے سے تبرک حاصل کرتے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے پسینہ مبارک سے، لعابِ دہن مبارک سے، ناک مبارک سے، موئے مبارک سے (جو حجامت کے وقت اُترتے۔ نیچے نہ گرنے دیتے تھے) ناخن مبارک سے، لباس مبارک سے، عصاء مبارک سے، انگوٹھی مبارک سے، بستر مبارک سے، چارپائی مبارک سے، چٹائی مبارک سے۔

الغرض ہر اس چیز سے تبرک حاصل کرتے جس کی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس سے تھوڑی یا زیادہ نسبت ہوتی۔ حتیٰ کہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام نے آپ کی قبرِ انور سے اور آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر مبارک سے بھی تبرک حاصل کیا۔ بلکہ جن مکانوں اور رہائش گاہوں میں آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکونت اختیار فرمائی، جن جگہوں پر آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازیں ادا فرمائیں جن راستوں پر سے آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم گزرے۔ ان کی گرد و غبار تک سے بھی انہوں نے تبرک حاصل کیا۔ یہاں تک کہ صحابہ و تابعین کے ادوار کے بعد نسلاً بعد نسلٍ ہر زمانے میں اکابر آئمہ و مشائخ اور علماء و محدثین کے علاوہ خلفاء و سلاطین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات کو بڑے ادب و احترام سے محفوظ رکھتے تھے۔ خصوصی ایام میں بہت اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو ان کی زیارت کروائی جاتی تھی۔ ان سے تبرک حاصل کیا جاتا تھا اور ان کے توسل سے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

ادب و احترام کا یہی تقاضا آپ کی سننِ مقدسہ، احادیثِ مبارکہ حتیٰ کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے باب میں بھی ملحوظ رہنا چاہیئے۔ اسی طرح اہلِ بیت اطہار، صحابۂ کرام اور آلِ پاک سب کی محبت و ادب بھی اسی نسبت سے واجب ہے۔ ایسے اُمور کے ملحوظ رکھنے سے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو بہت سی ظاہری و باطنی برکات سے نوازتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی بے ادبی کرنے سے بہت سی آفات و بلیات نازل ہوتی ہیں۔ جن کا عام لوگوں کو ادراک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ (آمین)

آیت : ۲۵۳ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ

۴۶۔ جملہ انبیاء و رُسل پر حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کُلّی فضیلت کا بیان

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام انبیاء کرام اور رُسلِ عظام اصلاً نبی ہونے اور رسول ہونے میں برابر ہیں۔ گویا نفسِ نبوت اور نفسِ رسالت کے اعتبار سے کوئی فرق اور تفاوت نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے درجات و مراتب اور فضائل و کمالات میں ضرور فرق رکھا ہے۔ ہر ایک کو کسی نہ کسی لحاظ سے دوسرے پر امتیاز بخشا گیا ہے۔ کسی کو ایک معجزہ عطا ہوا ہے اور کسی کو دوسرا۔ کسی کو براہِ راست مخاطبۂ الٰہی کی شان سے نوازا گیا ہے، کسی کو کتاب کی فضیلت عطا کی گئی ہے کسی کو حوصلہ مندی اور مجاہدانہ زندگی میں یکتا کیا گیا ہے۔ کسی کو ہواؤں اور فضاؤں پر حکومت اور تصرّف سے بہرہ ور کیا گیا ہے، کہیں حُسنِ یُوسفؑ ہے اور کہیں یدِ بیضاء ہے اور کہیں دمِ عیسٰیؑ۔

الغرض اس امر پر تمام اُمّت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے کہ یہ ساری فضیلتیں، فوقیتیں اور امتیازات جُزوی ہیں۔ مگر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو جسے "وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ" کی اعلٰی شان سے نوازا گیا ہے کُلّی فضیلت عطا کی گئی ہے آپ کی تمام انبیاء اور رسولوں پر فضیلت کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ جو کمال اور فضیلت جس نبی اور رسول کو بھی اس کے زمانے میں عطا کی گئی اس سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کو بھی ضرور نوازا گیا ہے۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے جملہ کمالات و معجزات اور فضائل و شمائل تنہا حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں اور آپ جامع کمالاتِ انبیاء ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہر کمال اور فضیلت حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس میں اپنے درجۂ رتبہ کے اعتبار سے اس نبی اور رسول سے بھی بڑھ کر ہے جس میں وہ پہلے موجود تھی۔ بنابریں آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم درجاتِ نبوت اور مراتبِ رسالت میں بھی سب سے بلند و برتر ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی تمام انبیاء و رُسل کے جملہ فضائل و کمالات کا مبداء اور سرچشمہ ہے کیونکہ ان کی ارواح نے بھی رُوحِ محمّدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی فیض پایا ہے اور ان کی نبوتوں کے تمام فضائل و مراتب بھی نبوّتِ محمّدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیضان سے وجود میں آتے ہیں۔ اکتسابِ فیض کا یہ سلسلہ ان کے عالمِ آب و گِل میں ظہور سے بھی بہت پہلے عالمِ ارواح میں "میثاق النبیین" کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ کئی احادیث سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ امام قسطلانی نے "المواہب" میں۔ مُلّا علی قاری نے "شرح الشفاء" میں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے "التفہیمات" میں۔ امام نبہانی نے "جواہر البحار" میں۔ علامہ انور شاہ کاشمیری نے "العرف الشذی" میں اور اسی طرح بہت سے ائمہ و محدثین اور عرفاء و علماء نے اس امر کی تصریح کی ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے "الشفاء" میں آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام انبیاء کرام

پر مطلق اور کلی فضیلت کے حوالے سے بہت سی احادیث جمع کی ہیں۔ ہم ان میں سے صرف چند احادیث کو یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مقصود کی وضاحت ہو جائے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتظار کر رہی تھی کہ آپ باہر تشریف لائے جب آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے نزدیک ہوئے تو آپ نے سُنا کہ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا۔ دُوسرے نے کہا کہ یہ زیادہ عجیب بات نہیں؟ کہ مُوسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور اسی کی رُوح ہیں ایک نے کہا کہ آدمؑ اللہ تعالیٰ کے صفی اور برگزیدہ ہیں تب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے سامنے آئے اور سلام کیا اور فرمایا "میں نے تمہاری باتیں اور کلمات تعجب سُنے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو خلیل بنایا وہ اسی کے لائق تھے اور مُوسیٰؑ کو نجی اللہ کیا وہ اسی کے لائق تھے اور آدمؑ کو اپنا برگزیدہ بنایا وہ اسی کے لائق تھے اور عیسےٰؑ کو رُوح اللہ بنایا وہ اسی کے لائق تھے۔ مگر یہ بھی جان لو کہ مَیں اللہ کا حبیب ہوں یہ فخر سے نہیں کہتا اور بروزِ قیامت حمدِ الٰہی کا جھنڈا میرے ہی ہاتھ میں ہوگا یہ بھی فخر سے نہیں کہتا اور مَیں پہلا شفاعت کرنے والا اور پہلا مقبول الشفاعت ہوں اس پر بھی فخر نہیں اور میں پہلا شخص ہوں جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا اور اللہ تعالیٰ میرے لیے دروازۂ جنت کھولے گا پھر مجھے داخل کرے گا در انحالیکہ میرے ساتھ مُسلمان فقراء کی ایک جماعت ہوگی اس پر بھی فخر نہیں اور مَیں اکرم الاوّلین والآخرین ہوں مجھے اس پر بھی فخر نہیں"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بالاسناد مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جب لوگ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے تو مَیں سب سے پہلے باہر آؤں گا اور مَیں ان کا خطیب ہوں گا جب وہ جمع ہو کر آئیں گے اور میں انکو خوشخبری دینے والا ہوں گا جب وہ مایوس ہو جائیں گے اور میرے ہی ہاتھ میں حمدِ الٰہی کا جھنڈا ہوگا اور مَیں ہی اپنے ربّ کے حضور تمام اولادِ آدم میں سب سے زیادہ مکرّم اور بزرگ ہوں اور یہ باتیں فخر سے نہیں کہہ رہا ہوں" (بلکہ بیانِ واقعہ مقصود ہے)

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کے حضور مکرّم ہوں اور یہ فخر نہیں میرے گرد ایک ہزار خدّام طواف کر رہے ہوں گے اور وہ چمکتے ہُوئے موتی لگ رہے ہوں گے اور آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اس دن بزرگی اور رحمت کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی۔"

حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جنتی لباس میں سے مجھے ایک جوڑا پہنایا جائے گا پھر عرش کے داہنی جانب کھڑا ہوں گا میرے سوا کوئی اس جگہ کبھی کھڑا نہ ہوا ہوگا۔"

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَیں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔ میرے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا اور یہ فخر نہیں اور خود آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ تمام نبی میرے ہی جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔"

حضرت ابوذر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایتیں ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں مرحمت فرمائی گئی ہیں اور بعض روایتوں میں ہے کہ چھ چیزیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو مرحمت نہیں فرمائی گئیں یعنی ....

۱۔ ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر رعب طاری ہو جانے کے ساتھ میری مدد فرمائی گئی۔

۲۔ تمام زمین نماز پڑھنے کی خاطر میرے لیے پاک ٹھہرائی گئی تاکہ میرے اُمتی کو جہاں موقع میسر آئے وہیں نماز پڑھ لے۔

۳۔ میرے لیے مالِ غنیمت حلال فرما دیا گیا حالانکہ مجھ سے پہلے کسی نبی کیلئے غنائم حلال نہیں فرمائے گئے۔

۴۔ میں تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۵۔ مجھے شفاعت کا اِذن دے دیا گیا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی جگہ یہ ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔"

ایک روایت میں ہے کہ مجھ پر اُمت پیش کی گئی تو کوئی فرمانبردار اور نافرمان مجھ پر مخفی نہ رہا۔

ایک روایت میں ہے کہ مجھے ہر گورے اور کالے کی جانب مبعوث فرمایا گیا ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت کے آخر میں ہے کہ رعب کے ساتھ میری مدد فرمائی گئی ہے اور مجھے جوامع الکلم مرحمت فرمائے گئے اور میں بحالت خواب تھا جب زمین کے خزانوں کی کنجیاں میرے پاس لائی گئیں پھر میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے:

وَ خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ اور میرے ساتھ نبیوں کی آمد ختم کر دی گئی۔

ابن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

باری تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا۔ اے حبیب! جو چاہو مجھ سے مانگو۔ میں عرض گزار ہوا کہ اے رب! مانگوں تو کیا مانگوں جبکہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم بنایا، حضرت نوح علیہ السلام کو برگزیدہ کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی جو ان کے بعد کسی کو مرحمت نہیں فرمائی جائے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا۔ اے حبیب! میں نے جو تمہیں مرحمت فرمایا ہے وہ ان سب سے بہتر ہے میں نے تمہیں کوثر عطا کیا اور تمہارے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملایا۔ جس کی منادی فضاؤں میں سُنی جاتی ہے اور زمین کو تمہارے لیے اور تمہاری اُمت کے لیے پاک قرار دیا اور تمہاری خاطر تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف کر دیئے اور تمہیں بخشوانے والا بنایا اور قبل ازیں میں نے ایسا کسی کے ساتھ نہیں کیا اور تمہاری اُمت کے دلوں کو صحیفے بنایا اور حقِ شفاعت کو تمہارے لیے اُٹھا رکھا تھا جبکہ یہ حق کسی دوسرے نبی کے لیے نہیں رکھا گیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کون و مکاں صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کو اتنے ہی معجزے عطا ہوئے جنہیں دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ عطا ہوا ہے وہ وحی (قرآن کریم) ہے

پس مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے روز میرے پیروکار تمام انبیاءؑ سے زیادہ ہوں گے۔ محققین حضرات کے نزدیک اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک دنیا باقی ہے اس وقت تک آپ کا یہ معجزہ بھی رہے گا۔ دیگر انبیائے کرامؑ کے معجزے وقتی تھے بعد میں ان کی کوئی نشانی بھی نظر نہیں آئی۔ صرف اسی وقت کے لوگوں نے انہیں دیکھا لیکن قرآنِ کریم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک موجود رہیگا اور ہر کوئی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ یہ دیگر انبیائے کرام کے معجزات کی طرح محض ایک خبر ہو کر نہیں رہ جائے گا۔

آیت : ۲۵۵- مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

۴۷ - روزِ قیامت حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت کا بیان

(اس آیت مبارکہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے اذن واجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کا حق نہیں ہے) یہ امر ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی روزِ قیامت کے حوالے سے یہ ذکر آیا ہے کہ اس روز کسی کی سفارش (شفاعت) قبول نہیں کی جائے گی وہاں ہر جگہ صرف کفار ہی مراد ہوتے ہیں مسلمان ہرگز نہیں کیونکہ مسلمانوں کے لیے حضور نبیِ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت حق ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت پر کامل ایمان رکھنا اسلامی عقائد کا نہایت اہم باب ہے آج لوگ اس عقیدے میں بھی متزلزل ہوتے جا رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی کو اذنِ شفاعت حاصل ہے بلکہ آپ کی اُمت کے اولیاء، صلحاء اور متقین ومومنین بھی اہلِ ایمان کی شفاعت کریں گے۔ قرآنِ مجید، ماہِ رمضان، دیگر اعمالِ صالحہ حتیٰ کہ صغر سنی میں فوت ہو جانے والے معصوم بچے بھی اپنے والدین کے لیے سفارش کریں گے ان سب کی سفارش عنداللہ مقبول ہو گی کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاز اور ماذون ہوں گے انہیں بارگہِ الوہیت سے اِذن حاصل ہو گا۔ نفی ہر جگہ صرف بلا اذن شفاعت کی ہے اور یہ کفار و منکرینِ حق کے لیے تنذیر ہے۔ جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے انہیں تو شفاعت کی بشارت حاصل ہے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ماذونِ اعظم ہیں اور آپ کی شفاعت، شفاعتِ کبریٰ ہے (قرآن مجید میں ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے شفاعتِ کبریٰ کی خاطر آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے "مقامِ محمود" کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت نہ صرف اُمتِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ہو گی بلکہ تخلیقِ آدم سے انعقادِ قیامت تک تمام اُمتوں کے لیے ہو گی۔ یہ شفاعت عمومی ہو گی مگر اُمتِ محمدی کے لیے خصوصی شفاعت بھی ہو گی۔ اس ضمن میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض کو ایمان کی تازگی اور مسئلے کی وضاحت کے لیے یہاں درج کیا جائے گا۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابنِ ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث اور کتبِ عقائد میں باقاعدہ

شفاعت کے موضوع پر ابواب قائم کیے گئے ہیں مگر تفصیل کیلئے انہیں پڑھیں۔

واضح رہے کہ بلا اذن شفاعت کی نفی پر دلالت کرنے والی آیات کو پڑھ کر اسلام کے عقیدۂ شفاعت میں خلل واقع نہیں ہونا چاہیے۔ بعض لوگ ایسی آیات کے ذریعے مطلقاً انکارِ شفاعت کرنے لگتے ہیں اور انکارِ شفاعت کو کم علمی کے باعث تقاضائے توحید تصور کر بیٹھتے ہیں جبکہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ شفاعت میں کوئی تضاد ہے نہ اختلاف۔

(شفاعت ایک اذن اور اعزاز و اکرام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز اپنے مقبول بندوں کو عطا فرمایا جائے گا اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رُتبہ دیگر اوصاف و کمالات کی طرح اس میں بھی سب سے بلند و بالا ہوگا۔

قرآن مجید میں ہے۔

عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ یقیناً آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائیگا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ حبیب سرورِ کون و مکان صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت میں مذکور مقامِ محمود کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ مقامِ شفاعت ہے۔

اسی سلسلے میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو میں اپنی اُمت کے ساتھ ایک ٹیلے پر ہوں گا اور میرا رب مجھے سبز حُلہ پہنائے گا پھر مجھے شفاعت کی اجازت مل جائے گی تو اس وقت جن لفظوں میں اللہ تعالیٰ چاہے گا میں بارگاہِ خداوندی میں گذارش پیش کروں گا۔ بس یہی مقام، مقامِ محمود ہوگا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ فخرِ دوعالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے یہ اختیار دیا کہ چاہو تو اپنی آدھی اُمت کی بخشش کروالو اور چاہو ان کی شفاعت کا حق لے لو۔ میں نے شفاعت اختیار کرلی۔ کیونکہ یہ حق اوّل الذکر سے زیادہ عام اور فائدہ مند تھا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نیک لوگوں کی شفاعت کروں گا۔ نہیں میری شفاعت تو گنہگاروں اور عصیاں شعاروں کے لیے ہے۔)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ سُورج اتنا قریب ہوگا کہ لوگ اس کی تپش کو برداشت نہ کرسکیں گے اور شدید اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ کیا تمہیں کوئی ایسی ہستی نظر آتی ہے جو آج ہماری شفاعت کرے اسی غرض سے وہ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ اے ابوالبشر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنی جانب کی رُوح آپ میں پھونکی آپ کو جنت میں رکھا۔ فرشتوں سے آپ کو سجدہ کروایا اور آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ آپ ہماری شفاعت فرمائیں تاکہ جس مصیبت میں ہم مُبتلا ہیں اُس سے نجات ملے اور ہمیں آرام سے سانس لینا نصیب ہو۔

وہ فرمائیں گے کہ آج میرے رب نے غضب کا اظہار فرمایا ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے ایک حکم تعمیل میں مجھ سے لغزش صادر ہو گئی تھی لہٰذا مجھے خود اپنی جان کا خطرہ ہے میں تو خود خوف محسوس کر رہا ہوں۔ تم شفاعت کے لیے کسی اور کے پاس جاؤ۔ وہ پوچھیں گے کہ آپ ہمیں کن کے پاس بھیجتے ہیں؟ فرمائیں گے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ۔

لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر عرض کریں گے کہ حضور! آپ اہل زمین کی طرف سب سے پہلے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شکر گزار بندہ قرار دیا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کیسی آفت میں مبتلا ہیں آپ ہماری شفاعت کیوں نہیں فرماتے۔ وہ فرمائیں گے کہ آج میرے رب نے غضب کا ایسا اظہار فرمایا ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا۔ مجھے خود اپنی جان کی فکر ہے۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ اے نبی اللہ! آپ اہلِ زمین میں سے اللہ کے خلیل ہیں آپ ہماری شفاعت فرمائیں کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں آپ فرمائیں گے آج میرے رب نے غضب کا ایسا اظہار فرمایا ہے کہ پہلے کبھی نہ ایسا ہُوا اور نہ ایسا آئندہ ہوگا۔ پھر فرمائیں گے کہ مجھے اپنی جان کی فکر ہے تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں توریت مرحمت فرمائی کلام کیا اور سرگوشی کے لیے اپنا قرب بخشا ہے۔

لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مدعا عرض کریں گے تو وہ فرمائیں گے مجھے خود اپنی جان کی فکر ہے تم حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ کہ وہ اللہ کی رُوح اور اس کا کلمہ ہیں۔

لوگ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے وہ فرمائیں گے کہ تم نبی آخر الزمان سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر چکا ہے۔ تب وہ آپ کی بارگاہ میں آکر مدعا عرض کریں گے آپ فرمائیں گے ہاں اس کام کے لیے تو میں ہی ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ پھر میں شفاعت کرنے کے لیے چلنے لگوں گا اور اپنے رب سے اذن طلب کروں گا تو مجھے شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرما دی جائے گی۔ اس وقت میں اپنے رب کو دیکھ کر اس کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ

اے محمد! اپنا سر اٹھاؤ اور جو بھی عرض کرو۔ تمہاری عرض سُنی جائے گی اور جو بھی مانگو تمہیں عطا ہوگا اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول ہوگی۔

یہی مقام محمود ہوگا جہاں تمام اوّلین و آخرین میں حضور کی تعریف وحمد وثنا کا غُل پڑ جائے گا اور موافق و مخالف سب پر کُھل جائے گا کہ بارگاہِ الٰہی میں جو وجاہت ہمارے آقا کی ہے کسی کی نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے محمدؐ! اپنا سر اُٹھاؤ اور کہو تمہاری بات سُنی جائے گی شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت قبول فرمائی جائیگی مانگو تمہیں مرحمت فرمایا جائیگا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ میں عرض کروں گا۔ یَارَبِّ اُمَّتِیْ ۔ یَارَبِّ اُمَّتِیْ ۔ فرمایا جائیگا جس کے دل میں ایک گندم یا جَو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اسے دوزخ سے نکال لو۔ پس میں جاکر ایسے تمام لوگوں کو دوزخ سے نکال لوں گا۔ جن کے دل میں ایک گندم یا جَو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا۔ اس کے بعد دوبارہ میں بارگاہِ خداوندی کی جانب رجوع کر کے حسبِ سابق مدح وثنا بیان کرنی شروع کروں گا اور اُمّت کی بخشش کیلئے گزارش پیش کروں گا حکم ہوگا اب جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہے اسے بھی جاکر دوزخ سے نکال لو۔ پس میں ایسے تمام لوگوں کو نکال لوں گا اور تیسری بار حمد وثنا کے بعد اُمّت کی بخشش کا سوال پیش کروں گا حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایمان کا ذرہ بھی شائبہ ہو اُسے بھی دوزخ سے نکال لو۔ چنانچہ میں ایسا ہی کرونگا۔ چوتھی مرتبہ جب میں پھر سر بسجود ہو کر حمد وثنا بیان کروں گا تو فرمایا جائے گا کہ اے حبیب! اپنا سر اُٹھاؤ اور جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سُنی جائے گی۔ شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ مانگو تمہیں عطا فرمایا جائے میں عرض کروں گا اے پروردگار! مجھے اُن لوگوں کو جہنم سے نکال لینے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے ایک دفعہ بھی زبان سے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو حکم ہوگا، اے حبیب! اس بات کا تعلق تمہارے ساتھ نہیں ہے لیکن مجھے اپنی عزّت، کبریائی، عظمت اور جبروت کی قسم کہ ایسے ہر شخص کو آگ سے نکال لوں گا جس نے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہے۔ یہ اور اسی مضمون کی دیگر بہت سی احادیثِ شفاعت وضاحت کے لیے ملاحظہ کریں۔ صحیح البخاری، کتاب التوحید باب کلام الرب یوم القیامۃ مع الانبیاء وغیرہم اور صحیح مسلم، جامع ترمذی، سُنن نسائی، سنن ابن ماجہ وغیرھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رُسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے منبر رکھے جائیں گے اور وُہ اُن پر جلوہ افروز ہو جائیں گے جب کہ میرا منبر خالی رہ جائے گا۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا بلکہ سراپا سوال بن کر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑا ہوں گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوگا اے حبیب! اپنی اُمّت کے لیے کیا چاہتے ہو؟ میں اُمّت کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم کہو گے۔ میں عرض کروں گا کہ اے پروردگار! انہیں حساب سے جلد فارغ کردیا جائے پس وُہ بُلا لیے جائیں گے کہ اُن کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنہیں (بغیر حساب) محض اس کی رحمت سے جنّت میں بھیج دیا گیا ہوگا کچھ میری شفاعت سے جنّت میں جائیں گے اور میں برابر شفاعت کرتا ہی رہوں گا۔ یہاں تک کہ مجھے چند ایسے لوگ ملیں گے جن کو دوزخ میں ڈالنے کے پروانے جاری ہو چکے ہوں گے (میں ان کی شفاعت بھی کروں گا تو) جہنم کا داروغہ مجھ سے کہے گا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ نے تو عذابِ الٰہی کے لیے اپنی اُمّت میں سے کچھ بھی نہیں رہنے دیا۔

آیت ۲۸۲: فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ

۴۸ ـ دو عورتوں کی گواہی کا مسئلہ

اس مسئلہ میں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں جن کے نظر انداز ہونے کے باعث اس مسئلے پر کافی الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ ان کی نشاندہی کرتے ہیں' امید ہے ان امور کی وضاحت کے بعد اشکال کافی حد تک دور ہو جائیگا۔

(۱) واضح رہے کہ اصل حکم تو یہ ہے کہ لین دین کے معاملے میں مردوں میں سے دو کو گواہ بنایا جائے تاکہ بصورت اختلاف ان کی گواہی مغالطے کو دور کر سکے اور وہ فریقین کے درمیان الجھاؤ کی صورت میں تصفیہ بھی کر سکیں۔

اب عورتوں کو گواہ بنانے کی نوبت کیوں آئی؟ اس لئے کہ اتفاقاً دو مرد موقع پر موجود نہ تھے جو گواہ بن سکتے صرف ایک مرد میسر تھا۔ اس لئے حکم ہوا کہ اس کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنا لیا جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کاروبار' تجارت اور لین دین کے معاملات میں عام طور پر عورتوں کا دخل مردوں کی نسبت کم ہوتا ہے سو امکان ہے کہ کوئی عورت کسی ایسے مالیاتی اور تجارتی دستاویز پر گواہ ہو اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کی شرائط اور جزئیات سے کچھ اس کے ذہن سے محو ہو جائے۔ ایسی صورت کے پیش نظر حکم دیا گیا ہے کہ شروع سے ہی ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنا لیا جائے تاکہ حسب ضرورت ایک عورت دوسری کو یاد دلا سکے۔ یاد رہے کہ یہاں گواہی کی اصل ذمہ داری صرف مردوں پر تھی' عورتوں کو بامر مجبوری وضرورت اس ذمہ داری میں شامل کر لیا گیا۔ وہ اصلاً اس کام کی مکلف ہی نہ تھیں بنیادی طور پر مردوں کا کام عورتوں کو نبھانے کے لئے کہا جا رہا ہے اس لئے ایک کے بجائے دو عورتوں کو شریک کار بنایا گیا ہے تاکہ وہ تجارتی کام' اس کی گواہی اور عدالت کے ماحول کی اجنبیت کے باعث ذہنی بوجھ اور طبعی تامل محسوس نہ کریں بلکہ ایک کی جگہ دو کے ہونے کی صورت میں فطری اور نفسیاتی اپنائیت اور عملی سہولت کا ماحول محسوس کریں۔ یہ صنفِ نازک کے حق کی تخفیف نہیں بلکہ اس کے بوجھ کی تخفیف ہے۔

(۲) اس آیت کریمہ میں کہیں بھی یہ بات مذکور نہیں کہ ان دونوں عورتوں نے گواہی دینا ہو گی اور تب دونوں کی شہادت ملکر ایک مرد کے برابر بنے گی۔ بلکہ حکم فقط یہ ہے کہ دستاویز پر دو عورتوں کو گواہ بنا لیا جائے تاکہ کسی وقت اگر عدالت میں گواہوں کے پیش ہونے کا موقع آجائے تو ایک

عورت حسب ضرورت دوسری کی (جو گواہی دے رہی ہوگی) معاونت کر سکے۔ معلوم ہوا کہ دوسری کی حیثیت محض معاون کی ہے گواہی تو ان میں سے ایک ہی عورت دے رہی ہے دونوں نہیں اور دو کو گواہ محض اس لئے بنایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک گواہی دیتے وقت بھول جانے کی صورت میں مدد اور معاونت لے سکے اگر نہ بھولے تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دوسری عورت بھی موقع کی دستاویزی گواہ ہوگی تو تب ہی ضرورت پڑنے پر کوئی بات یاد دلا سکتی ہے۔

(۳) یہ ایسی سہولت اور اضافی رعایت ہے جو مرد کو میسر نہیں۔ اگر ایک مرد گواہی دیتے ہوئے بھول جائے تو دوسرے کی مدد نہیں لے سکتا اور نہ ہی دوسرا مرد اسے کچھ یاد دلا سکتا ہے کیونکہ دونوں کی گواہی ایک دوسرے سے بالکل علیحدگی میں ہوگی۔ حتی کہ ایک شخص دوسرے کی گواہی کو سن بھی نہ سکے گا۔ اس کے برعکس جب عورت گواہی کے لئے پیش ہوگی تو دونوں اکٹھی ہوں گی۔ تاکہ وہ اخلاقی اور قانونی طور پر ایک دوسرے کی معاون اور مددگار بن سکیں۔ مستزاد یہ کہ گواہی کے دوران مرد بھول جائے تو اس کی گواہی مشکوک یا مردود تصور ہوگی مگر عورت بھول جائے تو اس کی گواہی مشکوک ہوگی نہ مردود۔ بلکہ اسے دوسری عورت سے مدد اور رہنمائی لینے کا بھی قانونی حق حاصل ہوگا۔ یہ ترجیحی رعایت (Privilege) عورت کو دی گئی ہے، مرد کو نہیں۔ لہٰذا یہ عورت کے حق شہادت کی تنصیف نہیں بلکہ اس کی عزت افزائی ہے۔

(۴) یہ مسئلہ (Issue) حق تلفی یا حق میں تخفیف و تنصیف کے زمرے میں ہی نہیں آتا کیونکہ اسلامی نظام قانون میں شہادت (گواہی) حقوق (Rights) میں سے نہیں بلکہ فرائض و واجبات (Duties and Obligations) میں سے ہے۔ حق کی تعریف میں یہ شامل ہے کہ اگر کوئی صاحب حق رضامندی سے اپنا حق چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے قانون اس میں مداخلت نہیں کرتا۔ مگر اس کے برعکس وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے پیچھے ہٹنا چاہے تو قانون اسے نہیں ہٹنے دے گا کیونکہ وہ فرض کی ادائیگی کا پابند ہے۔ شہادت، شریعت کی رو سے ایسا فرض ہے کہ اگر عدالت کو کسی گواہ کی ضرورت ہے اور کوئی شخص موقع کا گواہ موجود ہے مگر وہ گواہی دینا نہیں چاہتا تو اسلامی نظام عدالت میں وہ گواہی سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے گواہی دینے کا پابند بنایا گیا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے۔ **"لا یاب الشھداء اذا ما دعوا"** (اور جب گواہوں کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار مت کریں) جبکہ مغربی نظام قانون میں یہ اس کا حق ہے خواہ گواہی کے لئے پیش ہو یا انکار کر دے،

لہٰذا اسلام میں کسی دستاویز یا واقعہ پر گواہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وقت آنے پر مرضی ہوئی تو گواہی دے دیں گے ورنہ نہیں' اسلام کے قانونی کلچر میں جو شخص کسی دستاویز پر گواہ بن گیا۔ اسے وقت آنے پر عدالت میں بھی بہر صورت پیش ہونا ہوگا۔ گویا گواہی اس کا حق نہیں جسے چاہے استعمال کرے یا نہ کرے بلکہ اس کا فرض ہے جس کا ادا کرنا اس پر لازم ہے۔ بصورت دیگر عدالت اس کے خلاف قانونی کارروائی کر سکتی ہے۔

(It is not aquestion of enjoying the right, it is a question of performing the duty)

اس لئے شریعت نے اصلاً گواہی کا بوجھ صرف مردوں پر ہی ڈالا ہے عورتوں پر نہیں۔ مجبوری کی صورت میں بھی عورتوں کی گواہی کے لئے دو کی شرط عائد کی ہے تاکہ عورتوں کے مختلف معاملات میں گواہ بننے اور عدالتوں میں بطور گواہ پیش ہونے کے رجحان کو ممکنہ حد تک کم کیا جائے' اور اگر کہیں انہیں گواہ بنانا ہی پڑ جائے تو انہیں باہمی معاونت (Mutual Assistance) کی رعایت فراہم کی جائے۔ یہ عورت کی تکریم اور اس کی عزت کی حفاظت ہے۔ اسے قانونی حق میں تخفیف سمجھنا غلط ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محکمہ اوقاف حکومت پنجاب لاہور

علماء اکیڈمی
مجلس اوقاف لاہور

رجسٹریشن سرٹیفکیٹ

رجسٹریشن نمبر 299

تاریخ اجراء 20-10-91 ترتیب نمبر ڈی او ایل-2(ک) اوقاف/88

تصدیق کی جاتی ہے کہ فرد/کمپنی/پریس ادارہ منہاج القرآن ماڈل ٹاؤن لاہور
کو اشاعت قرآن (طباعتی اغلاط سے مبرا) ایکٹ ایل آئی وی ۳ ، ۱۹۷۳ء کے تحت بطور
ناشر قرآن رجسٹرڈ کر لیا گیا ہے۔

ڈائریکٹر علماء اکیڈمی
برائے ناظم اعلیٰ اوقاف پنجاب لاہور
20/10/91